علی پور کا ایلی
PDFBOOKSFREE.PK
ممتاز مفتی

پہلی بات

میرا پہلا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ یہ کتاب نہ پڑھیں۔ برباد ہو جائیں گے‘ خوار ہو جائیں گے۔ آپ سوچیں گے کہ یہ بات تو بالکل ایسے ہے جیسے سگریٹ کا خوبصورت اشتہار دکھا کر کہا جاتا ہے۔ ”خبردار تمباکو نوشی صحت کے لئے مضر ہے“ مگر لوگ اس وارننگ کے باوجود سگریٹ نوشی سے باز نہیں آتے۔ بالکل اسی طرح لوگ ”علی پور کا ایلی“ پڑھنے سے بھی باز نہیں آتے۔

حال ہی میں مجھے ایک نوجوان کا خط ملا۔ لکھا تھا ”سر میں علی پور کا ایلی پڑھ کر خراب ہو گیا۔“

ایک دن دو نوجوان لڑکیاں میرے پاس آ گئیں کہنے لگیں ”ہم نے ممتاز مفتی کو پڑھا ہے۔ علی پور کا ایلی پڑھ کر زندگی کے متعلق ہماری سوچ تبدیل ہو گئی ہے‘ سر ہم سچ بولنا چاہتے ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے آئندہ سچ بولیں گے۔“ میں نے کہا بی بی ابھی آپ کی عمر ان گورکھ دھندوں میں پڑنے کی نہیں۔ اپنی تعلیم پر توجہ دو اور زندگی گزارنے کے لیے کسی بہتر راہ کا انتخاب کرو‘ بولیں ”نہیں سر‘ اب ہم نے سچ بولنا ہے۔“

عجیب بات ہے ممتاز مفتی کو ”علی پور کا ایلی“ لکھے ہوئے کم و بیش چالیس سال گزر چکے ہیں‘ ان کے انتقال کو بھی پانچ سال ہو گئے ہیں مگر مجھے اب تک ان کی ذات کے بارے میں‘ ان کی کتابوں کے بارے میں ایسے عجیب و غریب خطوط موصول ہوتے ہیں کہ میں حیران رہ جاتا ہوں کہ ممتاز مفتی کی شخصیت کے اس پہلو کو تو مجھے علم ہی نہیں۔ یہ لوگ کیوں ایک ایسے شخص کے لیے جذباتی ہو رہے ہیں جواب اس دنیا میں نہیں۔ یہ عقیدہ تو اب رفتہ رفتہ کھل رہا ہے کہ ایسا کیوں ہے۔

بانو قدسیہ نے ممتاز مفتی کے بارے میں لکھا تھا ”جب کوئی بزدل بہادر میدان جنگ ہار کر شام کے اندھیرے میں معدوم ہوتا چلا جاتا ہے تو فنا اس کی ناطاقتی کا

فائدہ اٹھا کر ایسا بھالا مار کر گراتی ہے کہ دیر تک فضا میں اس کے گرنے کی صدا کبھی آہستہ کبھی Echo بن کر آتی رہتی ہے۔ اسے زمانہ دیر تک بھول نہیں پاتا۔ بہادر انسان جو خوفزدہ بھی ہو اس کے ہار جانے کا منظر بھی عجیب ہے۔ شکستہ رو سپاہی کا رزار سے چلا تو جاتا ہے لیکن یہ منظر اس کے چاہنے والوں کو کبھی بھولتا نہیں۔ جانے والے نے اتنی جگہ آپ کے دل میں گھیری ہوتی ہے کہ مدتوں یہ خلا نہیں بھرتا۔ دیر تک اس کے گرنے کی آواز آتی رہتی ہے۔ کبھی سائیں سائیں بن کر، کبھی Echo کی طرح پھیلی ہوئی اس کے ذکر سے لوگ خالی نہیں ہوتے۔"

بہر حال "علی پور کا ایلی" ایک باغی شخص کی ایسی داستان حیات ہے جو اپنی ضخامت کے باوجود ختم کیے بغیر چھوڑی نہیں جاتی اور اس کا شمار اردو ادب کی سب سے ضخیم اور زیادہ پڑھی جانے والی کتابوں میں ہوتا ہے۔

عکسی مفتی

۲۶ جنوری ۲۰۰۱ء

دیباچہ برائے بار پنجم

۱۹۹۵ء

میں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ اس کتاب کی اتنی ایڈیشن شائع ہوں گی اور اس کی مانگ اس قدر بڑھ جائے گی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مشاہیر اردو ادب اس کتاب کو تسلیم کر لیں گے اور اردو ادب میں اسے ایک مقام بخش دیں گے۔ میں اردو ادب کے وسعت قلب کا مرہون منت ہوں۔ چونکہ یہ میری کوششوں یا جدوجہد کی وجہ سے نہیں ہوا۔

مجھ میں کبھی خواہش پیدا نہیں ہوئی تھی کہ ادیب بنوں۔ کس برتے پر ہوتی نہ تو میں اردو زبان سے واقف تھا نہ ہی میں نے کبھی اردو ادب کا مطالعہ کیا تھا۔

میں اس زمانے کی پیداوار ہوں جب اردو زبان پنجاب میں در نہیں آئی تھی۔ ہم لوگ گھروں میں محلوں مدرسوں میں کالجوں میں دفتروں میں ہر جگہ بے تکلف پنجابی بولتے تھے۔ مدرسوں میں صرف آٹھویں جماعت تک اردو پڑھائی جاتی تھی۔ کالجوں میں اردو کا وجود نہ تھا۔ اورینٹل لینگوایج کے لئے الگ کالج بنائے گئے تھے۔ ان کی حیثیت ایسی تھی جیسے براہمنوں کے آشرم کے قریب ہریجن کٹیا بنی ہو۔ اورینٹل کالج کے طلبا کو اجازت تھی کہ تحصیل علم کے بعد صرف انگریزی کا پرچہ دے کر وہ گریجویٹ ڈگری کے حقدار ہو سکتے تھے۔ ایسے گریجویٹ کو عرف عام میں تحقیر سے وایا بٹھنڈا کہا جاتا تھا۔

ان دنوں میں یکسر مغرب زدہ نوجوان تھا ان حالات میں میں اردو ادیب بننے کی خواہش کیسے کر سکتا تھا۔

اس زمانے میں میں کیوں اردو میں لکھتا رہا بظاہر اس کی صرف ایک وجہ تھی' ضد۔ میرا موقف یہ تھا کہ صرف ادیب ہی کو لکھنے کا حق نہیں ہے غیر ادیب بھی لکھ سکتا ہے آپ اسے ادیب نہ مانئے گا لیکن لکھنے کا حق تو دیجیے نا۔

دراصل یہ سارا گورکھ دھند تقدیر کا چلایا ہوا تھا۔اپنا راستہ ہموار کرنے کے لئے تقدیر کو کیا کیا گھمن گھیریاں چلانی پڑتی ہیں۔

علی پور کا ایلی میں نے اردو ادب کے خلاف احتجاج کے طور پر لکھی تھی۔اردو ادب کئی ایک پہلوؤں میں بڑا اجلا تھا بڑا مہذب تھا بڑا اخلاق زدہ تھا' اس حد تک کہ حقیقت پسندی سے بے گانہ ہو جاتا تھا۔اردو ادب کی خودنوشتیں بڑی دھلی دھلائی' کلف زدہ اور استری کی ہوئی تھیں۔میں نے سوچا ایک سچی خودنوشت پیش کروں۔ اخلاق اور تہذیب سے بے نیاز۔

دراصل یہ کتاب میں نے اردو ادب پر طنز کی حیثیت سے لکھی تھی اور میرا خیال تھا کہ یہ کتاب چھینٹے اڑائے گی شور اشوری پیدا کرے گی اور پھر ٹائیں ٹائیں فش ہو کر رہ جائے گی۔

لیکن یہ کتاب تو چل نکلی۔اپنی سچائی اور اردو ادب کی وسعت قلب کی وجہ سے۔ تقدیر کے بھید کس نے پائے ہیں۔

ممتاز مفتی

جون ۱۹۹۵ء

پیش لفظ

(تیسرا ایڈیشن)

یہ کتاب میری آپ بیتی کا پہلا حصہ ہے۔

پہلے مجھ میں اتنی جرات نہ تھی کہ اپنی خامیوں، کجیوں اور بے راہ رویوں کو اپناتا۔ اس لئے میں نے اسے روئیداد کا نام دے دیا۔

یہ آپ بیتی ۱۹۰۵ء سے ۱۹۴۷ء تک مشتمل ہے۔ اس آپ بیتی میں واقعہ، ہر کردار حقیقت پر مبنی ہے۔ افسانہ نگاری اسلوب میں ہو تو ہو واقعات میں حقیقت گوئی سے کام لیا گیا ہے۔ یہی اس کتاب کی امتیاز خصوصیت ہے۔

ارادہ تھا کہ سوانح کا دوسرا حصہ "الکھ نگری" کے عنوان سے پیش کروں گا، لیکن الکھ نگری والوں نے اس کی اجازت نہیں دی۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پردہ دری پسند نہیں۔ لہٰذا معذور ہوں۔

مورخہ ۲۶ نومبر ۱۹۸۴ء

ممتاز مفتی

(دوسرا ایڈیشن)

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۱ء میں چھپا تھا جو دو سو پچاس جلدوں پر مشتمل تھا۔ یہ ایڈیشن افراتفری میں چھپا۔ یہ افراتفری آدم جی انعام سے متعلق تھی۔ "اب یہ کتاب اس لئے مشہور رہے کہ اس پر آدمی جی انعام نہ ملا۔" (ابن انشا)

صرف دو سو پچاس جلدیں چھپنے کے باوجود اس کتاب کو اتنے افراد نے پڑھا ہے کہ جان کر حیرت ہوتی ہے۔ اب سعادت، فرزانہ اور چودھری بشیر احمد کی تحریک پر اس کا دوسرا ایڈیشن پیش کیا جا رہا ہے۔

بیشتر لوگ جنہوں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے اس بات پر مصر ہیں کہ یہ ناول

ہے۔ محمود ایاز کہتے ہیں کہ "یہ تلاش ذات کا ناول ہے۔" ابن انشا کا کہنا ہے کہ "یہ ناولوں کا گرنتھ صاحب ہے۔" سعادت اور فرزانہ کا خیال ہے کہ "اس ناول میں ایسے ٹکڑے بھی ہیں جنہیں پڑھ کر پھر سے جینے کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔" ایسے قاری بھی ہیں جو کہتے ہیں کاش یہ ناول ہوتا اور رومان کے نقطہ عروج کے بعد ختم ہو جاتا۔ ایسے قاری بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ اسے ایسا ہی ہونا چاہئے تھا جیسے کہ ہے۔

خوشی اور تعجب کی بات ہے کہ اس طویل کتاب کو کئی ایک اعلیٰ افسروں نے بھی پڑھا ہے جن کی عدیم الفرصتی کا یہ عالم ہے کہ بیگم کے پاس بیٹھ کر پڑوسیوں کی بدخویاں کرنے کی عشرت سے بھی محروم ہیں اور ان کی رائے اس کتاب کے متعلق خاصی شگفتہ ہے۔

اپنی دانست میں میں نے ناول نہیں بلکہ ایلی کی سرگزشت لکھی تھی۔ مقصد تھا کہ ایلی کی شخصیت کا ارتقاء پیش کروں۔ اسی لئے چند ایک بظاہر غلیظ تفصیلات پیش کرنے سے گریز نہیں کیا ــــــ یہ اور بات ہے کہ ایلی ایسا کردار ہے جو مشاہدات کے سمندر میں ڈبکیاں کھاتا ہے۔ لیکن جب کنارے لگتا ہے تو پنچھی کی طرح پر جھاڑ کر پھر سے جوں کا توں خشک ہو جاتا ہے ــــــ شاید ہم سب پنچھی ہوں اور کنارے لگنے کے بعد پر جھاڑ کر جوں کے توں خشک ہو جاتے ہوں۔

بہر حال اردو ادب میں کوئی کہانی ایسی نہ ملے گی، جس کی تفصیلات براہ راست زندگی سے اخذ کی گئی ہوں اور چناؤ کئے بغیر ایک جگہ ڈھیر کر دی گئی ہوں ــــــ اس لحاظ سے یہ کتاب آپ بیتی ہے۔

ایلی کا کہنا ہے کہ یہ کتاب ہی نہیں بلکہ ایک خط ہے جو اس نے سادی اور حالی کے نام لکھا ہے۔ بری الذمہ ہونے کے لئے نہیں بلکہ اعتراف جرم کے لئے۔

مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کے دوسرے حصے "ایلی اور الکھ نگری" کی تکمیل کے بعد یہ کتاب ارتقا کی ایک اہم کڑی کی حیثیت اختیار کر لے گی اور اس کے دھواں دار

اندھیرے' آنے والی کرن کو مزید چمک بخشیں گے۔ اور دونوں حصے مل کر تلاش ذات کا ناول بن جائے گا ____ لیکن بارہ سال الکھ نگری کی دہلیز پر بیٹھنے کے بعد مجھے شک پڑنے لگا ہے کہ شاید الکھ نگری ایک دہلیز کے سوا کچھ بھی نہ ہو جسے پار کر کے آپ مڑ کر اپنے ہی دل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جہاں ایک عظیم تر کائنات سر بسجود ہے۔

راولپنڈی۔ جنوری ۱۹۶۹ء

ممتاز مفتی

(پہلا ایڈیشن)

۱۹۳۶ء میں میں نے اپنا پہلا افسانہ "جھکی جھکی آنکھیں" پیش کیا تھا' آج میں اپنی پہلی مسلسل کتاب "علی پور کا ایلی" پیش کر رہا ہوں ____ یہ روئیداد ہے۔

ایک ایسے شخص کی جس کا تعلیم کچھ نہ بگاڑ سکی۔

جس نے تجربے سے کچھ نہ سیکھا۔

جس کا ذہن اور دل ایک دوسرے سے اجنبی رہے۔

جو پروان چڑھا اور باپ بننے کے باوجود بچہ ہی رہا۔

جس نے کئی ایک محبتیں کیں' لیکن محبت نہ کر سکا' جس نے محبت کی پھلجھڑیاں اپنی انا کی تسکین کے لئے چلائیں' لیکن سپردگی کے عظیم جذبے سے بیگانہ رہا اور شعلہ جوالہ پیدا نہ کر سکا۔

جو زندگی بھر اپنی انا کی دھندلی بھول بھلیوں میں کھویا رہا' حتیٰ کے بالآخر نہ جانے کہاں سے ایک کرن چمکی اور اسے نہ جانے کدھر کو لے جانے والا ایک راستہ مل گیا۔

اس داستان کے بیشتر واقعات اور مرکزی کردار حقیقت پر مبنی ہیں۔ باقی کردار حقیقت اور افسانہ کی آمیزش ہیں۔ حقیقت سے گریز کی وجہ میرا عجز ہے۔ ان

کرداروں کی عظمت کو اجاگر کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ لہٰذا افسانوی رنگ شامل کر کے میں نے اپنے عجز کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کا مقصد صرف ایلی کی داستان حیات پیش کرنا ہے۔ کسی متعلقہ یا ضمنی کردار کی دل آزاری، تضحیک یا تذلیل نہیں۔ اگر اس کتاب کے کسی حصے سے ایسا پہلو نکلتا ہے ____ تو وہ میری تحریر کے خام ہونے اور وسعت نگاہ کی کمی کی وجہ سے ہے۔

شاید آپ علی پور کے ایلی کی روئیداد پسند کریں ____ تو شاید میں بھی کبھی دوسری کتاب میں اس ''نہ جانے کہاں سے چمکنے والی کرن'' اور ''نہ جانے کدھر کو لے جانے والے راستے'' کا تذکرہ کروں، جس کے اشارے پر اس کتاب کا اختتام ہوتا ہے اور جس پر گامزن ہونے کے لئے ایلی پر تول رہا ہے۔

ممتاز مفتی

راولپنڈی ۲۵ جون ۱۹۶۱ء

بانو قدسیہ

اگر آپ کو غزل الغزلات پڑھنے کا شوق ہے اور آپ عورتوں سے باتیں کر کے مسرت حاصل کرتے ہیں تو ''علی پور کا ایلی'' ضرور پڑھئے۔

اگر آپ جانتے ہیں کہ مرد بطخ کی مانند ہے ہمیشہ اوپر سے پانیوں میں تیرتا ہے اور مچھلی کی طرح نچلے پانیوں میں نہیں جا سکتا تو بھی ''علی پور ایلی'' آپ کے لئے مسرت کا باعث ہوگی۔

اگر آپ میں تجسس کا مادہ ہے اور آپ بچپن میں بھول بھلیاں اور پہیلیاں بوجھتے رہے ہیں تو آپ کے لئے ''علی پور کا ایلی'' وہ سنہری پوستین ہے جو ہزار منزلوں کے بعد شہزادے کو ملی تھی۔

اگر آپ لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں اور مکمل طور پر مردم بیزار نہیں ہوئے تو ''علی پور

کا ایلی' ضرور پڑھئے اس میں اک جہان آباد ہے ___ لیکن ___ اگر آپ بچپن میں پوری کہانی کو چار سطروں میں بیان کرنے کا فن سیکھ چکے ہیں' جوانی میں آپ نے صرف وہ کتابیں پڑھی ہیں جن کے آخر میں سمری درج ہوتی ہے اور اگر طبعاً آپ کم گو' درست بات کرنے والے اور انگلیوں پر گن گن کر گفتگو کرنے کے عادی رہے ہیں تو یہ کتاب آپ کے لئے بے کار ہے۔ اس سے بہتر ہوگا کہ آپ اس کی سمری کسی ایسے دوست سے سن لیں جس نے اسے غور سے پڑھا ہو اور اس سے لطف اندوز نہ ہوسکا ہو۔

اشفاق احمد

جب ''علی پور کا ایلی'' شائع ہوا تو میں اسے اردو زبان کا ایک عظیم ناول تصور کیا کرتا تھا' انہی دنوں ناشر نے اسے آدم جی پرائز کے لئے گلڈ کے دفتر میں گزارا۔ ججوں نے اسے ''پڑھا'' اور اس پر ''غور'' کیا۔ پھر فیصلہ دیا کہ ''علی پور کا ایلی'' اس قابل نہیں کہ اسے آدم جی انعام سے نوازا جائے۔ چونکہ یہ ملک کے پانچ بڑوں کا فیصلہ تھا اس لئے مجھے بھی اپنی رائے میں تبدیل کرنا پڑی۔ اس وقت سے لے کر اب تک میری رائے ویسی ہی چلی آرہی ہے کہ پچھلے دنوں اس ناول کو پھر سے دیکھنے کا موقع ملا۔ چونکہ بزرگوں کی عزت کرنے کا حکم مجھے بچپن سے ملا ہے' اس لئے میں ان کے فیصلے پر قائم رہنے پر مجبور ہوں۔

ویسے میرا دل پکار پکار کر کہتا ہے کہ ''فسانہ آزاد'' اور ''علی پور کا ایلی'' اردو کے دو عظیم ناول ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے دل کی آواز مجھے ہی تک محدود ہے۔ ورنہ بڑا ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔

آپ اس ناول کو پڑھئے لیکن اپنی رائے قائم کرنے کے بجائے فاضل ججوں کے فیصلے کے پابند رہئے کیونکہ یہ اردو ادب کی تاریخ کا اہم فیصلہ ہے اور اس کو بنیاد بنا کر مستقبل کے ادب کے بارے مین اقوال فیصل دیئے جانے چاہئیں۔

ضمیر جعفری

ممتاز مفتی اردو ادب میں اسلوب دیگر کے الگ دبستان کے خالق ہیں۔ ان کے فن اور فکر کو میں ایک ایسے جوان رعنا سے تشبیہ دوں گا جو دیکھنے میں بہت الہڑ مگر سوچنے میں نہایت بالغ ہے۔ آپ اس سے پیار بھی کر سکتے ہیں اور بصیرت بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ مفتی کا ادب زندہ ہی نہیں ہمیشہ جوان بھی رہے گا۔ سوچتا ہوں اگر ممتاز مفتی پیدا نہ ہوتا تو زندگی کئی رعنائیوں اور دلچسپیوں سے محروم رہ جاتی۔

''علی پور کے ایلی'' کو میں اس دور کا ایک اہم ادبی کارنامہ سمجھتا ہوں اور زندگی کے اس قدر وسیع محاذ پر یہ کارنامہ شاید ممتاز مفتی ہی سر انجام دے سکتا تھا ______ کتاب کی ''فربہی ادھر ادھر کی 'چربی'' سے جمع نہیں کی گئی خود مصنف کے خون جگر سے صورت پذیر ہوئی ہے۔

کرنل محمد خان

جب ممتاز مفتی کی کتاب ______ ''علی پور کا ایلی'' ______ کو آدم جی انعام نہ مل سکا تو معاً ہمیں احساس ہوا کہ یہ ضرور کام کی کتاب ہو گی' اسے پڑھنا چاہیئے' اور پڑھی تو ہمارا وہی حال ہوا جو ''ان'' کی تقریر سن کر غالب کا ہوا تھا' یعنی:

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کسی ادب پارے کی عظمت پرکھنے کے لئے اس سے بہتر کوئی کسوٹی نہیں ______ ظاہر ہے کہ ممتاز مفتی کے منکروں کے بھی دل تو مومن ہوں گے' صرف دماغ کافر ہیں۔

قدرت اللہ شہاب

مفتی اگر ادیب نہ ہوتا تو جرام پیشہ ہوتا۔ چونکہ لاشعور اس کی تحریروں کا موضوع ہے اور انسانی لاشعور میں نہ جانے کتنے محمد خاں اور پھوپٹ ڈاکو چھپے بیٹھے ہیں۔

مفتی عقیدے کا روگ نہیں پالتا' ہاں عقیدت کا شکار ضرور ہوتا ہے جب وہ

عقیدت طاری کرے تو اس شخص کی زندگی حرام ہو جاتی ہے جس سے مفتی کو عقیدت ہو۔اس وجہ سے مفتی کی دوستی ایک ایسے پھوڑے کی طرح ہے جس کی ٹیسوں میں لذت ہے ____ "علی پور کا ایلی" میں مفتی بتدریج محبت سے عقیدت کی جانب بڑھ رہا ہے۔شہزاد مفتی کی محبت کے پھوڑے کی ٹیسوں اور لذت کی دو دھاری چھری تلے تڑپ رہی ہے۔

مفتی کی زندگی پر صوفی کی گہری چھاپ ہے۔اس کی تحریریں شعور اور لاشعور کے تصادم کو سلجھاتے ہوئے تصوف اور سلوک پر ختم ہوتی ہیں۔"علی پور کے ایلی" میں مفتی نے افسانوں میں لاشعور کے تجزیاتی نظام کو تصوف کی ابتدا کے پہلے موڑ پر پہنچا دیا ہے۔

اگر مفتی "علی پور کا ایلی" کا دوسرا حصہ لکھنے میں کامیاب ہو گیا تو اندازہ ہے کہ محبت اور عقیدت کا دو آتشہ ہو کر یہ کتاب ایک خصوصی اہمیت حاصل کر لے گی۔

جمیل الدین عالی

آدم جی ادبی انعام کی ایک مجلس منصفین ہوتی ہے۔میں پہلے سال سے اس کا معتمد اعزازی ہوں مرا کام انتظامی ہے اور ضابطے کی رو سے میں کتابوں کے بارے میں حق رائے وہی نہیں رکھتا۔

جب اس کتاب (علی پور کا ایلی) پر غور ہوا اس مجلس کے صدر تھے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور ارا کین تھے پروفیسر ممتاز حسن پروفیسر وقار عظیم اور دیگر مشاہیر جن کے نام شائع ہو چکے ہیں ____ انہوں نے اس کتاب علی پور کا ایلی) کو بہترین نہ سمجھا بلکہ جمیلہ ہاشمی کی "تلاش بہاراں" کو انعام کا مستحق قرار دیا ____ منصفین نے اپنی رائے دے دی جس کا احترام کیا گیا اور انتظامی پابندی بھی کی گئی۔مجلس منصفین کی کارروائی خفیہ رکھی جاتی ہے صرف متفقہ یا اکثریتی رائے کی تشہیر کی جاتی ہے۔اس لئے میں اس کارروائی کا حال نہیں بتا

سکتا ______ لیکن ایک قاری کی حیثیت سے مجھے ہمیشہ یہ کہنے کا حق ہے کہ یہ فیصلہ اردو ادب کے ساتھ کم از کم ایک ناانصافی کے مترادف تھا۔

ابن انشا

''علی پور کا ایلی'' ممتاز مفتی کا بڑا بھاری کارنامہ ہے۔ حجم اور وزن کے اعتبار سے ہی نہیں، مضمون، پلاٹ اور اسلوب کے لحاظ سے بھی، کچھ لوگ اسے اردو ناولوں کا گروگرنتھ صاحب بھی کہتے ہیں، کیونکہ یہ ہاتھ میں اٹھا کر مطالعہ کرنے کی چیز نہیں بلکہ اسے چوکی پر رکھ کر مورچھل ہلاتے ہوئے پڑھنا پڑتا ہے۔ اسے نئے ادب کی طلسم ہوشربا بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ قدم قدم پر ہفتخواں آتے ہیں جن سے گزرتے ہوئے ہیرو کے اور قاری کے ہوش گم ہوتے ہیں۔ کردار پر کردار چڑھا ہوا ہے، طلسم میں طلسم گرفتار ہے، اور افسانہ از افسانہ می خیزد۔ اس کا سٹائل بھی افسانے سے زیادہ داستان کا ہے۔ کڑی سے کڑی ملتی جاتی ہے۔ زمان و مکان کی زنجیریں نہیں ہیں، جن سے پائے نگاہ مین موچ آنے کا اندیشہ ہو، یہ ناول قلم سے کم کیمرے سے زیادہ لکھا گیا ہے اور اس کا فوکس ایلی پر رہتا ہے ______ اس ناول کے دو نمایاں پہلو ہیں، راست بازی اور کردار تراشی۔ راست بازی روسو کی سی نہیں کہ غلو کی وجہ سے ریا بن جائے، بلکہ سادہ غیر جذباتی اور سادہارن قسم کی۔ کردار بنانے میں مفتی جلدی نہیں کرتے، سہج پکے سو میٹھا ہو۔ ایک کردار کی تشکیل میں پچاسوں صفحے اور دسیوں برس صرف ہو جاتے ہیں لیکن پھر وہ ایسا ہوتا ہے کہ ٹن ٹن بجتا ہے۔ پتھر پر نقش ہو جاتا ہے۔ مجھے یہ ناول پڑھے بہت دن ہوئے، لیکن آج بھی علی احمد ہو یا شہزاد، سادی ہو یا انصار، منصر، تسلیم ہو کہ ارجمند، ذہن مین اپنی اپنی جگہ قطب نما بنے کھڑے ہیں۔ ہر ایک کی سج دھج الگ، خمیر جدا، دولہا اس بارات کا ایلی سہی، لیکن آگے چل کر شہزاد سے پچھاڑ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ وہ پاپن جو یوں جلی نہ کوئلہ بنی نہ راکھ، اردو ادب کے لازوال کردار کے طور پر زندہ رہے گی۔ پھر سادی ہے جس نے اس قصے میں شوخی

اور رومان کا رنگ بھرا ہے ایکتتلی جو ہاتھ نہیں آتی ' ایک غزال جو وحشت کرتا ہے۔
ایلی پر تو اس ناول میں ناحق کو خود مختاری کی تہمت ہے وہ تو ان تین
حبشیوں ______ علی احمد (باپ) شہزاد اور سادی کے درمیان کوڑے کھاتا پا
بجولاں چلا جا رہا ہے' چلا جا رہا ہے ______ بارہ سو صفحے کے اس ناول کو شروع
کرکے ختم کیے بغیر رکھنا مشکل ہے' جس نے پڑھا ایسے پڑھا کہ کام سے یا دفتر سے
چار دن کی چھٹی لی' اتنے دن کی رسد اور پانی کی ایک مٹکی پاس رکھ لی۔ بنیوں اور
تاجروں اور ان لوگوں کے پڑھنے کی یہ چیز نہیں جن کا لمحہ بڑا قیمتی ہوتا ہے اور جو
صرف منڈیوں کے بھاؤ اور سینما کے اشتہار پڑھنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں' غالباً
انہیں طبقوں کا مفاد مدنظر تھا کہ آدم جی انعام کے فاضل ججوں نے انعام نہ دے کر
قوم کو اس ناول سے بچانے کی کوشش کی لیکن تقدیر پر کس کا بس چلتا ہے۔
سنا ہے اب یہ دوبارہ شائع ہو رہا ہے۔

علی پور کا ایلی

ایلی

اس کا نام الیاس تھا۔ لیکن گھر میں سبھی اسے ایلی کہا کرتے تھے۔

''ایلی ــــــــ '' اس کے ابا آواز دیتے۔ ابا کی آواز سن کر اس کا دل دھک سے رہ جاتا۔ ''ایلی۔ حقہ بھر دو۔'' وہ چپ چاپ اٹھ بیٹھتا۔ ابا کے کمرے کا دروازہ بند دیکھ کر ایک ساعت کے لئے ہچکچاتا' محسوس کرتا کہ اس بند کمرے میں داخل ہونا ٹھیک نہیں۔ دبی آواز میں کھانسنے کی کوشش کرتا تاکہ کمرے کے لوگ اس کی آمد سے مطلع ہو جائیں۔ لیکن اس کی آواز حلق میں سوکھ جاتی۔ پھر وہ بڑی کوشش سے چلاتا۔ ''آیا جی'' اور جرات کرکے دروازہ کھولتا لیکن دروازہ کھولنے سے پہلے اپنی نگاہیں جھکا لیتا اور ایسا انداز اختیار کر لیتا۔ جس سے ظاہر ہو کہ حقہ کے علاوہ اسے کمرے کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں۔ کمرے میں ابا کو اکیلے دیکھ کر اس کے دل سے بوجھ اتر جاتا پھر وہ بے فکری سے حقہ کی طرف بڑھتا۔

اس کے ابا عام طور پر چٹائی پر بیٹھے ڈیسک پر رکھے ہوئے رجسٹر میں لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ وہ قمیض اتار کر بیٹھا کرتے تھے۔ ان کی دھوتی میلی ہونے کے علاوہ پھٹی ہوئی تھی اور اس کے پلوؤں کو ادھر ادھر سرکے رہنے کی بری عادت تھی جو ایلی پر بے حد گراں گزرتی۔ ''ہوں ــــ کیا ہے۔'' ابا گھور کر اس کی طرف یوں دیکھتے جیسے وہ خواہ مخواہ کمرے میں آگھسا ہو۔ ''جی۔ جی۔ چلم'' ایلی ان کی دھوتی کی طرف نہ دیکھنے کی شدید کوشش کرتے ہوئے جواب دیتا اور پھر چلم اٹھا کر دروازے کی طرف بھاگتا۔

''ایلی ــــــ '' اس کی سوتیلی ماں صفیہ اسے آواز دیتی۔ ''بازار سے سودا لا دے ایلی۔''

صفیہ کی آواز سن کر اس کے دل میں غصے کی ایک لہر اٹھتی لیکن اس کے باوجود وہ

چلاتا۔ ''آیا جی۔'' ابا کا ڈیسک خالی دیکھ کر اس کا انداز دفعتاً بدل جاتا۔ ''جی'' اس کی آواز میں لجاجت نہ رہتی لیکن اس کے باوجود اس کی نگاہ جھکی جھکی رہتی۔ ''یہ لو پیسے'' صفیہ کے دو حنا مالیدہ ہاتھ اس کی طرف بڑھتے جن میں زرد میلی انگوٹھیاں اس کا منہ چڑاتیں اور پھر انگلیوں سے نکل کر وہ گھومتے ہوئے میلے چکر ایلی کی طرف یورش کرتے وہ ڈر کر گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتا۔ اس کی طبیعت مالش کرنے لگتی۔ نہ جانے کیوں اسے مہندی لگے ہاتھوں اور انگوٹھی سے سخت نفرت تھی۔ کھولتی ہوئی نفرت وہ اپنی نگاہیں ان ہاتھوں سے ہٹانے کی کوشش کرتا۔ لیکن سارا کمرہ مہندی والے ہاتھوں سے بھر جاتا اور انگوٹھیاں تمام جگہ پر چھا جاتیں۔ مہندی کی بو چاروں طرف سے اسے گھیر لیتی۔ چاروں طرف غلاظت کے ڈھیر' ننگے پنڈے کے انبار ــــــــــ اور ان کے درمیان صفیہ کا سرخ و سپید باوقار چہرہ!

ایلی کو اس منظر سے بے حد نفرت تھی نہ جانے اس کے دل کی گہرائیوں میں طوفان سا کیوں آجاتا تھا۔ خوفناک طوفان۔ ڈر کر وہ صفیہ سے پرے ہٹتا۔ لیکن صفیہ اس کے قریب تر ہو جاتی۔ ''اب لو بھی'' صفیہ زبردستی چند پیسے اس کے ہاتھ میں تھما دیتی۔ مہندی کی بو سے رچے ہوئے پیسے کے ہاتھ کو کاٹتے......... ہتھیلی میں جلتی انگوٹھیوں سے بچنے کے لئے گھبرا کر وہ نگاہ اوپر اٹھاتا ــــــــــ صفیہ کا اتنا بڑا گورا چٹا چہرہ دیکھ کر وہ پھر نگاہیں جھکا لینے پر مجبور ہو جاتا۔ پھر اس کی نگاہیں صفیہ کی ململ کی قمیض پر پھسل آتیں ململ کی سفید قمیض دیکھ کر دفعتاً اسے خیال آتا کہیں قریب ہی سے وہ ابھری ہوئی ہے۔ شرم سے اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آتے۔ ''توبہ ہے۔ توبہ ہے۔'' اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ ''ایک سیر آلو اور دو پیسے کی پیاز۔'' وہ با آواز بلند دہراتا جیسے وہ مشکل کشائی کا اسم اعظم ہو جس کا ورد کرنے سے وہ اس طوفان سے مخلصی پا سکتا ہو۔ اس غلاظت سے خود کو محفوظ کر سکتا ہو۔ پھر وہ بھاگ لیتا ''ایک سیر آلو۔ دو پیسے کی پیاز۔ ایک سیر آلو۔ دو پیسے کی پیاز۔ آلو ابھرتے

۔پیاز چھلکے کھل جاتے اور ململ کی شکل اختیار کر لیتے۔

''ایلی'' اس کی اپنی ماں ہاجرہ اسے آواز دیتی ''ڈونگے میں پانی لا دے''۔وہ باورچی خانے میں داخل ہوتا۔ہاجرہ برتن مانجنے آٹا گوندھنے یا آلو چھیلنے میں مصروف ہوتی۔

''اماں۔''وہ ماں کے قریب تر ہو جاتا۔''تم ہر وقت ان کا کام کیوں کرتی ہو؟''

''گھر کا کام جو ہوا۔گھر کا کام کرنا ہی پڑتا ہے نا۔''

''گھر تو ان کا ہے اماں۔پھر تم کیوں کام کرتی ہو؟''

نہ بیٹا ایسی باتیں نہیں کرتے۔''

''اماں مجھے بھوک لگی ہے۔''

''کام ختم کر کے اپنا چولہا جلاؤں گی نا۔''

''اتنی رات تو ہو چکی۔''

''بس ابھی ختم ہو جائے گا کام۔''

''اماں۔ہمارا چولہا الگ کیوں ہے؟''

''اپنا چولہا الگ ہی ہونا چاہئے بیٹا۔''

''تو پھر تم دوسروں کا چولہا کیوں جلاتی ہو؟''

''فضول باتیں نہ کر''ماں چڑ جاتی۔''جا آرام سے بیٹھ فرحت کے پاس ابھی آتی ہوں میں۔''

ایلی کو فرحت سے چڑ تھی۔وہ مگن بیٹھ رہتی تھی۔جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔وہ اس گھر کے ماحول سے قطعی بے پروا معلوم ہوتی تھی۔اس کے لئے کوئی بات انوکھی نہ تھی۔وہ دو چولہے دو گھروں کا کام کرنے والی ماں۔وہ خونیں ہاتھوں والی صفیہ۔اس کی ابھری ہوئی قمیض۔سرکی ہوئی ابا کی دھوتی اور ان کا وہ بند کمرا فرحت اس گھر میں یوں گھومتی پھرتی تھی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو جیسے وہ گھر اور اس کے افراد اس کی اپنی

دنیا سے تعلق ہی نہ رکھتے ہوں۔ ابا کے بند کمرے سے عجیب و غریب آوازیں سنائی دیتیں تو وہ چپ چاپ یوں اپنے کام میں مصروف رہتی جیسے بہری ہو۔ گھر میں فرحت کی طرف کوئی متوجہ نہ ہوتا تھا۔ نہ ابا اسے کبھی بلاتے اور نہ صفیہ پوچھتی۔ البتہ اماں جب بھی فارغ ہوتی تو فرحت کے شانے سے شانہ جوڑ کر بیٹھ رہتی۔ دونوں باتیں بھی نہیں کیا کرتی تھیں۔ چپ چاپ بیٹھ رہتیں یوں جیسے بن بولے باتیں کر رہی ہوں۔ اس پر ایلی اور بھی غصہ آتا۔ اس قدر قریب کیوں بیٹھتی ہیں۔ بات کیے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ یوں چپکی رہتی ہیں۔ جیسے گوندے سے جوڑ رکھا ہو۔

اماں کے قرب کی وجہ سے وہ فرحت سے جلتا تھا اور اپنے آپ کو فرحت سے بہتر سمجھتا تھا۔ فرحت کی اس گھر میں حیثیت ہی کیا تھی نہ تو ابا نے اسے کبھی بلایا تھا۔ نہ اسے چلم بھرنے کے لئے کہا تھا اور ایلی کو تو وہ اکثر بلایا تھا۔ نہ اسے چلم بھرنے کے لئے کہا تھا اور ایلی کو تو وہ اکثر بلاتے تھے۔ وہ جب کھانا کھانے لگتے تو ''ایلی'' کو آواز دیتے ایلی اور جب ایلی جاتا تو دو انگلیوں سے بوٹی اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیتے ''ایلی بوٹی ______'' اور ایلی اسے ہاتھ میں اٹھائے یوں اپنے کمرے میں داخل ہوتا جیسے کوئی تمغہ ہو۔ وہ فخریہ انداز سے فرحت کی طرف دیکھتا۔ لیکن فرحت یوں ناک چڑھا کر منہ پھیر لیتی جیسے ایلی کے ہاتھ میں گوشت کی بوٹی نہیں بلکہ مرا ہوا چوہا ہو۔ ہونہہ ایلی غصے سے پھنکارتا ''بڑی آئی ہے۔ جیسے بوٹیاں کھا کھا کر اکتا چکی ہو۔''

پھر جب صفیہ پھلوں کی ٹوکری نکال کر انہیں چھانٹتی اور گلے سڑے پھل الگ کرتی تو ابا ایلی کو آوات دیتے اور جب وہ ان میں سے کم گلا سڑا کیلا یا سیب ایلی کی طرف بڑھاتے تو صفیہ بول اٹھتی۔

''لو یہ تو ابھی اچھا بھلا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ عجیب سی مسکراہٹ ہمسکراتی اس مسکراہٹ سے سارا کمرا ابھر جاتا اور ایلی خود محسوس کرتا جیسے واقعی وہ پھل ابھی اچھا بھلا ہو اور

اس قابل نہ ہو کہ کسی کو دیا جائے۔ علی احمد حیرت سے صفیہ کی طرف دیکھتے اور پھر کھسیانی ہنسی ہنس کر دوسرے گلے سڑے پھلوں سے چناؤ کرنے میں مصروف ہو جاتے۔

اگر کبھی ابا کوئی پھل فرحت کو دیتے تو وہ اسے یوں ایک طرف رکھ دیتی' جیسے وہ کھانے کی چیز ہی نہ ہو۔

بڑا بنتی تھی فرحت اور اماں اس کی ان حرکتوں پر خفا ہونے کی بجائے فخر اور مسرت سے اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی۔ اماں کی اس مسکراہٹ پر ایلی محسوس کرتا جیسے فرحت اور اماں نے چوری چوری آپس میں سمجھوتا کر رکھا ہو۔ اسے غصہ آتا کہ اماں اس سے سمجھوتہ کیوں نہ کرتی تھی۔ اول تو ایلی اپنے حصے کا پھل رکھ دینے کا قائل ہی نہ تھا اور کبھی رکھ دیتا تو اماں پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتی۔

"اے اب کھا بھی لے ایسے پڑا رہے گا خراب ہو جائے گا۔" اماں یہ بات فرحت سے کیوں نہیں کہتی وہ سوچتا۔ وہ ہم سے ایک سا برتاؤ کیوں نہیں کرتی۔

فرحت کی بات چھوڑیئے خود صفیہ سے اماں کا برتاؤ عجیب سا تھا۔ صفیہ گردن اٹھا 'چھاتی ابھار ہاجرہ کے سر پر آ کھڑی ہوتی۔ "ہاجرہ یہ کرو وہ کرو اور یہ تو تم نے ابھی تک کیا ہی نہیں اور وہ کام جو میں نے کل تمہیں دیا تھا وہ"۔ صفیہ کی باتیں سنتے ہوئے اماں کی عجیب حالت ہوتی۔ اس کی نگاہیں صفیہ کے چہرے پر لگی ہوتیں۔ جسم میں گویا جان نہ ہوتی۔ نس نس حاضر ہوتی۔ ایلی کو تو شک پڑتا تھا کہ اماں اس پر قربان ہوئی جا رہی ہے اور اس کے منہ سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو یوں اٹھاتی جیسے قرآن شریف کا ورق ہو۔

آصفی محلے والیاں سب یک زبان ہو کر کہا کرتی تھیں۔ ہے ہاجرہ بیچاری تو مظلوم ہے۔ جسے سوکن کی خدمت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن بہن سچ پوچھو تو ہمارے لئے تو گھر والی وہی ہے اور یہ کالے منہ والیاں جو گھر میں آ جاتی ہیں۔ ہمیں ان سے کیا۔

محلے والیاں بکتی تھیں صفیہ کا منہ کالا کہاں تھا۔ الٹا وہ تو سرخ اور سفید تھا نہ صفیہ سوکن تھی۔ نہ اماں مظلوم۔ پھر وہ کیا تھیں اس الجھن کو بھولنے کے لئے ایلی نیچے محلے کے احاطے میں اتر جاتا۔ اس کا اپنا گھر ایک معمہ تھا۔ وہ مہندی والے ہاتھوں ململ کے ابھاروں والی صفیہ۔ سوکن کو محبت بھری نظروں سے دیکھنے والی ہاجرہ۔ سنتی بہری بولتی گونگی فرحت اور بند کمرے میں بیٹھنے کے شوقین علی احمد۔

آصفی محلے کے چوگان میں پہنچ کر وہ اپنے گھر کو بھول جاتا حتیٰ کے چوگان میں کھیلتے ہوئے اسے ابا کی آواز سنائی دیتی ایلی ــــــ ایلی ــــــ ابا کا حقہ بھرنے کے بعد وہ ان کاموں سے بچنے کے لئے احاطہ چھوڑ کر علی پور کے بازاروں یا کھیتوں میں چلا جاتا اور کھیل کھیل کر تھک جاتا تو کسی درخت کے تلے بیٹھ کر سوچنے لگتا۔ ان کا گھر ایسا کیوں ہے۔ ابا ایسے کیوں ہیں۔ صفیہ کون ہے۔ کہاں سے آئی ہے۔

علی پور

علی پور چھوٹا اور بے حد پرانا قصبہ تھا۔ اس کی وضع قطع وہاں رہنے والوں کی نفسیات کی آئینہ دار تھی۔ قصبہ کے اردگرد چاروں طرف نانک چندی اینٹوں کی فصیل بنی ہوئی تھی۔ جو اب جگہ جگہ سے گری جا رہی تھی۔ جس میں جگہ جگہ بڑے بڑے شگاف پڑ چکے تھے۔ فیصل میں آٹھ دروازے اور دو موریاں تھیں۔ اس چار دیواری کے باہر گول سڑک بنی ہوئی تھی جو قصبہ کے گرد گھومتی تھی۔ جس کے پرے سر سبز کھیتوں میں یہاں وہاں قدیم باغات کے شکستہ مگر واضح آثار پھیلے ہوئے تھے۔ کچی پگڈنڈیاں قرب وجوار کے گاؤں کی طرف نکل گئی تھیں۔ جہاں سے علی پور کا شہر یوں دکھائی دیتا تھا' جیسے قدیم عمارتوں کا ایک ڈھیر ہو۔

شہر کے اندر نانک چند اینٹوں کی بنی ہوئی سڑکیں گلیاں اور عمارتیں تھیں۔ بازاروں میں تنگ سڑکوں کے اردگرد دکانوں میں تھیلیاں لٹکتی تھیں۔ مٹی کی ہنڈیاں نیچے اوپر رکھی تھیں۔ حکیم کی دوکان میں سیاہ رنگ کی بوتلوں پر زنگ آلود ٹین کے

ڈھکنے چڑھے تھے۔ جن پر مکھیاں بھنبھناتیں۔ بازاروں سے تنگ گلیاں گھومتی ہوئی نکل جاتیں۔ جن کے دونوں طرف چھوٹی اینٹوں کی دواریں ایستادہ تھیں۔ ان بوسیدہ رینگتی دیواروں میں کہیں کہیں اکا دکا کھڑکی کھلتی۔ تنگ و تاریک کھڑکی۔ ان اونچے ترچھے نانک چند مکانات کو دیکھ کر دل پر ایک بوجھ سا پڑ جاتا۔ دیواروں پر بدرنگ نانک چند اینٹوں کو دیکھ کر سر میں دو دھونے لگتا۔ طبیعت پر ان جانی اداسی چھا جاتی۔ یہاں وہاں اندھیری ڈیوڑھیوں سے ویرانی جھانکتی۔ منڈیروں اور چھتوں پر سائے سے حرکت کرتے۔ جیسے بھوت پریت چل پھر رہے ہوں۔ گلیاں گھومتے گھومتے دفعتاً آگے سے بند ہو جاتیں یا گلی کے اختتام پر محلے کا احاطہ شروع ہو جاتا۔ جہاں بچے فرش پر رینگتے۔ عورتیں چرخہ کاتنے یا ازار بند بننے میں مصروف نظر آتیں یا کھڑکیوں سے سر نکال کر ایک دوسری سے لڑتیں ہاتھ چلا کر کوسنے دیتیں۔

قدیم شہر کی طرح علی پور بھی ایک ٹیلے پر آباد تھا۔ جس کے عین وسط میں ٹیلے کی چوٹی تھی۔ جس پر ایک مسمار شدہ قلعے کے آثار تھے۔ جو شاید کسی زمانے میں شہر کی حفاظت کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس اونچے مقام کو ٹبہ کہتے تھے۔ ٹبے کے پاس ہی قصبے کی عالی شان جامع مسجد تھی، جس کے قریب بڑا بازار تھا۔ جس میں کپڑے اور منیاری کی دکانیں تھیں، بڑے بازار کے چاروں طرف گہری تاریک گلیوں کا جال بچھا تھا۔ اور ان سے پرے شہر کی فصیل اور دروازے، اور اس سے پرے گول اور سر سبز کھیت، اور پرانے باغات کے مسمارہ شدہ آثار۔

علی پور کے بازاروں میں لوگ دکانوں پر بیٹھ کر حقہ پیا کرتے، دنیاوی اور مذہبی مسائل پر تبادلہ خیالات کرتے، کوئی اس اہم بات پر روشنی ڈالتا کہ شیخ عظمت بیگ کے گھر اولادکیوں نہیں ہوتی، کوئی یہ نقطہ سمجھاتا کہ آصف علی کی بیگم دراصل کس خاندان سے ہے؟۔ ایک اس امر کی وضاحت کرتا کہ نورے حجام کے پاس وہ کون سا بے نظیر نسخہ ہے جسے وہ تنکوں کے حساب سے استعمال کرنے کو کہتا ہے۔ ایک یہ راز

فاش کرتا ہے کہ بابو سمیع کے لڑکے اعظم بیگ کی بیوی کی آنکھیں اتنی متکلم کیوں ہیں۔

نتھو تمباکو فروش کی دکان پر چوپٹ کا کھیل چلتا، بولے حکیم کی دکان پر شریعت سے متعلقہ مسائل پر گرما گرم بحث ہوتی، معراج لنگڑے کی دکان پر ترپ کی بازی کھیلی جاتی، اور چاند حلوائی کے تخت پوش پر آنے والے سیاسی دور کا تذکرہ رہتا۔

ہر دکان پر ایک نہ ایک قسم کا خصوصی مجمع لگا رہتا۔ یہ لوگ ہر آنے جانے والے کو غور سے دیکھتے۔ کہاں سے آیا ہے، کہاں جا رہا ہے؟۔ کیوں آیا ہے، کس لئے جا رہا ہے؟۔ اور اس کے گزر نے جانے کے بعد دیر تک ان تفاصیل پر اپنے رائے کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ اجنبی کی آمد پر پہلے تو اس کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو جاتیں ہیں، اور اس کا احاطہ کر لیتی ہیں۔ پھر اس کا تعاقب کرتی ہیں۔ ایک گروپ کی نگاہوں کی زد سے نکلنے کے بعد دوسرے گروہ کی نگاہوں پر چڑھ جاتا۔ اس کے خد وخال، لباس، انداز، چال، گفتگو اور سرسری حرکات کا مفصل جائزہ لیا جاتا، پھر ان جملہ تفصیلات پر اظہار خیال کیا جاتا اور پھر تنقید و تبصرہ کے بعد اس کی شخصیت اور طور اطوار پر آخری فیصلہ سنا دیا جاتا۔ جس کے خلاف اپیل کرنے کی گنجائش نہ ہوتی، اور جس کو بدلنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

آصفی محلّہ

علی پور کے جنوب مغرب میں ہاتھی دروازے کے قریب بڑی ڈیوڑھی کے عقب میں آصفی محلّہ تھا، جس میں ایلی کے عزیز و اقربا رہتے تھے، بڑی ڈیوڑھی کے پٹ زنگ آلود ہو چکے تھے۔ اور چولیں بے کار۔ ڈیوڑھی کی پیشانی پر دھندلے حروف میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ اندر ڈیوڑھی کے پہلو میں آصفیہ مسجد تھی جس کے قریب شاہ ولی کا مزار تھا۔ مزار سے آگے آصفی محلّہ تھا۔ چاروں طرف چہار منزلہ مکان ایستادہ تھے، جن کے درمیان ایک وسیع احاطہ تھا۔ جس میں کمیٹی کی ایک خمیدہ لال

ٹین لگی ہوئی تھی۔ احاطے کے ایک طرف رنگ محل تھا۔ جس کے چونے گچی دیواروں پر رنگ کے نقش ونگار کی بجائے میل جمع ہوا تھا، دوسری طرف شیش محل تھا۔ جس میں نہ تو کوئی شیشہ لگا ہوا تھا نہ بلور، دونوں کی وضع قطعی طور پر محل کی سی نہیں تھی۔ اس کے باوجود محلے والے انہیں رنگ محل اور شیش محل کہتے تھے۔ شیش محل کے نیچے ایک فراخ تہہ خانہ تھا، جس میں ایک مسجد اور ایک کنواں تھا۔

اس تہہ خانے کے متعلق مختلف قسم کی روایات مشہور تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ یہ تہہ خانہ بندے کے حملوں سے بچنے کے لئے تعمیر کیا گیا تھا، جب سکھ لٹیرے شہر پر ہلہ بولتے تو آصفی محلے کے مرد، عورتیں، بچے تہہ خانے میں پناہ لیتے۔ مسجد میں نماز پڑھتے اور اپنی سلامتی کی دعائیں مانگتے۔ اور کنوئیں کا ٹھنڈا پانی پی پی کر اللہ کا شکر بجا لاتے،

محلے میں کئی ایک ڈیوڑھیاں اور کمرے ایسے تھے، جن میں سورج کی روشنی کبھی داخل نہ ہوئی تھی۔ دوپہر کے وقت بھی محلے والے ہاتھوں سے ٹٹول کر یا دیا سلائی جلا کر ان ڈیوڑھیوں اور کمروں سے گزرا کرتے تھے۔ ان پرانے محلات میں چونے گچے کمرے تھے، جن کی کھڑکیاں ایک زمانے سے بند پڑیں تھیں چھجے خمیدہ ہو چکے تھے، کمروں میں جالے تنے ہوئے تھے۔ چھتوں میں چمگادڑیں رہتی تھیں۔ اور خمیدہ دیواروں پر شگاف پڑ چکے تھے، ان مکانات میں نت نئے انکشافات ہوتے رہتے تھے، کسی اندھیرے کمرے میں کسی بوسیدہ صندوق سے کوئی قلمی مسودہ برآمد ہو جاتا۔ کسی چونے گچی دیوار پر کسی پرانے کتبے کا از سر نو انکشاف ہوتا یا کسی طاق کے اندر ایک مزید چھپے ہوئے طاق کا پتہ چلتا۔ شاید اسی وجہ سے ہر آصفی کے دل میں ایک پرائیویٹ خیال جاں گزیں رہتا، کہ محلے کے کسی نہ کسی کونے میں کہیں نہ کہیں دبا ہوا خزانہ موجود ہے۔ لیکن ہر آصفی نے اس امید افزا خیال کو دل میں چھپا رکھا تھا، وہاں کسی دبے ہوئے خزانے کا ہونا بعید از قیاس نہ تھا، کیونکہ سب جانتے تھے کہ جب

آصفی برسر اقتدار تھے تو ان کی تنخواہ سرکاری خزانے سے گدھوں پر لد کر آتی تھی۔

پرانے زمانے میں آصفیوں کی عظمت مسلم تھی لیکن اب وہ باتیں محض قصے تھے، خوش کن تھے، اب آصفی اور ان کے رنگ محل اور شیش محل کے ارد گرد بسنے والے خدمتگار اور رکمین سب خلط ملط ہو چکے تھے۔ سارے محلے میں چند افراد ایسے تھے، جو مکتب سے تحصیل یافتہ تھے، اس لئے زیادہ تر آصفیوں کا شغل دوکانداری، مزدوری، اور بے کاری پر مشتمل تھا، یہ آصفیوں کے انحطاط کا زمانہ تھا، اس لئے وہ اپنی عظمت کا احساس پدرم سلطان بود سے کرتے تھے، گزشتہ جاہ و حشمت کی کہانیاں ان کے نزدیک حال کی فارغ البالی سے کہیں زیادہ وقعت رکھتی تھیں۔ جنہیں سنانے میں آصفی محلے کی بوڑھیاں بخل سے کام نہ لیتی تھیں۔

علی احمد

ایلی کے والد علی احمد کا گھر محلے بھر میں بڑے گھرانوں میں گنا جاتا تھا، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ محلے بھر میں علی احمد واحد شخص تھے، جنہوں نے چودہ جماعتوں تک تعلیم پائی تھی، اگرچہ وہ بی، اے کی ڈگری حاصل نہ کر سکے تھے، لیکن اس زمانے میں بی، اے، فیل ہونا بڑی بات تھی۔ بی۔ اے میں فیل ہونے کے بعد علی احمد کو ایک معقول اسامی مل گئی تھی، اور اس اسامی کی وجہ سے محلے بھر میں ان کی عزت تھی۔

اپنے والد کی طرح علی احمد کی طبیعت میں بھی عاشقانہ چمک کا عنصر تھا، لیکن ان کی طبعی رنگین مزاجی اور جرات رندانہ عاشقانہ عنصر پر حاوی رہتی، جو انہیں آئیں بھرنے اور فراق میں تڑپنے کی بجائے جینے کی طرف مائل رکھتی تھی، دراصل علی احمد کو افراد کی بجائے زندگی سے عشق تھا۔

علی احمد کا قد درمیانہ تھا، بدن چھریرا، رنگ سانولا ان کی پیشانی فراخ تھی۔ خد وخال میں کوئی خصوصی جاذبیت نہ تھی۔ مگر اس کے باوجود نہ جانے اس فراخ پیشانی

میں ان سادہ سیاہ آنکھوں میں یا جانے کہاں وہ بے نام اثر تھا، جسے محسوس کر کے راہ چلتی عورت اپنے راستے سے بھٹک جاتی۔ اس کے پاؤں آپ ہی آپ ٹھٹکنے لگتے، پلو سر سے سرک کر شانوں پر جا گرتا۔ پھر برقعے کے پٹ کھلتے اور ایک بڑی سی چمکیلی آنکھ طلوع ہو جاتی۔

علی احمد کی چال میں ایک خصوصی جاذبیت تھی۔ ان کے شانے کبھی خم سے آشنا نہ ہوئے تھے، ان کی چھاتی تنی رہتی، نگاہیں ہمیشہ اوپر کو اٹھی رہتیں، وہ دیکھ کر راہ چلنے کے عادی نہ تھے، بلکہ انہیں راہ چلتے ہوئے دیکھنے میں دل چسپی تھی۔ علی احمد کے انداز میں ایک وقار تھا، ان کی طبیعت میں ملن ساری کے علاوہ ایک رنگینی تھی، گفتار میں شوخی اور شرارت تھی، اور ان کی نگاہوں میں نصرت اور کام یابی کا پیغام جھلکتا تھا
۔

بیویوں کے متعلق علی احمد کے خیالات نہ تو محدود تھے اور نہ ہی رسمی، انہیں بیویوں سے یہ گلہ تھا، کہ انہیں جلد ہی عام ہو جانے کی عادت ہوتی ہے۔ چاہے کتنے ہی چاؤ چونچلوں سے بیاہ کر لاؤ۔ کتنے ہی رکھ رکھاؤ سے رکھو، لیکن جلد ہی وہ باورچی خانے میں بیٹھی آلو چھیل رہی ہو گی، یا راکھ بھرے چولہے میں پھونکیں مار رہی ہو گی۔ اس طرح چند ہی روز میں وہ بیوی سے باورچن ہو کر رہ جائے گی، بیوی کی اس بری عادت کے خلاف انہیں بہت شکایت تھی۔

والدین نے چھوٹی عمر میں ہی علی احمد کو حاجرہ سے بیاہ دیا تھا، ابھی وہ جوان ہی تھے کہ ان کے گھر میں دو بچے بھی ہو گئے۔ بڑی لڑکی فرحت اور چھوٹا ایلی، ایلی کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد علی احمد کے سر سے اس کے دادا اولاد علی کا سایہ اٹھ گیا، اس وقت علی احمد جوان تھے، برسر اقتدار تھے۔ اور اپنی پیشانی اور رنگین نگاہوں کے بے نام سحر سے بخوبی واقف تھے، ان کے گرد و پیش ایک حسین و دل کش دنیا پھیلی ہوئی تھی، اور دل میں تسخیر کا بے پناہ جذبہ موجیں مار رہا تھا۔

علی احمد کو ہاجرہ سے چنداں دل چسپی نہ تھی، اس کی کئی ایک وجوہات تھیں، اول تو حاجرہ کے نام میں اتنی تقدیس تھی، ایسی مقدس نام کی لڑکی سے کوئی شوخ یا رنگین قسم کی حرکت کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ دوسرے اعمال کے لحاظ سے بھی وہ حاجرہ ہی تھی، اس لئے حاجرہ کا نام ہی علی احمد کے رنگین مزاج پر بار تھا۔ جسمانی طور پر بھی وہ چنداں قابل قبول نہ تھی، قد چھوٹا بناوٹ میں نزاکت کا عنصر قطعی طور پر مفقود۔

ہاجرہ ان بیویوں میں سے تھی، جو خاوند کی آمد پر تسلیم و رضا کی شدت سے بے جان ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس کے برعکس علی احمد کو عمل تسخیر سے عشق تھا۔ اور تسخیر جب ہی ممکن ہے، جب سرکشی کا عنصر غالب دکھائی دے۔ چاہے وہ فریب نظر ہی کیوں نہ ہو؟۔ جو تسخیر کے جذبے کو ابھارے، تسخیر کرنے والے کو مائل بہ عمل کر دے، اور پھر مطمئن کرنے چل نکلے، وہ اپنی ایستادہ چال، ابھری ہوئی چھاتی، فراخ پیشانی، اور رنگین متبسم نگاہوں سے مردانہ وار تسخیر کرتے، پھر تخلیے میں ڈان کوہٹے کی سی پر جوش لڑائی لڑنے کے بعد اس میدان کارزار کی دہلیز پر بچے کی طرح اس امید پر گر پڑتے، کہ انھیں کوئی شفقت بھرا ہاتھ تھپک تھپک کر سلا دے۔ اس لحاظ سے ان کی شخصیت کے جملہ پہلوؤں پر حاوی تھا، اس لئے یہ آمیزش در حقیقت ان کی تمام تر زندگی کا تار و پود تھا، بچہ ٹین ک اسپاہی۔ جنگجو، سورما۔

جنسی پہلو کے علاوہ علی احمد میں مجلسی زندگی کی جملہ صلاحیتیں موجود تھیں، ان کی گفتگو میں مزاح کی شیرینی تھی۔ لطائف اور روایات کے علاوہ انہیں شجرہ نصب اور دیگر تاریخی واقعات کو بیان کرنے میں بے حد مہارت تھی۔ محفل میں وہ اپنے تاریخی علم کا اظہار کچھ اس انداز سے کرتے، کہ ذرا کوفت نہ ہوتی۔ اس کے علاوہ انہیں لکھنے سے عشق تھا عشق۔ اپنا بیشتر وقت وہ لکھنے میں صرف کرتے تھے، شاید یہ آصفیوں کی بدقسمتی تھی شاید یا خوش قسمتی ہو کہ ان کی توجہ تصنیف و تالیف کی طرف مائل نہ ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علی احمد یہ قابلیت گھر کا حساب اور پیدائش و موت کی تاریخوں کے نوٹ

کرنے پر محدود ہو کر رہ گئی۔ لیکن نظر انصاف سے دیکھا جائے تو یہ کام بھی ایک بہت بڑی مصروفیت تھا۔ علی احمد کے ڈیسک پر بڑے بڑے ضخیم رجسٹر پڑے رہتے، جن کے ساتھ المونیم کی تھالی میں ایک دوات اور دو موٹی نبوں کے قلم رکھے رہتے۔ اپنی مخصوص میلی اور پھٹی ہوئی دھوتی پہن کر قمیض اتار کر کمبل یا چٹائی پر اکڑوں بیٹھ کر وہ فرصت کے اوقات میں ان بھاری بھرکم رجسٹروں میں مختلف نوعیت کے اندراج کرنے میں شدت سے مصروف رہا کرتے تھے۔

علی احمد کے کردار میں روپے پیسے کی احتیاط کا پہلو بے حد اہم تھا۔ وہ پیسوں کو احتیاط سے رکھتے تھے، اور ہر قسم کے خرچ کو فضول خرچ کے مترادف سمجھتے تھے، حتیٰ کہ عورت پر بھی روپیہ خرچ کرنے کے قائل نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عورت کو تسخیر کرنے کے لئے سب سے ضروری چیز وعدے ہیں، روپے کا تصرف نہیں، ان کا ایمان تھا کہ عورت کی خوشی حقیقت سے تعلق نہیں رکھتی۔ بلکہ محض تخیل سے وابستہ ہے، اور اسے روپے پیسے جیسی مادی چیز سے کوئی تعلق نہیں۔

نوجوانی میں ہی علی احمد کو عظیم الشان کامیابیوں سے ہم کنار ہو چکے تھے، ابتدائی دور میں چاناں کے التفات نے ان میں خود اعتمادی کی بنا ڈالی تھی، پھر صفیہ کی ڈرامائی شکست نے تو انہیں ہیرو بنا دیا تھا۔

صفیہ

صفیہ شام کوٹ کی ایک مٹیار تھی، اس کے سرخ و سپید چہرے پر عجب وقار تھا۔ اس کا لانبا قد، کشادہ پیشانی، اور ایستادہ چال دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے قدرت نے شام کوٹ میں ایک قلوپطرہ پیدا کر دی ہو۔ صفیہ کو دیکھ کر علاقے کا پولیس انسپکٹر شہاب الدین اپنے اوسان کھو بیٹھا تھا، لیکن پولیس کا اعلیٰ آفیسر ہونے کے باوجود وہ شام کوٹ کی اس حسینہ کو اپنی جانب متوجہ نہ کر سکا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہاب الدین کے دل میں صفیہ کی آرزو نے عشق کا رنگ اختیار کر لیا۔ اور عالم مجبوری میں وہ صفیہ کو

اغواہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ چونکہ شہاب الدین کے ذرائع وسیع تھے۔ اس لئے وہ صفیہ کو لے کر امرتسر پہنچ گیا، اور اسے اپنے موروثی مکان کے دیوان خانے میں بٹھا کر خود والدین کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے اندر گیا، تاکہ صفیہ کے لئے اپنے مکان میں دائمی جگہ پیدا کر سکے۔

علی احمد اسی وقت اتفاق سے اپنے دوست شہاب الدین سے ملنے اس کے مکان پر جا پہنچے، صفیہ کو دیکھ کر وہ بھونچکے رہ گئے، صفیہ کی بے پرواہ اور بھرپور جوانی نے ان کی قوت تسخیر کو للکارا۔ نہ جانے اس مختصر سے وقفہ میں شہاب الدین کے دیوان خانے میں تین کے سپاہی نے اس سرخ و سفید مٹیار کو کیا جو ہر دکھائے کہ شہاب الدین کی آمد سے پہلے ہی صفیہ علی احمد کی ہو گئی، اور ایک بچے کی طرح علی احمد کی انگلی پکڑ کر دیوان خانے سے باہر نکل آئی۔

آصفی محلے میں صفیہ کو چھپائے رکھنا مشکل کام نہ تھا، اس لئے پولیس کی صفیہ کو ڈھونڈ نکالنے کی کوششیں اکارت گئیں، اور صفیہ چپکے سے علی احمد کی بیوی بن گئی۔

صفیہ کے آنے پر محلے میں کافی ہل چل پیدا ہوئی مگر بے چارے محلے والے معمولی احتجاج کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتے تھے، حاجرہ اس نئی آمد پر سٹ پٹائی، روئی پیٹی۔ لیکن ہاجرہ کی سنتا ہی کون تھا، اس کے علاوہ وہ خوب جانتی تھی کہ علی احمد کے گھر میں اس کی حیثیت ایک نوکرانی سے زیادہ کی نہ تھی، چاہے صفیہ آتی یا نہ آتی، اس لئے وہ جلد ہی خاموش ہو گئی۔ علی احمد کی والدہ جانتی تھی کہ بیٹا اپنے باپ کی طرح جذباتی واقع ہوا ہے۔ خاوند کے جذبہ محبت کی وجہ سے اس نے عمر بھر رنڈاپے میں بسر کی تھی، وہ ڈرتی تھی کہ کہیں بیٹا بھی اسی جذبہ کے تحت اسے داغ مفارقت نہ دے جائے۔ اس لئے وہ بھی چپ چپ ہو رہی کہ چلو بیٹے کے صدمے کی نسبت دوسری بہو کا گھر میں آنا برا نہیں، محلے والے بھی خاموش ہو رہے کیونکہ صدائے احتجاج بلند کرنا تو آسان تھا۔ لیکن اسے قائم رکھنا مشکل تھا۔ انہیں صرف یہ گلہ تھا کہ صفیہ شام

کوٹ کی ترکھائی تھی، ایک ترکھائی کا آصفیوں میں آشامل ہونا تکلیف دہ امر تھا، مگر اس کا کیا کیا جائے کہ شریعت اس عمل کی اجازت دیتی تھی، اور کھلے بندوں شریعت کے خلاف آواز اٹھانا مناسب نہ تھا۔

صفیہ کے آنے پر ہاجرہ کی حیثیت محض ایک نوکرانی کی سی رہ گئی، اس وقت ہاجرہ کی گود میں ایلی تھا وہ ایک نحیف و نزار بچہ تھا۔ اکثر بیمار رہتا۔ ہاجرہ کے لئے یہ بھی بہت تھا کہ اس کے پاس فرحت اور ایلی تھے جن کے سہارے وہ زندگی بسر کرسکتی۔ اس لئے اس کی تمام تر توجہ ایلی کے علاج معالجے کی طرف مبذول ہوگئی۔ ایلی زندہ رہے۔ ایلی صحت ہو جائے چاہے گھر میں بیسیوں صفیائیں آجائیں۔ پڑی ایں۔ اپنے نصیب میں، بہن مقدر کے خلاف کیا شکوہ۔ ہاجرہ کے آنسو خشک ہو گئے۔ اس کے بالوں اور دوپٹے سے عطر کی خوشبو آنے کی بجائے ہسپتال کی آیوڈین اور پنساری کے کسٹر آئل کے بو آنے لگی۔ اس کے خیالات میں اپنے گھر کی بجائے ایلی کی طرف دیکھا اور رفرط محبت سے اس کے قریب تر ہو گئی۔ ننھی فرحت حیران کھوئی کھوئی نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ ہاجرہ فرحت اور ایلی یہ ان کی دنیا تھی۔ ہاجرہ ایلی کی طرف دیکھتی رہی فرحت ہارجرہ کا سہارہ ڈھونڈتی رہی اور ایلی بس نگاہوں سے چھت کی طرف دیکھا کیا اور ساتھ والے کمرے میں روغنی گجری اور ٹین کا سپاہی محبت کا میدان جنگ گرمانے میں مصروف رہے اور علی احمد کی بوڑھی ماں جائے نماز پر یوں بیٹھی رہی جیسے کچھ نہ سن رہی ہو' کچھ نہ دیکھ رہی ہو۔

انوکھا انتقام

ایلی جئے گیا بچپن کی لمبی بیماری کے چنگل میں پڑا وہ آخری سانس لیتا رہا۔ مگر لیتا رہا' اس کی لاغری اور ناتوانی کی وجہ سے بیماری اسے ہلاک نہ کرسکی اور بالاخر چھوڑ گئی۔ وہ روبصحت ہونے لگا۔

ہاجرہ نے اسے روبہ صحت ہوتے دیکھا تو اس کے دل سے ایک بوجھ اتر گیا۔ ایلی زندہ رہے گا۔ ایلی کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ایک بار پھر ہاجرہ کی توجہ اپنے لٹے ہوئے سہاگ کی طرف مبذول ہو گئی۔ خاوند کے لئے جو دبی چھپی محبت اس کے دل میں تھی وہ پھر سے ابھر آئی لیکن اظہار کو کون روک سکتا ہے۔ اصلی روپ میں نہ سہی، کسی بہروپ میں سہی۔ ہاجرہ کے دل میں بھڑکتی ہوئی پیاری آگ نے نفرت کا روپ دھار لیا تاکہ اظہار تو ہو سکے۔ لیکن نفرت جتانے کا بھی کوئی ذریعہ نہ تھا وہ خود علی احمد کی محتاج تھی۔ اس کی نفرت یا محبت کو کون خطر میں لاتا تھا۔ وہ بیچاری کر ہی کیا سکتی تھی اور اظہار تو جبھی اظہار ہوتا ہے جب دوسرے اسے محسوس کریں۔ ہاجرہ نے اسی اظہار محبت یا نفرت کا ایک انوکھا طریقہ ایجاد کر لیا۔ ایسا انوکھا طریقہ جو صرف عورت ہی سوجھ سکتا ہے جسے عمل میں لانے کی جرات صرف عورت ہی کر سکتی ہے۔ اس نے اپنی سوکن صفیہ سے عشق لگا لیا۔ اس لئے کہ اس طرح وہ علی احمد کی حریف بن سکتی تھی اسے رقابت کی آگ میں جلا سکتی تھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ علی احمد کے گھر کی نوکرانی بھی نہ تھی۔ عشاق نوکر نہیں ہوتے۔ اگر صفیہ کے دل میں ہم جنسی کا ذرا سا بھی پہلو ہوتا تو ہاجرہ کی کامیابی یقینی ہو جاتی اور علی احمد ہاجرہ کے وجود کو ماننے پر مجبور ہو جاتے لیکن ایسا ہونا تھا نہ ہوا۔ صفیہ اپنے فطری مردانہ جاہ جلال کے باوجود اپنی سرشت میں ہم جنسی کا پہلو نہ رکھتی تھی۔ اس لئے ہاجرہ کے اس انوکھے تسلیم و رضا کے جذبے کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر طنز بھری مسکراہٹ جھلکنے لگی۔ اچھا تو میں آزما دیکھوں۔ اس نے سوچا اور وہ ہاجرہ کو آزمانے کے دلچسپ مشغلے میں کھو گئی۔

ہاجرہ قدم آگے اٹھا چکی تھی اب وہ پیچھے نہ ہٹ سکتی تھی۔ صفیہ کیا کہے گی کہ وہ اظہار محبت محض ایک دکھلاوا تھا۔ اس خیال سے ہاجرہ کے احساس خودداری پر ٹھیس لگتی تھی اس لئے وہ اندھا دھند اس راہ پر آگے بڑھنے لگی۔ ایک قدم اور شاید اب صفیہ کو

یقین آجائے ایک قدم اور شاید اب صفیہ قائل ہو جائے ۔ وہ آگے بڑھتی گئی۔ صفیہ کی جانب قدم اٹھاتی گئی اور فرحت اور ایلی پیچھے رہتے گئے۔ ''صفیہ صفیہ'' ہاجرہ کی آواز میں وہ للکار تھی جو صرف احساس شکست ہی پیدا کر سکتا ہے۔ ''صفیہ دیکھو۔ صفیہ۔'' دور ایلی پڑا چارپائی پر رو رہا تھا۔ فرحت گڑیا کھیلتے کھیلتے اکتا گئی تھی۔ گھر کے اس چھوٹے سے ویران کمرے میں جو ہاجرہ کے لئے مخصوص تھا۔ فرحت اور ایلی تنہا رہ گئے۔

نرالا امتحان

باورچی خانے میں ہاجرہ صبح و شام صفیہ کی خوشنودی کے لئے مصروف کار رہتی۔ صفیہ پھولدار پلنگ پوش پر بظاہر بے نیاز بیٹھی علی احمد کا انتظار کرتی اور علی احمد گھر سے باہر اپنی قوت تسخیر کے امتحان میں مصروف رہتے۔ ہاجرہ کے کمرے میں ایلی اور فرحت رو رو کر بھوکے سو جاتے۔ پھولدار پلنگ پر بیٹھے بیٹھے صفیہ انتظار اکتا کر چلا تی۔ ہاجرہ جب تک وہ نہ آئیں، تم باورچی خانے سے نہیں جانا سونا نہیں۔'' اور ہاجرہ چوکی پر بیٹھی انتظار کرتی کہ کب علی احمد آئیں اور انہیں کھانا کھلانے سے فارغ ہو کر اپنا چولہا جلائے۔ ایلی اور فرحت کے لئے چاول پکائے۔

علی احمد واپس آتے تو چپکے سے دبے پاؤں اپنے کمرے میں داخل ہو جاتے تا کہ صفیہ کو معلوم نہ ہو کہ وہ اتنی دیر سے لوٹے ہیں۔ لیکن ان کی آہٹ پا کر صفیہ جاگ اٹھتی۔ وہ علی احمد سے بگڑتی۔ علی احمد اسے مناتے لیکن وہ بگڑے چلی جاتی۔ پھر کمرے سے دھینگا مشتی کی آوازیں آنے لگتیں چونکہ معاملے کی نزاکت دیکھ کر ڈان کو بٹے میدان میں آنکلتا۔ ٹین کا سپاہی اپنے داؤ دکھاتا بالاخر شام کوٹ کا وہ مضبوط مگر حسین قلعہ سر ہو جاتا اور صفیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔ علی احمد خوب جانتے تھے کہ ٹین کا سپاہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لا سکتا ہے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ آجائے تو ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ہاجرہ کو آواز دی جاتی۔ ہاجرہ

کھانا کھلاؤ۔ کھانا کھانے کے بعد ٹین کا سپاہی تازہ دم ہو کر پھر سے میدان کارزار میں شام کوٹ کے قلعے کو للکارتا اور ہاجرہ چپکے سے اپنا چولہا جلا کر سوئے ہوئے بچوں کے لئے کھانے پینے کا سامان تیار کرنا شروع کر دیتی۔

پھر صفیہ کو ایک نئی بات سوجھی ایک نیا امتحان۔ ''ہاجرہ'' صفیہ بولی! ''دیکھو تو میری بانہوں میں سونے کے کڑے ہوں تو کیسا رہے۔'' وہ آنکھ بچا کر مسکرائی۔ اسی دن ہاجرہ کی زندگی میں ایک نئی بات پیدا ہو گئی روپیہ بچانا۔ صفیہ کے کڑوں کے لئے روپیہ بچانا۔ صفیہ کے لئے ریشمیں کپڑے مہیا کرنا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہاجرہ صفیہ کو اپنا نہ سکی۔ صفیہ فرحت اور ایلی کو دیکھ کر خوش نہ ہوتی تھی الٹا اس کی تیوری چڑھ جاتی۔ نگاہیں خشمگیں ہو جاتیں کیونکہ اس کے اپنے یہاں کوئی بچہ نہ تھا۔

علی احمد کبھی کبھار حیرانی سے ان دو بچوں کی طرف دیکھتے جیسے ان کے وجود سے پہلی مرتبہ واقف ہو رہے ہوں۔ انہیں یاد آتے کہ وہ ان کے اپنے بچے ہیں اور پھر وہ بچے خواہ مخواہ ان کو اچھے لگتے اور وہ کھانا کھاتے ہوئے آواز دیتے۔ ''ایلی۔ یہاں۔ یہاں آؤ ایلی۔ یہ لو بوٹی۔'' جسے ہاتھ میں پکڑ کر ایلی وہ بے حد مسرور ہوتا اور یوں فخر سے اٹھائے پھرتا جیسے وہ تمغہ ہو۔

ہاجرہ اس بات کا خاص خیال رکھتی تھی کہ بچے یہ محسوس نہ کریں کہ جو چیزیں علی احمد اور صفیہ کو میسر تھیں، وہ انہیں نصیب نہیں۔ اس لئے وہ انہیں ہر قسم کی تھوڑی چیز منگوا دیا کرتی تھی۔ اگر علی احمد کے لئے پلاؤ تیار ہوتا تو وہ انہیں نمکین چاول پکا دیا کرتی اور کہتی ''لو یہ بہترین قسم کا پلاؤ ہے اور ایلی اور فرحت خوشی خوشی وہ بہترین قسم کا پلاؤ کھاتے۔ لیکن اس کے باوجود جب وہ دیکھتے کہ ان کی ماں گھر میں برتن مانجھنے اور صفیہ کا کھانا پکانے میں صبح و شام مصروف رہتی ہے اور صفیہ کو پلنگ پر بیٹھ کر حکم چلانے کے سوا اور کوئی کام نہیں تو وہ محسوس کرتے کہ ان کی ماں محض نوکرانی ہے اور علی احمد ان کے آقا ہیں۔ ابا نہیں۔

صفیہ کے آنے پر علی احمد کو وہ آزادی نہ رہی تھی۔ تسخیر کا شوق تو ان کے دل میں جوں کا توں قائم تھا۔ لیکن اس کے مواقع کم ہو چکے تھے۔ دو ایک مرتبہ انہوں نے عورتوں کو گھر بلانے کی کوشش کی تھی لیکن صفیہ اس بات کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ علی احمد کو مجبوراً اپنی اس دلچسپی کو گھر سے باہر تک ہی محدود رکھنا پڑا۔ اب وہ راتیں باہر گزارنے لگے اور آدھی آدھی رات گئے گھر آنے لگے تھے۔ صفیہ نے اس پر صدائے احتجاج بلند کی۔ لیکن علی احمد صدائے احتجاج سے نہ ڈرتے تھے کیونکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ صفیہ کی بڑی سے بڑی صدائے احتجاج کو ٹین کا سپاہی مسکراہٹ میں بدل سکتا ہے۔

☆☆☆

بچپن

مہندی رنگے ہاتھ

ایلی بڑا ہوجاتا جارہا تھا۔ گردوپیش کے حالات کو سمجھے بغیر ان سے متاثر ہورہا تھا۔ پلنگ پر بیٹھی ہوئی صفیہ کی توجہ کا مرکز بنی جارہی تھی۔ وہ صفیہ۔ جس کے مہندی رچے ہاتھ ہر وقت حرکت میں رہتے تھے۔ جس کے ہاتھوں کی میلی زرد انگوٹھیاں گھومتی تھیں۔ جس کی مہین ململ کی قمیض ہر وقت ابھری رہتی تھی۔ وہ صفیہ...... جس کے حکم کو بجا لانے کے لئے اس کی ماں ہر وقت کمر بستہ رہتی تھی۔ جس نے ماں کو بچوں سے چھین لیا تھا جس نے اس کے باپ کو اپنے جادو کے زور سے ٹین کے سپاہی میں تبدیل کر رکھا تھا۔ وہ صفیہ۔ وہ اس صفیہ سے ڈرتا تھا اس کے خونیں ہاتھوں سے ڈرتا تھا۔ اس کے بالوں کے جوڑے سے ڈرتا تھا۔ اس کی مہین قمیض سے ڈرتا تھا۔ چوری چوری اس کی طرف دیکھتا اس کی بے نام طاقت کو محسوس کرتا۔ جسم کے بال کھڑے ہوجاتے۔ کانوں کی لویں گرم ہوجاتیں۔ تنفس تیز ہوجاتا پھر اس کی روح کی گہرائیوں سے ایک طوفان اٹھتا۔ صفیہ کے خون سے بھیگے ہوئے ہاتھ اس کی طرف لپکتے۔ زرد میلی انگوٹھیاں گھومتیں۔ اس کا سر چکرانے لگتا طبیعت مالش کرنے لگتی اور وہ دیوانہ وار بھاگتا۔ دور صفیہ کے کمرے سے دور۔ ان تمام چیزوں سے جنہیں صفیہ کے خون آلود ہاتھوں نے چھوا ہو۔

صفیہ کو معلوم تھا کہ ایلی مہندی والے ہاتھوں سے چڑتا ہے اور انگوٹھیوں سے گھن کھاتا ہے۔ اس لئے وہ جان بوجھ کر ہر کھانے کی چیز کو ہاتھ لگا دیتی تھی اور اسے آواز دیتی: "ایلی یہ لو مٹھائی ..." اور پھر مٹھائی کو اپنے ہاتھوں سے اچھی طرح مسل کر اسے دیتی۔ ایلی اسے یوں پکڑتا جیسے وہ مٹھائی نہیں بلکہ چوہا ہو اور پھر اپنے کمرے میں آکر غصہ سے کھولتا۔ "بڑا بد دماغ ہو گیا ہے تو" صفیہ اسے ڈانٹتی۔ کیا ہے۔ "مہندی رنگے ہاتھ کو۔ یہ دیکھ ایسے اچھے لگتے ہیں۔ مہندی لگے ہاتھ۔ دیکھ

تو'' وہ اس کے منہ پر ہاتھ مل دیتی اور ایلی آؤ آؤ کرتا بھاگتا اس کی ناک میں مہندی کی بو بس جاتی۔ میٹھی میٹھی ننگے پنڈے کو بو اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا گرد و پیش میں انجانی پچکاریاں چلتیں۔ برہنہ صورتیں چاروں طرف سے یورش کرتیں۔ آخ تھو۔ آخ تھو۔

صفیہ نے ایک دن ایلی کو ستانے کا فیصلہ کر لیا۔ جب وہ سو رہا تھا تو اس کے ہاتھ پر مہندی مل کر اسے باندھ دیا۔ ہاجرہ نے منتیں کیں۔ ''نہ صفیہ اسے کچھ نہ کہہ''۔ صفیہ بولی۔ ''مہندی ملنے سے کیا ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ کا پاکھنڈ مچا رکھا ہے اس لڑکے نے۔ دیکھو کیا کرے گا۔ اپنا ہاتھ کاٹ کر پھینک دے گا کیا۔'' یہ سن کر ہاجرہ خاموش ہو گئی۔ وہ بیچاری خود مجبور تھی۔ جب اگلے روز ایلی جاگا اپنا مہندی رنگا ہاتھ دیکھ کر اس نے سر پیٹ لیا۔ جسم کے بند بند سے میٹھی میٹھی بو آ رہی تھی۔ نگاہ میں ہر چیز سرخ دکھائی دے رہی تھی۔ اس روز اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ننگا ہو۔ جیسے اس کا جسم غلاظت سے لتھڑا ہوا۔ باہر صحن میں سفید ململ کی باریک کرتی پہنے صفیہ کھڑی بال بناتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ نہ جانے ایلی کو کیا ہوا۔ اس کی نظر میں وہ سفید کرتی سرخ دکھائی دینے لگی۔ سرخ، خونیں سرخ۔ جیسے وہ قمیض مہندی سے رنگی ہو۔ وہ بھاگا۔ لپکا اور آن کی آن میں صفیہ کی کرتی پر پل پڑا۔ اس کے ناخون سفید ململ میں دھنس گئے۔ قمیض کی دھجیاں صحن میں اڑانے لگیں۔ ''مجھے بڑا ہو لینے دے۔ مجھے دسویں پاس کر لینے دے پھر۔ پھر'' وہ دیوانہ وار چلا رہا تھا۔ نہ جانے بڑے ہو جانے کو اس ننگے پنڈے کو بو اور مہین قمیض سے کیا تعلق تھا نہ جانے دسویں پاس کر لینے کو اس سرخ رنگ سے کیا تعلق تھا۔ مگر وہ اپنی دھن میں سوچے سمجھے بغیر چیختا چلاتا رہا ململ کی دھجیوں کو بکھیرتا رہا۔ اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں گویا ابل کر باہر نکل آئی تھیں۔ جسم کانپ رہا تھا۔ ''ہاں'' وہ چلایا۔ ''بڑا ہو جاؤں پھر۔'' اس کے حلق میں آواز سوکھ گئی۔

صفیہ حیران کھڑی تھی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ پھر ایلی بھاگ گیا۔ گھر سے

باہر۔ دیوان خانے سے باہر۔ سکول میں جا کر چھپ گیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ جرم کا مرتکب ہو چکا ہو۔ جیسے وہ اپنے اس فعل کی وجہ سے ننگا ہو گیا ہو۔

"ہوں۔ تم یہاں ہو۔" سارے دن کی تلاش کے بعد علی احمد نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ "چلو گھر چلو۔ چلو" اور وہ گھر کی طرف چل پڑے۔ گھر پہنچ کر علی احمد نے اس کے کپڑے اتروا دیئے۔ قمیض پائجامہ جوتے اور اسے گھر سے باہر نکل کر اندر سے دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔

گلی ویران پڑی تھی لیکن ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے لوگ کھڑکیوں کے پیچھے سے چھپ کر اسے دیکھ رہے تھے۔ منڈیروں کے پیچھے کھڑے ہنس رہے تھے۔ منڈیر پر بیٹھا ہوا کوا شور مچا رہا تھا۔ قہقہے لگا رہا تھا۔ پھر دفعتاً گلی کے نانک چندی اینٹوں کے فرش پر پاؤں کی چاپ گونجی۔ کوئی آ رہا تھا اسے یوں لگا۔ جیسے کسی نے اس کے سر پر ہتھوڑا دے مارا ہو۔ ہتھوڑے کی ضربیں قریب تر ہوئی جا رہی تھیں۔ ایلی دیوار میں منہ دے کر کھڑا ہو گیا۔ چھپانے کے لئے اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ مہندی کی بو کا ریلا آیا۔ تڑپ کر وہ نالی میں گر پڑا' جیسے ناگ نے ڈس لیا ہو۔ بے بسی میں اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

نہ جانے کتنا عرصہ ایلی نے اپنا بایاں ہاتھ بغل میں چھپائے رکھا۔ وہ ایک ہاتھ سے روٹی کھاتا تھا۔ ایک ہاتھ سے منہ دھوتا اور سارے کام اسی ایک ہاتھ سے کرتا تھا۔ جب کبھی مجبوری کی وجہ سے مہندی رنگا ہاتھ بغل سے نکالتا تو اسے محسوس ہوتا جیسے ابا نے کپڑے اتروا کر اسے گلی میں نکال رکھا ہو۔ جہاں وہ نالی میں منہ دے کر رو رہا ہو۔

انوکھا باپ

اس زمانے میں وہ رہتک میں رہتے تھے جہاں اس کے ابا ملازم تھے۔ روہتک ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ گلیاں ویران تھیں۔ دکانوں میں سرخ گوشت کے بڑے بڑے

ٹکڑے لٹکے رہتے تھے اور مضبوط بانہوں والے پست قد قصائی کلہاڑیوں سے ان ٹکڑوں کو کاٹنے میں مصروف رہتے۔ موٹی موٹی عورتیں یوں کچر کچر باتیں کرتیں جیسے چارہ کاٹنے کی مشینیں چل رہی ہوں۔ پھر علی احمد سیر کیلئے دلی گئے تو ایلی کو بھی ساتھ لے گئے۔ دلی کو دیکھ کر ایلی دنگ رہ گیا۔ اتنا بڑا شہر دیکھنے کا اسے پہلے کبھی اتفاق نہ ہوا تھا بازاروں کی بھیڑ، دوکانوں کی قطاریں۔ خوانچے والوں کا شور اور تانگوں اور گاڑیوں کا تسلسل دیکھ کر اس کے دل میں نئی بیداریوں نے کروٹ لی۔ دلی میں ماموں حشمت علی کا گھر جہاں وہ ٹھہرے تھے بذات خود ایلی کے لئے اچنبھے کی چیز تھی۔ وہاں کی ہر بات نرالی تھی۔ ہر طریقہ انوکھا تھا۔ اس سے پہلے کسی کے گھر رہنے کا ایلی کو اتفاق نہ ہوا تھا۔ اس لئے اپنے گھر کے علاوہ وہ کسی گھریلو ماحول سے پورے طور پر واقف نہ تھا۔ حشمت علی ابا ہونے کے باوجود ہمیشہ سر جھکا کر چلتے تھے۔ دفتر سے واپسی پر علیحدہ کمرے میں ٹین کے سپاہی کا کھیل کی بجائے اپنے بچوں کے درمیان بیٹھ جاتے۔ ایلی کے لئے یہ ایک اچنبھے کی بات تھی۔ اچھا باپ تھا وہ باپ نہ ہوا ساتھی ہو گیا۔ ایلی سمجھتا تھا کہ باپ وہ ہوتا ہے جو بچوں کے لئے ہمیشہ دور رہے۔ جس کی تیوری چڑھی رہے۔ جس کے انداز میں ایک شان برتری ہو بے تیزی ہو۔ جو دو انگلیوں میں گوشت کا ٹکڑا اٹھا کر بیٹے کو آواز دے۔ ''ایلی''

حشمت علی کے چھوٹے بیٹے جمیل کو دیکھ کر ایلی کو اس کی جرأت پر حیرانی ہوتی تھی۔ باپ سے ذرا بھی نہ ڈرتا تھا۔ بات بات پر ماں سے لپٹ جاتا تھا۔ اس کے باوجود اس کے ابا اس کے کپڑے اتروا کر اسے گلی میں نہیں نکالتے تھے۔ جمیل کتنا نڈر اور آزاد تھا۔ وہ دلی کے بازاروں میں اکیلا گھومتا پھرتا تھا۔ ہجوم کو چیرتا ہوا نکل جاتا۔

''چلو ایلی''، جمیل نے اسے کہا ''چلو ہم تمہیں سوہن حلوا کھلائیں گے۔ یہ دیکھو۔'' اس نے مٹھی کھولی ''یہ دیکھو۔ اٹھنی ....'' ایلی حیران رہ گیا۔ اٹھنی کا حلوہ! اٹھنی ایلی کے نزدیک بہت بڑی رقم کا حلوہ؟ لیکن جمیل کو اٹھنی مل کیسے گئی۔ ''آؤ

""جمیل نے کہا" ہم تم کو دکھائیں۔ اٹھنی کا حلوہ لیں گے۔ پھر بھی یہ ہماری ہی رہے گی۔" "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اٹھنی کا حلوہ خریدو۔ اٹھنی پھر بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ ضرور جمیل مذاق کر رہا ہے۔ ایلی چپ چاپ جمیل کے ساتھ ہولیا "سنو اٹھنی بچانے کا طریقہ یہ ہے کہ ایسی دوکان پر چلو جہاں بھیڑ لگی ہو۔ ہاں بھیڑ میں سودا خوب رہتا ہے۔" جمیل اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا اور ایلی حیران ہو رہا تھا۔ ایسی باتیں اسے کبھی نہ سوجھی تھیں۔

جمیل سے مل کر اسے کئی ایک باتوں کا پتہ چلا۔ عجیب و غریب باتوں کا مثلاً یہ کہ اس کے بڑے بھائی صفدر کو تھیٹر کی ایک پارسی لڑکی سے عشق تھا۔ پارسی لڑکی۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ وہ تھیٹر میں جا کر دیکھے کہ پارسی لڑکی کیسی ہوتی ہے اور اس سے عشق کیسے لگتا ہے، لیکن جلد ہی وہ ہمایوں کے مقبرے اور قطب صاحب کی لاٹ پر جا پہنچے اور وہ ان عالیشان عمارتوں میں کھو گیا۔ پھر رہتک میں واپس آنے کے بعد اسے پارسی لڑکی کا خیال آیا اور وہ چوری چوری خواہش کرنے لگا کہ کبھی وہ بھی پارسی لڑکی کو دیکھے لیکن رہتک میں تو ہر طرف پوربی عورتیں تھیں جو پتھر کوٹنے میں لگی رہتی تھیں اور یا موٹی عورتیں جو کچر کچر باتیں کرتی رہتیں۔

اجمل کے بال

پھر رہتک میں اس کا پھوپھی زاد بھائی اجمل آ گیا۔ اجمل کا قد لمبا رنگ نکھرا اور جسم بھرا ہوا تھا۔ اس کے بال کس قدر ملائم اور لمبے تھے۔ کپڑے بھی تو بہت خوبصورت پہنتا تھا۔ ایلی اجمل کو غور سے دیکھتا رہتا حتیٰ کہ اسے پارسی لڑکی بھی بھول گئی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ بھی اجمل کی طرح اونچا لمبا ہو جائے۔ اس کا جسم بھی اسی طرح نکھر جائے اور بال اجمل کے بال تو ایلی کی نظر میں بے حد خوبصورت تھے۔ وہ اجمل کو چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے غور سے دیکھتا اور اجمل سا بننے کی کوشش کرتا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اجمل اسے دوست سمجھے جیسے دلی میں جمیل اسے دوست

سمجھتا تھا اور وہ دونوں رہتک کے بازار میں اکٹھے سوہن حلوہ خریدنے جائیں' لیکن اجمل نے کبھی ایلی کو اہمیت نہ دی تھی۔ سکول میں وہ بڑے لڑکوں کے ساتھ رہا کرتا تھا اور بیچارے ایلی کو اس کے پیچھے پیچھے دوڑنا پڑتا۔ نہ جانے وہ بڑے لڑکوں سے مل کر کیا کیا باتیں کیا کرتا تھا۔ جب ایلی ان کی باتیں سننے کے لئے قریب جاتا تو وہ باتیں کرنا بند کر دیتے یا سرگوشیاں کرنے لگتے۔ بڑی مشکل ہی بورڈنگ کے لڑکے اجمل کی دعوتیں کیا کرتے تھے۔ کھانے کے بعد وہ گھنٹوں بیٹھ کر گپیں ہانکا کرتے۔

گھر میں اجمل کا رویہ عجیب سا رہتا تھا۔ جیسے گھر والوں سے کوئی تعلق ہی نہ ہو اور صفیہ' صفیہ تو اس کے نزدیک اس مکان میں رہتی ہی نہ تھی۔ چاہے وہ مہندی رنگے ہاتھ چلاتی یا اپنی انگوٹھیاں گھماتی اجمل کو کچھ خبر ہی نہ ہوتی وہ بال بنا کر چپکے سے باہر نکل جاتا تا پھر صفیہ غصہ میں چلاتی: "ہاجرہ یہ کیا ہے۔ تمہیں برتن صاف کرنے بھی نہیں آتے اور یہ دیکھو شلغم تو تم نے بالکل ہی جلا دیئے ہیں۔" پھر وہ نیا جوڑا پہنتی' خوشبو لگاتی اور علی احمد کا انتظار میں بیٹھ جاتی۔ علی احمد کے آنے پر ٹین کا سپاہی میدان عمل میں نہ آتا بلکہ اس کی جگہ کٹ پتلیوں کا کھیل شروع ہو جاتا۔ ایک منتیں کرتی دوسری منہ چڑاتی یا ایک سیٹیاں بجا کر بر ماتی دوسری ناک چڑھاتی۔ ایک ہنسی ہنسے جاتی' دوسری گھورتی اور پھر جب دروازہ کھلتا تو شامکوٹ کا قلعہ یوں طمطراق سے قائم ہوتا۔ جیسے وہ ناقابل تسخیر ہو۔ پھر صبح اٹھتے ہی علی احمد چلاتے "اجمل ادھر آؤ یہ کیا واہیات عادت ہے تم سارا دن بنے سنورنے میں گزار دیتے ہو اور شام محفلوں میں بسر کرتے ہو اور تمہارے یہ بال کتنے واہیات بال ہیں جیسے عورتوں کے ہوتے ہیں۔ ہٹ جاؤ میری نظر سے دور ہو جاؤ۔"

پھر ایک رات کٹ پتلیوں کا تماشہ شدت اختیار کر گیا۔ شام کوٹ کے قلعے سے طبل جنگ بجنے لگا اور ٹین کے سپاہی نے گھبرا کر ہتھیار ڈال دیئے اور بند کمرے پر موت کی سی خاموشی طاری ہو گئی۔ اگلی صبح جونہی علی احمد بیدار ہوئے تو گھر پر ایک

مصیبت ٹوٹ پڑی۔ ''یہ چیز یہاں کیوں رکھی ہے؟ وہ وہاں کیوں ہے؟'' ایلی حیران تھا کہ اس بند کمرے کے سپاہی کو کیا ہوا کہ اپنی سرزمین چھوڑ کر گھر کے ویرانے میں گھومنا شروع کر دیا۔ لیکن جلد حیرت مصیبت میں بدل گئی۔ جب علی احمد نے للکار کر کہا ''تم پڑھتے کیوں نہیں ہر وقت کھیلتا ہے۔ لنڈور۔ ادھر آؤ۔'' اور آخر کار تان اجمل پر آ ٹوٹی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حجام بلوا کر اجمل اور ایلی دونوں کے بال کٹوا دیئے گئے اور علی احمد فاتحانہ قہقہہ لگا کر اپنے کمرے میں داخل ہو گئے۔ اس رات ایلی رضا میں منہ ڈھانپ کر روتا رہا کہ ابا ہائے اجمل بال ہائے اجمل کے بال۔

اس کے بعد علی احمد نے اجمل کے باہر جانے اور شام میں باہر بسر کرنے پر نکتہ چینی شروع کر دی۔ حتیٰ کہ ایک روز اجمل دیر سے گھر آیا تو انہوں نے اجمل کے منہ پر تھپڑ جما دیا ''بڑا بنتا ہے تو'' اور اجمل رونے لگا۔ اندر صفیہ مسکرا رہی تھی۔ مسکرائے جا رہی تھی۔ وہ ہاتھ کی انگوٹھیاں گھما رہی تھی اور رضائی میں منہ ڈال کر ایلی نہ جانے کیوں اپنے آپ سے کہہ رہا تھا ''میں بڑا ہو لوں۔ میں دسویں پاس کر لوں۔''

اگلے روز اجمل مدرسے سے واپس نہ آیا شام کے وقت ایک آدمی ایک رقعہ لایا۔ لکھا تھا ''میں گھر جا رہا ہوں۔ میرا انتظار نہ کریں۔ اجمل کے جانے کے بعد ایلی اکیلا رہ گیا۔ اگر انہی دنوں ابا کا تبادلہ دوراہے نہ ہو جاتا تو ایلی کے لئے وقت کاٹنا مشکل ہو جاتا۔ بہر حال وہ رہتک چھوڑ کر دوراہے چلے گئے۔

اس نئے شہر میں ان کے مکان کے سامنے ایک گندہ نالہ بہتا تھا جس کے ارد گرد بچے کھیلا کرتے تھے۔ ایلی کے لئے یہ نالہ بہت بڑی نعمت تھی جہاں کھیل کر وہ ابا کی بے حسی اور صفیہ کے غلیظ ہاتھوں کو بھول سکتا تھا۔

خانم

ایک روز جب وہ گندے نالے کے قریب کھیل رہا تھا تو اس کے ابا باہر نکلے۔ ایلی انہیں دیکھ کر سہم گیا۔.........علی احمد رک گئے چاروں طرف دیکھا اور پھر ایلی کو اشارہ

کر کے بلایا۔ وہ ڈر گیا نہ جانے ابا اسے کیوں بلا رہے تھے۔ اس سے پہلے تو انہوں نے اسے یوں کبھی بلایا نہ تھا یا تو وہ خاموشی سے پاس سے گزر جایا کرتے تھے اور یا اسے دیکھ رک کہتے "تو یہاں کھیل رہا ہے۔ دوڑ گھر جا نالائق سارا سارا دن کھیلتا رہتا ہے۔" اور ایلی چپکے سے دوڑ کر گھر میں جا چھپتا۔ اس روز ان کے بلانے پر ایلی ڈرتا ہوا پاس آیا۔ اس کا خیال تھا کہ پاس بلا کر ابا گھوریں گے اور اسے گھر جانے کو کہیں گے۔ لیکن ایلی قریب آیا تو وہ بولے "ادھر۔ ہمارے ساتھ"۔ اسے اپنی آنکھوں اور کانوں پر اعتبار نہ آتا تھا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ضرور کوئی غلطی ہو گئی ہے شاید اس نے ان کا اچارہ غلط سمجھا ہو لیکن پھر وہ چپ چاپ آگے آگے کیوں چل پڑے تھے۔ پھر اسے خیال آیا شاید وہ اسے گھر کے لئے کوئی چیز خرید کر دینے کے لئے ساتھ لے جا رہے تھے۔ بہر حال ساری بات عجیب سی تھی۔ ایلی ان کے پیچھے خاموشی سے چلنے لگا بازار آیا اور ختم بھی ہو گیا لیکن خاموش چلتے گئے۔

بازار کے اختتام پر علی احمد ایک گلی میں گھوم گئے اور دیر تک پر پیچ گلیوں میں چلتے رہے۔ حتیٰ کے گلیاں بھی ختم ہو گئیں اور وہ شہر کے باہر کالی سڑک پر جا پہنچے۔ سڑک کے دوسرے سرے پر وہ اس مختصر سی آبادی میں داخل ہوئے جو ریل کے پل کے پار تھی اور از سر نو گلیوں میں جا گھسے جہاں چھوٹ چھوٹے گھروندے بنے ہوئے تھے۔ بالآخر وہ ایک دروازے پر رکے جہاں علی احمد نے دروازے پر دستک دی کچھ دیر کے بعد دروازے کی درز میں ایک موٹی سی اتنی بڑی کالی آنکھ دکھائی دی "خانم" علی احمد نے آہستہ سے کہا۔ اندر سے گویا چاندی کی گھنٹیاں بجنے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھلا اور ایک سرخ و سفید شہر طلوع ہو کر چاروں طرف چھا گیا۔

خانم کو دیکھ کر ایلی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ چوڑے گورے چٹے چہرے پر دو موٹی موٹی کالی آنکھیں مسکرا رہی تھیں "آؤ بیٹھو" اس نے چارپائی کھینچ کر کہا "بیٹھ جاؤ" علی احمد نے ایلی کو حکم دیا اور وہ خود بے تکلف چارپائی پر لیٹ گئے "حقہ بھر

نا ذار خانم'' علی احمد نے یوں کہا جیسے وہ ان کا اپنا گھر ہو۔ خانم نے جلدی سے چلم میں دو کوئلے ڈالے اور پھر علی احمد کے پاس بیٹھ کر اس سے بے تکلف باتیں کرنے لگی۔ جلد ہی وہ دونوں ایلی کے وجود سے بے خبر ہو کر ایک دوسرے میں کھو گئے۔

ایلی حیران تھا کہ خانم کون ہے اور اس کا منہ اتنا چوڑا اور سرخ و سفید کیوں ہے اور اس کی آنکھیں اتنی شوخ کیوں ہیں اور رعب بھرے چہرے کے باوجود اس قدر مسکراتی کیو ہے اور اس کی طرف دیکھنے کو جی کیوں چاہتا ہے۔ وہ اس بات پر بھی حیران تھا کہ ابا وہاں یوں لیٹ کر حقہ پی رہے ہیں۔ جیسے وہ ان کا اپنا گھر ہو اور خانم یوں ان کے پاس بیٹھی تھی جیسے صفیہ گھر میں ان کے پاس بیٹھا کرتی تھی۔ صفیہ اور خانم کا کوئی مقابلہ بھی تو نہ تھا اگرچہ صفیہ کا رنگ بھی کافی سفید تھا۔ اس کے چہرے سے بھی رعب برستا تھا۔ لیکن صفیہ کے ماتھے پر تو ہر وقت شکن پڑی رہتی تھی۔ اس کے برعکس خانم مسکرائے جا رہی تھی۔ وہ ایلی کو دیکھ کر ویسے ہی مسکراتی تھی۔ جیسے علی احمد کو دیکھ کر جیسے ان دونوں میں کوئی فرق ہی نہ ہو۔ صفیہ تو صرف علی احمد کی طرف دیکھ کر مسکرایا کرتی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ خانم کے ہاتھ مہندی رنگے نہ تھے۔ کتنے صاف ستھرے ہاتھ تھے اور انگلیوں میں انگوٹھیاں بھی تو نہ تھیں۔

وہ باتیں کرنے میں مشغول تھے کہ اندر کوئی بچہ رونے لگا۔ بچے کے رونے کی آواز سن کر ایلی گھبرا گیا نہ جانے کہاں سے ایک شخص میلی سی چادر میں لپٹا ہوا آموجود ہوا ''دیکھ تو سر اب رو رہا ہے۔'' خانم بولی اور پھر علی احمد سے باتوں میں مشغول ہو گئی اور وہ چادر میں لپٹا ہوا عورت نما شخص اندر جا کر بچے کو تھپکنے لگا۔ نہ جانے وہ شخص کون تھا۔ نوکر تو نہیں معلوم ہوتا تھا وہ......... خانم کا خاوند بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر کون تھا۔ ایلی کے لئے وہ مکان ایک رز محسوس ہونے لگا وہ بے تکلف مسکرانے والی عورت۔ وہ عورت نما مرد اور وہ توتا بچہ۔

''اچھا تو یہ لڑکا ہے۔'' خانم نے اپنے ہاتھ سے ایلی کے منہ کو تھپکتے ہوئے کہا۔ اس

کی اس تھپک میں کتنا پیار تھا۔ ایلی کے جسم میں ایک جھرجھری سی ناچنے لگی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ خانم کا ہاتھ اس تھپکتا رہے اور وہ بڑی بڑی کالی آنکھیں ویسے ہی مسکاتی رہیں اور اس کے سامنے وہ بڑا سا سرخ و سپید چہرہ یونہی معلق رہے اور وہ ابا کے ساتھ ہمیشہ وہیں اس مٹی کے گھروندے میں رہے اور اور...............

اس کے بعد گندے نالے کے پاس کھیلتے ہوئے وہ چوری چوری دعائیں مانگتا کہ ابا گھر سے نکل کر اسے اشارہ کریں۔ ایلی ادھر آؤ ہمارے ساتھ چلو وہ سای طرح خانم کے گھر جائے اور اس دروازے سے خانم کی سیاہ آنکھانہیں دیکھے اور بالآخر اس کا ہاتھ اسے تھپکے۔ کبھی کبھی اس کی خواہش پوری ہو جاتی۔ ابا باہر نکل کر انگلی کے اشارے سے بلاتے اور پھر کہتے "اس مکان میں جہاں تم اس روز گئے تھے۔ تمہیں یاد ہے نا وہاں جاؤ اور خانم کو یہ دے آؤ" اور وہ چپکے سے ایک گٹھڑی سی اس کی بغل میں تھما دیتے۔ "کسی سے کہنا نہیں سمجھے۔" وہ زیر لب کہتے اور ایلی خانم کے گھر کی طرف اڑ لیتا اور پھر خانم کا چٹا سفید ہاتھ پیار سے اس کے منہ کو تھپکتا اور اس کے ہونٹ سہلاتا وہ مٹی کا گھروندا اس کی آنکھوں تلے کانپتا اور اس کے دل میں کچھ کچھ ہوتا نہ جانے کیا ہوتا۔

پھر ایک روز خانم ان کے اپنے گھر آ گئی۔ ایلی نے اسے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ خانم نے رازدارانہ نگاہ ایلی پر ڈالی۔ اندر سے ابا بھاگے باہر آئے۔ "صفیہ یہ استانی ہیں۔ اسلامیہ سکول کی بڑی استانی تم سے ملنے آئی ہیں۔ بیٹھ جاؤ۔ استانی صاحبہ۔ ایلی ان کے لئے کچھ لاؤ نا بھئی۔ اتنی دور سے آئی ہیں۔ کتنی دور ہے آپ کا سکول ہاں آٹھ کوس مجھے یاد آ گیا اور نام کیا ہے۔ سلاں والی نہیں نہیں۔ سیل آباد ٹھیک "اور علی احمد کو دیکھ کر خانم نے اتنا بڑا گھونگٹ نکال لیا اور ان کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئی۔ پھر وہ ایلی کی طرف دیکھ کر رازدارانہ انداز سے مسکرانے لگی۔ لیکن وہ ابا سے پردہ کیوں کر رہی تھی اس نے گھونگٹ کیوں نکال رکھا تھا کیا وہ استانی تھی؟ لیکن وہ تو

وہیں رہتی تھی۔۔۔شہر میں؟ پھر ابا کیوں کہہ رہے تھے کہ وہ بیل آباد سے آئی ہے ایلی سمجھ میں خاک بھی نہ آیا۔ مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ خانم عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے اسے بلا رہی ہو جیسے ہاتھ کی بجائے نگاہوں سے اسے تھپک رہی ہو۔۔۔۔۔۔۔سہلا رہی ہو۔

"نہیں نہیں۔" علی احمد کہہ رہے تھے "اگر آپ کو میرا یہاں آنا ناگوار ہے تو میں باہر چلا جاتا ہوں۔ ہاں ہاں اچھا تو آپ کے سکول میں کتنی لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں؟ آپ کے سکول کا بڑا چرچا ہے۔" خانم مسکرائے جا رہی تھی۔ مسکرائے جا رہی تھی۔ صفیہ گھور گھور کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور ہاجرہ اندر سبز رنگ کی میٹھی بوتلیں کھولنے میں مصروف تھی تاکہ بیل آباد کی استانی کی تواضع کی جا سکے۔

تین بچے

اس روز ایلی کو ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ تین بچے عجیب وغریب کھیل کھیل رہے ہوں۔ علی احمد، خانم اور ایلی۔ ابا تو یوں سنجیدگی سے باتیں کئے جا رہے تھے۔ جیسے وہ علی احمد نہ ہوں۔ مگر ان کی آنکھوں کی چمک ان کے بہروپ کی چغلی کھا رہی تھی اور خانم یوں لپٹی ہوئی بیٹھی تھی، جیسے واقعی ہی علی احمد اس کے لئے ایک بیگانہ شخص ہوں۔ لیکن وہ ہر بار ایلی کی طرف دیکھ کر یوں آنکھ چمکاتی کہ اسے اس انوکھے کھیل کا لطف آجاتا اور اس کا جی چاہتا کہ وہ کھیل ہمیشہ کے لئے جاری رہے۔ اور خانم اس کی طرف دیکھ مسکاتی رہے ایلی کا جی چاہتا تھا کہ وہ قہقہہ مار کر ہنس دے۔

پھر جلد ہی چند ایک ماہ کے اندر اس استانی کا راز کھل گیا جو بیل آباد کے سکول میں پڑھاتی تھی اور علی احمد سے گھونگٹ نکالنے میں احتیاط سے کام لیتی تھی اور صفیہ کا منہ غصے سے لال ہو گیا اور اس کی آواز سارے محلے میں گونجنے لگی۔ حالات بگڑتے دیکھ کر علی احمد تو گھر سے باہر چلے گئے اور جان بوجھ کر دیر سے آئے۔ حقیقت یہ تھی کہ

روز بروز علی احمد کی طبیعت صفیہ سے ہٹتی جا رہی تھی اور سفیہ کو خود اس کا احساس ہوتا جا رہا تھا کہ اس کا اثر ختم ہو چکا ہے۔ اپنے اثر کو قائم رکھنے کے لئے اس نے از سر نو ہاتھوں پر مہندی لگائی۔ باریک ریشمیں قمیص پہنی، سیاہ کناری والے دوپٹے اوڑھے لیکن ان کوششوں کے باوجود اس کا رنگ زرد پڑتا گیا اس کی آواز مرجھا گئی۔ یہ محسوس کر کے صفیہ نے نئے پہلو سے اپنی اہمیت کا احساس اخذ کرنے کی کوششیں کیں۔ علی احمد نہیں تو نہ سہی ہاجرہ جو ہے جس پر حکومت کر سکتی تھی۔

علی احمد مزاج کے بہت شگفتہ واقع ہوئے تھے۔ وہ صفیہ کے غصے کو دیکھ کر چوری چوری مسکراتے اور پھر سنجیدگی سے ان بگڑے ہوئے حالات پر بات کرنے کی بجائے جھٹ ٹین کا سپاہی ہنسے جاتا لڑے جاتا حتیٰ کہ صفیہ کا غصہ ختم ہو جاتا اور وہ مسکرانے لگتی اور ٹین کا سپاہی فاتحانہ طور پر قہقہہ لگاتا اور سب ٹھیک ہو جاتا۔ لیکن اس کے باوجود اب سب ٹھیک نہ ہوتا تھا۔ صفیہ کے دل کی پھانسی نکلتی تھی اور اس کا رنگ روز بروز زرد ہوتا جا رہا تھا۔ خانم روز آ موجود ہوتی تھی اس کی موجودگی سے صفیہ کا رنگ اور بھی پھیکا پڑ جاتا اور گھر میں خانم کے قہقہے گونجتے اور اس کی کالی آنکھیں مسکاتیں اور علی احمد دبی خوشی سے بے تاب ہو کر جھومتے اور چلاتے ''ایلی اب تم ذرا سراب کو کھلاؤ باہر جا کر کھلاؤ اسے۔ اسے باجا سناؤ۔'' اور ایلی بڑی مسرت سے سراب کو اٹھا لیتا اور خانم کے چھیڑ دینے والے ہاتھ ایلی کے منہ کو تھپکتے اور اس کا جسم جھن جھنے کی طرح بجتا اور رگ و پے پر بیر بہوٹیاں سی چلتیں اور خوشی سے اس کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے اور وہ محسوس کرتا جیسے ہوا میں اڑا جا رہا ہو۔ خانم کی نگاہیں علی احمد کو جھنجھناتیں اور علی احمد فرط اس سے یا نہ جانے کیوں صحن میں ادھر ادھر گھومنے لگتے اور صفیہ بیزار ہو کر پلنگ پر جا بیٹھتی اور منہ دیوار کی طرف موڑ لیتی۔

خانم کے آنے سے صفیہ ایلی سے اور بھی چڑنے لگی ''ہوں تو تو ابا کے پیغام لے کر جاتا ہے شرم نہیں آتی۔'' اور شرم آنے کی بجائے ایلی ایڑیاں اونچی ہو جاتیں اور اس

کی چھاتی تن جاتی اور وہ ابا سے گہرے تعلقات رکھنے کے خیال سے فخر محسوس کرتا۔

ابا اب تقریباً روز کھانا کھاتے ہوئے اسے آواز دیتے ''ایلی'' اور پھر دو انگلیوں میں لٹکتا ہو گوشت کا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں تھما دیتے۔ اب وہ اسے مرے ہوئے چوہے کی طرح نہ پکڑتا تھا بلکہ یوں لٹکائے چلا جاتا جیسے وہ کوئی تمغہ ہو اور پھر روٹی پر رکھ کر اسے یوں کھاتا کہ فرحت دیکھ لے تو جل کر راکھ ہو جائے۔

صفیہ اب عام طور پر چپ چاپ اکیلی پڑی رہتی اور رتناہی میں کھانستی رہتی تھی۔ ادھر علی احمد کے کمرے میں خانم کے قہقہے گونجتے۔ سراب کو بہلانے کے لئے ایلی گراموفون پر پرانے ریکارڈ لگاتا اور خانم کی سریلی آواز کے ساتھ ساتھ موسیقی کا ساز چھڑ جاتا ادھر باورچی خانے میں ہاجرہ خانم کے لئے چائے بنانے میں مصروف رہتی۔ پھر دفعتاً علی احمد چلاتے ''ایلی سراب کو باہر لے جاؤ۔ وہاں بہل جائے گا۔'' سراب کو اٹھا کر ایلی باہر نکل آتا اندر خانم کی سریلی سروں پر ٹین کا سپاہی رزمیہ انداز سے رقص کرتا اور ایلی کا جی چاہتا کہ وہ چھپ چھپ کر اس رقص کو دیکھے۔

بیچاری صفیہ کا بیشتر وقت اب تنہائی میں گزرتا تھا۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے خاموشی سے اکتا کر یا تو وہ ہاجرہ کو کوستی رہتی یا کھانستی رہتی۔

ہاجرہ نے کئی ایک بار ایلی کو بتایا تھا کہ صفیہ بیمار ہے اسے سل کا عارضہ ہو گیا ہے مگر ایلی کو اعتبار نہ آتا تھا۔ صفیہ بیماری یا کسی اور وجہ سے عاجز آ جائے ایلی اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ صفیہ کو کوئی عارضہ ہو جائے۔ اور انہوں یہ تو محض تنہائی کی وجہ سے تھا ابا جو باہر رہتے تھے اور پھر خانم جو آ جاتی تھی وہاں' خانم آتی تو گھر میں ایک شور مچ جاتا۔ خانم کتنا شور مچاتی تھی۔ اس کا ایلی کو مسکا کر دیکھنا لگا سے ایلی کا منہ سہلانا اور اس کے منہ کو جھن جھنے کی طرح بجانا۔ اب ایلی کو معلوم ہو چکا تھا کہ خانم استانی نہ تھی یہ جان کر اسے بہت دکھ ہوا تھا اگر وہ استانی ہوتی تو خوب رہتا۔ وہ دل ہی دل میں سوچتا تھا نہ جانے استانی کیسی ہوتی ہو گی وہ تو فر فر

انگریزی بولتی ہوگی اور پھر اونچی ایڑی کی جوتی پہن کر ٹپ ٹپ چلتی ہوگی بالکل جیسے بازاروں میمیں چلتی ہیں۔

استانی

پھر ایک روز علی احد دورے پر جانے لگے تو انہوں نے ایلی کو پاس بلایا "چلو ایلی" وہ بولے۔ "تمہیں ساتھ لئے چلتے ہیں۔" ایلی گھبرا گیا نہ جانے علی احمد اسے کہاں لے جائیں گے۔ ہاجرہ نے یہ بات تعجب سے سنی اور صفیہ نے ناک چڑھائی ..... "نہیں نہیں گھبرانے کی کیا بات ہے۔" علی احمد بولے "وہاں سکول کی استانی ایلی کا خیال رکھے گی۔" استانی ...... ایلی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

جب وہ ابا کے ساتھ تانگہ میں بیٹھا تو خانم کا ہاتھ لگے بغیر ہی اس کے گال جھن جھنے کی طرح بج رہے تھے اور دل دھک دھک کر رہا تھا۔ استانی۔ استانی اس محلے کی چکی خوشی سے چیخ رہی تھی۔ تانگہ میں بیٹھے ہوئے وہ چاروں طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن اسے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا وہ کھیت وہ سڑک وہ پیڑ سب دھندلائے ہوئے تھے دور افق پر .... ٹیلوں کے پیچھے سے ایک حسینہ جھانک رہی تھی۔

جب وہ منزل پر پہنچے تو انہیں ایک صاف ستھرے کمرے میں بٹھا دیا گیا اور پھر انکی تو اضع کے لئے دودھ کی ایک بھری ہوئی گاگر آ گئی۔ اتنا سارا دودھ اور سکول میں اس کے اپنے مدرسے میں تو دودھ دیکھنے میں نہیں آیا تھا کبھی البتہ خوانچے والے مدرسے کے باہر پاپڑ اور پکوڑے بیچا کرتے تھے دودھ تو نہیں بیچتے تھے وہ شاید زنانہ مدرسوں میں دودھ بکتا ہو۔ بہر صورت وہ حیران تھا دو اونچے لمبے گلاس رکھ کر نوکر چلا گیا۔ پلنگ پر علی احمد تکیہ لگائے حق پی رہے تھے۔ جیسے وہ خانم کے گھر پیا کرتے تھے۔ ایلی نے ان کی طرف دیکھا اور اسے محسوس ہوا کہ کچھ ہونے والا ہے۔

"سلام و علیکم" عورت کی آواز سن کر ایلی چونکا۔ اس نے مڑ کر دیکھا پیچھے لٹکے ہوئے پردے سے ایک حنائی ہاتھ نکل آیا "بچے کو اندر بھیج دیجئے۔ کہیے اچھے تو ہیں آپ

شکر ہے ''ایلی'' علی احمد بولے۔ اندر جاؤ استانی جی بلا رہی ہیں تمہیں۔'' ایلی ہچکچاتا رہا لیکن علی احمد کی نگاہ میں سنجیدگی کی جھلک تھی ''آؤ نہ بیٹا'' اندر سے آواز آئی اور ایلی جھجکتا ہچکچاتا ہوا اندر چلا گیا۔ ارے استانی کی طرف دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گیا۔ اس کا رنگ کالا تھا۔ جسم بھدا اور منہ پر بیزار چھائی ہوئی تھی۔

ایلی کے تخیل میں تو استانی نہ جانے کیا تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ استانی خانم سے کہیں زیادہ خوبصورت اور رنگین ہو گی اس کی آنکھوں میں شرارت چمک رہی ہو گی اور مژگاں اشاروں سے لدی ہوں گی اور اس کے ہاتھ خانم کے ہاتھوں سے زیادہ بے تکلف ہوں گے جو اسے جھنجھنائیں گے۔ اس استانی کے چہرے پر تو نحوست چھائی ہوئی تھی۔ اس کی حرکات بے حد بھدی تھیں اور پھر شلوار کی جگہ چادر باندھ رکھی تھی۔ عورت اور چادر۔ لاحول ولا قوۃ۔ ایلی کے دل میں نفرت کھولنے لگی۔ یہ کیسی استانی کے ہاں لے آئے تھے۔ ابا شاید وہ غلطی سے وہاں آ گئے ہوں۔ لیکن اس معاملے میں ابا غلطی نہیں کر سکتے تھے اور اب بھی وہ چارپائی پر مطمئن اور متوقع انداز سے لیٹے ہوئے تھے۔ ایلی حیران تھا۔

استانی کی نگاہیں علی احمد پر لگی ہوئی تھیں۔ جیسے انہیں جانچ رہی ہوں تول رہی ہوں تو یہ تھیں استانی 'ہیڈ معلّمہ' ''یہ لو مٹھائی۔'' اس نے ایلی کے سامنے مٹھائی تھالی رکھ دی اور خود پھر سے پردے کے پیچھے آ کھڑی ہوئی وہ پھر سے علی احمد سے باتیں کرنے لگی ''شمیم تو ان دنوں کشمیر میں ہے وہ وہیں رہتا ہے کیوں نہ رہے لڑکی کے کھانے پینے کے دن ہیں اور پھر وہ تو کشمیر کے میووں پر پلی ہوئی ہے۔ یہ سرخ چہرہ اللہ جھوٹ نہ بلائے کوئی جوانی آئی ہے لڑکی پر! آنکھیں پھٹتی ہیں دیکھ کر اور پھر اوپر سے دسویں پاس۔''

''اچھا دسویں بھی کر لی ہے؟'' علی احمد نے قہقہہ مار کر پوچھا۔

''پچھلے سال جو کی تھی میں نے بتایا تو تھا۔''

''اچھا'' علی احمد بولے ''لیکن تم بھی تو آج تک باتیں ہی کرتی رہی ہو کبھی ملایا تو نہیں شمیم سے۔''

''ہے بچی ہے ابھی۔'' استانی ذرا تنک کر جواب دیا ''عمر ہی کیا ہے اس کی افسروں کے سامنے کہاں آتی ہے۔''

''بیگماں ادھر دیکھو۔'' علی احمد بولے ''ہم کیا غیر ہیں؟''

''نہیں غیر تو نہیں۔'' وہ بولی ''پھر بھی جب تک بات طے نہ ہو جائے'' ''بھی واہ''۔ وہ ہنسنے لگے'' کیا کوئی کسر باقی ہے۔ بات طے ہی سمجھو۔'' نہ جانے وہ کس کی باتیں کر رہے تھے۔ شمیم کون تھی وہ کشمیر میں کیوں پل رہی تھی۔ اس کی طرف دیکھ کر آنکھیں چھلکتی تھیں اور وہ بات کیا تھی جسے طے سمجھا جا رہا تھا۔ ایلی ان کی باتوں سے اکتا گیا اور مٹھائی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ استانی سے تو مٹھا ہی کہیں اچھی تھی۔

دورے سے واپسی پر علی احمد نے گھر میں داخل ہونے سے پہلے کہا ''دیکھو ایلی گھر میں کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے باپ کی طرف دیکھا اور بات سمجھے بغیر ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر وہ سوچتا رہا کہ نہ کرنے کی بات ہی کونسی تھی۔ کوئی بھی تو نہیں وہ تو وہاں دودھ پینے کے علاوہ مٹھائی کھاتا رہا تھا اور وہ شمیم کی باتیں کرتے رہے تھے اور پردہ ہوا سے اڑتا رہا تھا ''ہائیں!'' دفعتاً اسے خیال آیا۔ استانی نے تو شلوار کی جگہ چادر باندھی ہوئی تھی۔ جیسے جاٹ باندھتے ہیں رنگدار چادر 'ساڑھی نہیں' رنگ دار چادر اور قمیض' آخر استانی نے چادر کیوں باندھی ہوئی تھی۔ شاید ابا کا بات نہ کرنے سے یہی مطلب ہو گا کہ گھر والوں کو پتہ نہ چلے کہ استانیاں شلوار پہننے کی بجائے چادر باندھتی ہیں۔ لیکن وہ شمیم کون تھی۔ جو کشمیر کے پھلوں پر پل رہی تھی اور جس پر جوانی ٹوٹ کر آ رہی تھی۔ شاید علی احمد شمیم کی بات کو چھپانا چاہتے تھے۔ اسے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ بہر حال اس پر استانی کی حقیقت تو کھل چکی تھی۔ استانی سے مایوس ہو کر وہ ایک دفعہ پھر خانم کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن جلد ہی

خانم کا قرب بھی اس سے چھین لیا گیا اور علی احمد نے کسی وجہ سے انہیں علی پور بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ہاجرہ فرحت اور ایلی عیل پور آ گئے۔

چوگان اور پیڑے

پہلی مرتبہ محلہ میں آ کر اس نے واضح طور پر محسوس کیا کہ محلے والے اسے علی احمد کا وارث سمجھتے ہیں اور اس کی ماں کو گھر کا نوکر نہیں سمجھتے اور پلنگ پر بیٹھنے والی صفیہ کو گھر کی مالکہ نہیں مانتے "تم آ گئے بیٹا۔" چچی جان نے اسے دیکھ کر پیار سے سر پر ہاتھ پھیرا "اچھا ہوا تم یہ گھر تمہارا ہی ہے۔ جو تم ہو وہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا اور وہ صفیہ کالے منہ والی چڑیل اسے کون جانتا ہے اچھا کھیلو بیٹا کھیلو۔"

بوڑھی جاناں چلائی "خدا کا شکر ہے۔ میرا بیٹا ایلی گھر آیا۔ جانے دو علی احمد کو در در کی خاک چھانتے تم کیا اس کے نوکر ہو جو اس کی چاکری کرتے پھرتے ہو۔ تم اللہ کے فضل سے اس گھر کا چاند ہو۔"

"آ گئی تو ہاجرہ۔" برکتے بولی۔ "سو بار آ تمہارا اپنا گھر ہے بیٹی۔ علی احمد کا کیا ہے اس کے سر پر تو عورتوں کا بھوت سوار ہے۔ بس عورتیں ہوں۔ اللہ ماری رنگ رنگیلی۔ ان کے نخرے ٹسے اور چھیڑ چھاڑ ہو اور میاں پریوں کے درمیان میں اندر بن کے بیٹھے رہیں دفع کر علی احمد کو۔" ہاجرہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ "نہ بیٹی تو اپنا آپ کیوں ہلکان کرتی ہے۔ تیری بلا سے جو تو ہے وہ اور کون ہو سکتی ہے۔ محلہ والوں کی نگاہ میں۔ آپ جھک مار کر تھک جائے گا۔ اللہ کرے یہ تیرا ایلی جئے زندگی دراز ہو۔"

کئی ایک روز تو محلہ والیوں کا تانتا بندھا جا رہا اور ہاجرہ بات بات پر آنسو بہاتی رہی اور محلے والیاں اسے دلاسہ دیتی رہیں ایلی حیران تھا کہ اماں بات بات ہر رو کیوں دیتی ہے۔ رونے کی تو کوئی بات نہ تھی نہ جانے پھر وہ کیوں روئے جا رہی تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ صفیہ سے جدا ہو گئی تھی۔ مگر محلے میں پہنچ کر تو اس کا انداز ہی بدل گیا

تھا۔ جیسے وہ صفیہ سے بیزار ہو۔ جیسے وہ خوشی سے اس کے خدمت نہ کرتی ہو مگر باہر کر تو وہ صفیہ صفیہ کرتے تھکتی نہ تھی۔ ایلی کو کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔

نیچے احاطے میں محلے کی بوڑھیاں چرخے رکھے باتوں میں مشغول تھیں۔ سب انہیں کی باتیں کر رہی تھیں۔ علی احمد کے قصے۔ ہاجرہ کی مظلومیت۔ چاروں طرف لوگ ہاجرہ فرحت اور ایلی سے ہمدردی جتا رہے تھے اور ہاجرہ کی نیکی اور خدمت گزاری کا تذکرہ کر رہے تھے اور ہاجرہ ڈھلکتے آنسوؤں کے باوجود پھولے نہ سما رہی تھی۔ آنسوؤں کے علاوہ اس کی آنکھوں میں ایک عجب سی چمک تھی۔ ایلی نے اس چمک کو پہلے کبھی اس کی آنکھوں میں نہ دیکھا تھا۔

گھر میں صرف دادی اماں خاموش تھی وہ ایلی کی طرف دیکھتی مسکراتی اور پھر تلخ انداز سے کہتی "ایلی اب تو سارا دن آوارہ گردی ہی کرتا رہے گا کیا۔" اور ایلی محسوس ہوتا جیسے وہ اسے گھورنے کی بجائے پیار کر رہی ہو۔ "اسد ھر آ۔" وہ چلاتی اور ایلی دبکنے کی بجائے اس کے کندھوں پر جا سوار ہوتا اور پھر بڑھیا ہنستی۔ "تو تو میرے کندھے توڑ دے گا۔ ہٹ اب مجھے نماز پڑھنی ہے۔ دفع ہو۔" اور ایلی کے کندھوں سے اور بھی چمٹ جاتا۔

ہاجر کو روتے دیکھ کر دادی اماں ہاتھ چلا کر کہتی "تو تو پاگل ہے لڑکی خواہ مخواہ جان کھپا رہی ہے۔ علی احمد کا کیا ہے۔ ہو جائے گا ٹھیک آپ ہی مرد ایسے یہ ہوتے ہیں۔"

کئی ایک دن تو یونہی رونے دھونے کا سلسلہ جاری رہا پھر ایلی اکتا کر باہر نکل گیا اور چوگان میں کھیلنے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ محلے کے لڑکوں سے واقف ہوتا گیا اور دھیرے دھیرے اس کی جھجک کم ہوتی گئی۔ جمیل سے مل کر وہ بے حد خوش ہوا اسے دلی کی یاد آ گئی جہاں وہ پارسی لڑکی رہتی تھی اور اٹھنی دیئے بغیر انہوں نے حلوہ خریدا تھا ۔جمیل نے اسے دیکھ کر کہا۔ "آؤ ایلی چلو پیڑے کھائیں۔" "پیڑے" ایلی کے منہ

میں پانی بھر آیا۔ ''لیکن کیسے۔ تمہارے پاس اٹھنی ہے کیا؟'' ''نہیں'' جمیل بولا۔ ''روپے بہت سے روپے آؤ دکھاؤں تمہیں۔'' جمیل نے لکڑی کی چوکی اٹھائی اور اس کے پاؤں تلے دو روپے پڑے تھے۔ ایلی حیران رہ گیا ان کے گھر میں تو ایسی کوئی چوکی نہیں تھی، جس کے پاؤں تلے روپے ملتے ہوں چوکی تلے روپے اس نے حیرانی سے جمیل کی طرف دیکھا۔ ''ہاں'' جمیل نے لاپروائی سے کہا۔

''اماں کے ہیں۔ میں نے اٹھا کر چوکی تلے چھپا دیئے تھے۔''

اتنے پیڑے ایلی نے کبھی زندگی بھر نہ دیکھے تھے.......اس نے چار ایک تو بڑے شوق سے کھائے۔ پھر وہ اکتا گیا اس کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ اس نے گناہ کیا ہے جرم کیا ہے۔ اتنے پیڑے خریدنا جرم نہیں تو اور کیا ہے۔ اس نے شدت سے محسوس کیا کہ چاند حلوائی کو معلوم تھا کہ وہ روپے اس نے چوکی تلے سے نکالے ہیں۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ خاموش مگر چالاک مسکراہٹ اور جھینپ رہا تھا۔ نہیں نہیں میں نہیں۔ میرے پاس تو ایک پیسہ نہیں ہے۔

پیڑے کھانے کے بعد ایلی پر مجرمانہ خاموشی طاری ہوگئی اور وہ واپس چلے آئے۔ ٹھک ٹھک' ایلی نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ ہائیں وہ گھبرا گیا۔ رضا لکڑی ٹیکتا اور لنگڑی ٹانگ گھماتا ہوا آ رہا تھا۔ اس نے انہیں للکارا۔ ''کہاں سے آئے ہو تم۔'' بک نہیں بے جمیل ہنسنے لگا۔ ایلی کا دل دھک دھک کر رہا تھا ضرور اس لنگڑے کو جمیل کی ماں نے بھیجا ہوگا۔ ''بے۔'' رضا چلایا۔ اکیلے اکیلے پیڑے کھاتا ہے تو اوعرا سے کھلاتا ہے۔ ہوں۔ یہ پیڑے ایسے ہضم نہیں ہوئے۔ بتا دوں میں۔''

جب وہ دونوں بڑی ڈیوڑھی کے پاس پہنچے تو جمیل کو دیکھ کر سب چلانے لگے ''کیوں بھئی پیڑا۔'' ایلی کا رنگ فق ہوگیا اس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی اور وہ سب شور مچائے جا رہے تھے۔ رضا' ضیاء بالا اور پھر کان پر ہاتھ رکھ کر چلایا۔ ''بازار بکیندی برفی۔'' آہا بھائی واہ وا۔ رضا نے لنگڑی ٹانگ کھا کر دادو دینی شروع کی اور

ان سب کی توجہ پیڑوں سے ہٹ کر بالے کے گانے کی طرف مبذول ہو گئی اور ایلی چپکے سے وہاں سے سرک آیا اور دادی اماں کی رضائی میں چھپ کر پڑ رہا۔

چار ایک دن تو اس کے لئے گھر سے باہر نکلنا مشکل ہو گیا۔ لیکن چھپے رہنا بھی تو ممکن نہ تھا۔ اس لئے اسے باہر نکلنا ہی پڑا اور اسے معلوم ہوا کہ رضا ' ضیا ' بالا اور ارجمند سبھی جمیل سے پیڑے کھاتے ہیں اور جمیل روز چوکی سر کا کر روپے نکال لاتا ہے۔ اور وہ سب اس راز سے واقف ہیں یہ جان کر اس کے دل سے وہ بوجھ اتر گیا اور وہ لڑکوں میں شامل ہو کر کھیلنے لگا۔

انکر اینڈی ماباؤں

پھر اسے مدرسے میں داخل کر دیا گیا۔ مگر اس کا سکول محلے کے باقی لڑکوں کے سکول سے بہت دور تھا۔ محلے کے قریبی سکول والوں نے ایلی کو داخل کرنے سے انکار کر دیا ایک تو وہ پڑھائی میں کمزور تھا اور دوسرے اس مدرسے میں جگہ نہ تھی۔ لیکن داخل ہونے کے بعد اسے اطمینان سا ہو گیا کیونکہ جلد ہی اسے معلوم ہوا کہ اس اسکول میں بھی محلے کے چند ایک لڑکے تعلیم پا رہے تھے ان لڑکوں میں ارجمند سب سے زیادہ تیز تھا۔ ارجمند ڈاکٹر ذاکر کا بیٹا تھا وہ سب مل کر پانچ بھائی تھے۔ سب اونچے لمبے پتلے دبلے بچپن کا زیادہ تر زمانہ پانی پت میں بسر کر کے وہ پہلی مرتبہ علی پور آئے تھے۔ ان کے والد اب بھی پانی پت میں ڈاکٹر تھے۔ جہاں ڈسپنسری میں انہوں نے اپنی عمر کا زیادہ تر حصہ بسر کیا تھا۔

ارجمند بے حد لمبا تھا حالانکہ وہ ایلی کے ساتھ نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس کے قد و قامت اور برتاؤ سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے عرصہ دراز سے فارغ التحصیل ہو چکا ہو۔ پانی پت میں رہنے کی وجہ سے ارجمند فر فر اردو بولتا تھا۔ جہاں کوئی اجنبی آیا اس نے چار ایک خوبصورت فقرے چلا دیئے۔

" آیئے تشریف لایئے۔ فرمایئے۔ خاکسار کیا خدمت کر سکتا ہے۔" اور ادھر وہ

گیا ادھر اناپ شناپ بولنا شروع کر دیا۔ ویسے تو ارجمند کو سینکڑوں چیزیں یاد تھیں۔
ہنکر اینڈی ماباؤں۔ کیلے ریوُ ریو پیتے ریور پریم سندلیس پریم ٹوٹا اور نہ جانے کیا کیا
لیکن ایلی کو اس کی انکر اینڈی ماباؤں بہت پسند تھی "دیکھو ایلی" ارجمند چلاتا
"انکر اینڈی ماباؤں کے لیے رُیور یو پیئے ریو ریوُ کیا سمجھے۔" اور ایلی حیران ہو کر
اس کی طرف دیکھتا۔ ہم سمجھاتے ہیں۔ ہم سمجھاتے ہیں مطلب ہے لڑکی اجا ابنسانا
کیا مشکل ہے پچھ چکل نہیں۔ مصیب یہ ہے کہ یہاں محلے داری ہے۔ اگر ڈسپنسری
ہو تو یوں پھنستی ہے یوں جیسے چٹکی بجتی ہے اور پھر ڈسپنسری پانی بپت میں ہو تو
۔۔۔۔۔۔ تو کیا بات ہے۔ آئی پھنسی، آئی پھنسی، خیر کچھ پروا نہیں یہ دیکھو یہ
ریشمیں رومال کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ اسے کہتے ہیں۔ کیلے ریو ریو۔ سمجھے کیا
سمجھے۔ صرف ہونا ہی نہیں طریقہ استعمال بھی جاننا چاہیے۔" ہاں" اور وہ رومال ہلا کر
کہتا "لہٰذا ہم بتائیں گے یہ دیکھو۔ اسے تھامنے کی مشق کرو پہلے یوں نہیں بلکہ یوں
ہاتھ میں مرے ہوئے چوہے کی طرح نہ پڑا رہے بلکہ ہر چند منٹ کے بعد جنبش میں
آئے۔ اب منہ پونچھو گرد جھاڑو۔ ذرا احتیاط سے جنبش کی خوبصورتی ہی میں
سارا جادو ہے۔ کیا سمجھے۔ لیکن ٹھہرو یہ کیلے ریو ریو ہی کافی نہیں۔ اس پر سینٹ یعنی
خوشبو کا چھڑکنا لازمی ہے۔ یہ دیکھو شیشی چار آنے کی یہ شیشی، بیسیوں لڑکیوں کو
پھنسانے کے لیے کافی ہے ہاں تو ایس رومال سے گالوں کو سہلاؤ۔ بالوں کو جھاڑو
گردو پر لٹکا لو۔ ہاتھ میں رکھو۔ لڑکی دور کھڑی ہو تو منہ پر جھٹکا دے کر یعنی سلام عرض
کرتا ہوں اور یوں ہلایا تو مطلب ہے اب آؤ بھی نا جان من اور یوں چھاتی پر
پھینک لیا تو مطلب ہے ظالم سینے سے لگ جا اس کے استعمال کے کئی انداز ہیں۔
لیکن فی الحال یہی کافی ہے اس کے بعد یہ دیکھو۔" اس نے جیب سے ایک بانسری
نکالی اور نچلا ہونٹ لٹکا کر اس میں پھونکیں مارنے لگا "یہ ہے پریم نسدلیس کہیں اندر
بند کمرے میں بیٹھی ہے تو یہ چیز اسے منڈیر پر لے آئے گی اور آخری چیز یہ ہے پریم

ٹونا۔ دیکھا" اس نے ایک چھوٹی سی کتاب جیب سے نکالی۔ "اس میں سب کچھ لکھا ہے محبت کے خطوط غزلیں، گیت ہر موقع کے لیے" مثلاً یہ دیکھو" اور وہ گانے لگا "جب سے تم پر ہوا ہوں شیدا نائٹ سلیپنگ چھوڑ دیا۔" بڑی لاجواب چیز ہے۔ سنتے ہی لڑکی ہنسی اور ہنسی تو سمجھو پھنسی اور یہ سب کچھ کیا ہے انکرا ینڈی ماباؤں۔"

ایلی اس کی باتیں غور سے سن رہا تھا اور بے حد کمتر محسوس کر رہا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ لڑکی پھنسانے کا مقصد کیا ہے۔ آخر اتنے بڑے انکرا ینڈی ماباؤں کا کچھ تو مقصد ہوگا لڑکیاں نہیں۔ اسے تو میار عورتیں اچھی لگتی تھیں۔ لڑکیاں خاصی لگتی تھیں۔ لیکن کوئی خاص اچھی نہ لگتی تھیں اور اچھی لگتی بھی تو بھی انہیں پھنسانے کا مطلب۔ اچھی لگتی تھیں۔ نہیں اچھی لگتی تھیں تو نہیں اچھی لگتی تھیں۔ لیکن وہ ریشمی رومال اور بانسری اور پریم ٹونا پریم سندیس وہ سب کس لئے تھے۔ خانم کی ابت تو اور تھی نا۔ وہ تو بہت ہی اچھی تھی اور اس کا ہاتھ سے ایلی کو تھپکنا منہ سہلانا۔ کتنا اچھا لگتا تھا۔ لیکن چھوٹی چھوٹی لڑکیاں۔ وہ تو شرم سے آنکھیں جھکا لیتی تھیں۔ دور سے دیکھ دیکھ کر مسکراتی تھیں خواہ مخواہ ہنسے جاتی تھیں۔ بے کار بے مصرف۔ اگر ارجمند کو لڑکیاں اچھی لگتی تھیں تو ٹھیک تھا۔ لیکن وہ سب گورکھ دھندا۔ انکرا ینڈی ماباؤں کیا تھا۔ فضول ہو نہ ہو۔ ارجمند جانتا ہی کیا تھا۔ نہ تو اس نے خانم کو دیکھا تھا اور نہ کسی کو پانی پت کے ہسپتال میں مریضوں کے ساتھ رہنے سے کیا ہوتا ہے۔

ہکوری ڈکوری

ایک روز ارجمند دوڑا دوڑا ایلی کے گھر آیا۔ اسے ادھر ادھر آؤ بھاگ کے آؤ بھاگ کے آؤ۔ آؤ۔ ورنہ پچھتاؤ گے۔ ساری عمر پچھتاؤ گے۔ وہ ایلی کو اپنے گھر کی طرف گھسیٹنے لگا۔ تم بھی کیا یاد کرو گے کہ دوست نے ہکوری ڈکوری بھی نہیں دکھایا۔ چلے آؤ آج گھر میں کوئی نہیں ہے۔ وہ سب پیر جی کے یہاں گئے ہیں۔ آداب و نیاز کے لئے اور ہم رہ گئے ہیں یہاں انداز و ناز کے لئے۔"

گھر پہنچ کر اس نے ایلی کو بند کھڑکی میں دھکیل کر کہا۔ "اب یہاں بیٹھ جاؤ۔ چپ شور نہ مچانا کھڑکی ان درزوں سے دیکھو ہکورڈ کوری۔" اور وہ دونوں بیٹھ کر بند کھڑکیوں کی درزوں میں سے دیکھنے لگے۔ ایلی کو کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ مگر ارجمند چلائے جا رہا تھا۔ "وہ سامنے بالکونی دکھائی دیتی ہے نا۔ بس اس میں کھیل ہوتا ہے ہکوری ڈکوری کا۔ سمجھے۔ آیا نظر ۔۔۔۔۔۔۔۔ نہیں ابھی نہیں انتظار کرو ابھی آئے گا۔" سامنے سبز رنگ کا جنگلہ صاف دکھائی دے رہا تھا اس کے اندر دو دروازے ایک کمرے میں کھلتے تھے۔ جنگلے سے نیچے محلے کا بازار تھے سامنے دوکان پر عماد حلوائی دودھ کی کڑاہی صاف کر رہا تھا۔ ساتھ ہی حکیم صاحب مریضوں کے انتظار میں بیٹھے داڑھی کو سہلا رہے تھے۔ "آیا" ارجمند نے چٹکی بجائی "وہ رہا" ایلی نے شوق سے جنگلے کی طرف دیکھا۔ جنگلے کے پیچھے کمرے میں ایک دھندلی شکل دکھائی دی۔ "ابھی ادھر آئیں گے۔ کچے دھاگے سے کھینچی آئے گی سرکار مری۔"

زن سے ایلی کے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی اس کے سر میں بھن بھن سا ہونے لگا جیسے دفعتاً سر مکھوں کے چھتے میں بدل گیا ہو۔ دل گھڑی کی طرح بجنے لگا۔ جنگلے کے پچھلے دروازے میں ایک عورت کھڑی تھی۔ اس نے جسم پر ایک تولیہ لپیٹ رکھا تھا۔ ایک طرف گلابی جسم پر سیاہ بال لٹک رہے تھے جنہیں بنانے میں وہ مصروف تھی۔ دو بازو بھرے بھرے سفید بازو۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کے ہاتھ بال بنانے کے بہانے اس کا منہ سہلا رہے ہوں۔ چھن چھن چھن جھنجھنا بجنے لگا ارجمند جانے کیا کیا کہے جا رہا تھا۔

دفعتاً بالوں کو جنبش ہوئی اور۔ اور۔ ایک بڑا سا چہرہ دکھائی دینے لگا۔ چوڑا۔ چٹا سفید دو مخروطی بانہیں لٹکنے لگیں ۔۔۔۔۔۔۔ "انہوں" ارجمند چلایا "یہ تو دوسرا ایڈیشن ہے یہ نہیں بڑا والا ایڈیشن نہیں بالکل نہیں ہمیں تو چھوٹا والا چاہیے چھوٹا والا چلو ایلی یہ سب غلط ہے۔ یہ ہکورڈ کوری نہیں۔ یہ تو ہکوراڈ کورا ہے۔ چلو۔"

ایل کا جی نہ چاہتا تھا کہ وہاں سے ہٹے مگر ارجمند نے اس کا بازو کھینچ لیا اور اسے باہر لے گیا۔ سب غسل فرماتی ہیں۔ سب چھوٹا بڑا اسائز پھر غسل فرمانے کے بعد اس کمرے میں ضرور آتی ہیں۔ تولیہ لپیٹے کچے دھاگے کا معجزہ ہے۔ بڑی چیز ہے کچا دھاگا" "لیکن یہ گھر کس کا ہے؟" ایلی نے پوچھا کیونکہ وہ گھر محلے سے باہر تھا اور ایلی کو معلوم نہ تھا کہ وہاں کون رہتا ہے "کسی کا بھی ہو۔" ارجمند نے کہا "ہمیں تو آم سے مطلب ہے پیڑ سے نہیں اور آم بھی وہ جو آم ہو حلوہ کدو نہیں۔ سمجھے ہمارے پاس آیا کرو گے تو یونہی عیش کرائیں گے۔"

ہم جولی ٹولی

محلے میں ہر عمر کے لڑکے تھے اور عمر کے مطابق وہ ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے مثلاً ایک تو جلیل یوسف اور رفیق کی ٹولی تھی جو عمر میں اس سے بڑے تھے۔ جیلی اس کی خالہ زاد بہن کا بیٹا تھا۔ رفیق اس کا ماموں زاد اور لطیف خالہ زاد بھائی۔ والدہ کی طرف سے اس کا قریبی رشتہ دار کوئی نہ تھا اور ہوتا بھی تو کیا تھا۔ علی احمد پرانے رشتہ داروں کو خوش رکھنے کی نسبت نئے رشتے پیدا کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔

رفیق جمیل کا بڑا بھائی تھا۔ لیکن وہ جمیل سے قطعی طور پر مختلف تھا۔ نہ تو اسے چوکی تلے روپے رکھنے کا شوق تھا نہ حلوائی سے پیڑے کھانے کا اور نہ ہی بھیڑ والی دوکان سے اٹھنی کا سودا خریدنے کا جمیل کی طرح نہ تو وہ شوخ تھا نہ دبلا پتلا۔ اس کے انداز میں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ تھا۔ جسم فربہی پر مائل تھا۔ طبیعت میں خاموشی اور مٹھاس نمایاں تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ بے حد ملنسار تھا۔ ہمیشہ کوشش کرتا تھا کہ لوگوں کے کام آئے۔ رفیق مزاج کا رنگین تھا۔ لیکن یہ رنگ ہلکا ہلکا تھا مدھم مدھم سا، کبھی شوخی سے نہ چمکا تھا۔ نہ ہی اس کی طبیعت میں جرأت تھی کہ آگے بڑھ کر کچھ کہہ سکے اس کے برعکس وہ ذہنی طور پر محسوس کیے جاتا اور اظہار کرنے کے وقت پیچھے ہٹ کر جھجک جاتا اس کے باوجود کے پاس ہر وقت انگرائینڈی ماباؤں کا سب سامان

مہیا رہتا تھا۔ جیب میں ایک آنے والی غزلوں کی کتاب ہاتھ میں خوشبو دار ریشمی رومال اور آنکھوں میں شوری چوری دیکھنے اور جھکنے والی نگائیں۔

جلیل اس کے برعکس شان قلندری کا قائل تھا۔ آنکھوں میں رندانہ جھلک تھی۔ انداز میں والہانہ پن تھا اور یوسف بیچارہ تو ان معاملات سے قطعی ناواقف تھا۔ سپاہیوں کے سکول ماسٹر کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے وہ کئی ایک سال فوجی پلٹنوں میں رہا تھا اور تیچھا بھاگنا' دوڑنا' کودنا' ہالٹ کوئک مارچ کے کھیلوں کو دنیا کی سب سے بڑی لذت سمجھتا تھا۔ اس کی طبیعت ڈر سے خالی تھی اور وہ کسی عظیم الشان کارنامے کا متلاشی تھا۔ رفیق کی طبیعت میں بھی کسی کارنامے کی خواہش کی جھلک تھی۔ لیکن اس کی خواہش سے ریشمی ملبوسات عطریات حنائی ہاتھوں کی بو آتی تھی۔ یہ تینوں لڑکے ایلی کے قریبی رشتہ دار تھے اور ایلی کا زیادہ وقت انہی کے پاس کٹتا تھا۔ لیکن وہ تینوں عمر میں ایلی سے بڑے تھے اور ایلی سے چھپ چھپ باتیں کرتے تھے۔ رفیق اور جلیل آپس میں رازدارانہ طور پر کچھ طے کرتے یوسف ان کی ایسی باتوں سے اکتا کر دیوار پر چڑھنے میں مصروف ہو جاتا اور ایلی ایک طرف کھڑا شدت سے محسوس کرتا کہ کاش وہ بھی ان کی باتوں میں شامل ہوتا۔

ارجمند کے گھر سے فارغ ہو کر ایلی رفیق اور جیلی کے یہاں چلا جاتا جہاں رفیق کے دوست اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ جلیل کا گھر محلے میں نہ تھا۔ یہ بہت خوبی تھی۔ کیونکہ وہاں وہ محلے والیوں کی نگاہوں سے دور جو جی چاہے کر سکتے تھے گھر میں جلیل کو ایک علیحدہ کمرہ ملا ہوا تھا۔ اس کمرے کی کھڑکی ایک گلی میں کھلتی تھی جس میں بوڑھی عورتیں چوکیوں پر بیٹھی رہتی تھیں۔ جب وہ وہاں سے سرکتیں تو جلیل اور رفیق چوری چوری باہر جھانکنے لگتے اور ان کا ریشمی رومال کھڑکی سے باہر لہرانے لگتا۔ جسے دیکھ کر ایک ایک لڑکی جھاڑو دینے کے بہانے باہر گلی میں نکل آتی اور با آواز بلند کسی چچی یا خالہ سے باتیں کرتے ہوئے خواہ مخواہ مسکرائے جاتی اور پھر دہلیز پر جھاڑو

دیتے دیتے وہ آدھی سے زیادہ گلی صاف کر دیتی۔ اس وقت جلیل کھڑکی میں بیٹھ کر عجیب سی آنکھوں سے مسکراتا اور رفیق بے تابانہ اٹھ بیٹھا اور عالم اضطراب میں غزلوں کی کتاب سے کچھ گنگنانے لگتا۔

نہ جانے وہ لڑکی گلی میں جھاڑو کیوں دیا کرتی تھی اور با آواز بلند باتیں کیوں کیا کرتی تھی۔ اس کی آواز میں لوچ کیوں پیدا ہو جاتا تھا۔ اس کے انداز میں اس قدر شوخی کیوں تھی اور جلیل اس وقت ایسی آنکھیں کیوں بنا لیا کرتا تھا۔ جس میں بیک وقت مسکراہٹ بھی ہوتی اور وحشت بھی اور اس وقت رفیق کی آنکھوں میں بوندا باندی سی کیوں ہوا کرتی تھی؟

یہ تو ظاہر تھا کہ وہ سب کھیل اس لڑکی سے متعلق تھا مگر اس کام مقصد کیا تھا یہ باتیں ایلی کیلئے حیران کن ہونے کے باوجود بے حد دلچسپ تھیں۔ رفیق اور جلیل میں یہ عیب تھا کہ وہ ایلی کو بات سمجھانے کی بجائے اس سے بات چھپانے کی کوشش کرتے۔ اسی لئے ایلی ان کے ہاں بیٹھا بیٹھا اکتا جاتا اور ان کو چھوڑ کر ارجمند کی طرف بھاگتا۔

ارجمند اسے دیکھ کر چلاتا ”ایلی ایلی۔ چلو ایلی بڑی ڈیوڑھی میں چلیں۔“ اور وہ اپنا تمام ترانکر اینڈی ماباؤں اٹھا کر ڈیوڑھی میں چلے جاتے جہاں چورستہ بنا تھا لوگ آتے جاتے رہتے۔ ارجمند وہاں کھڑے ہو کر بانسری بجاتا اور آتی جاتی لڑکی کی طرف دیکھ کر مسکراتا۔ مذاق کرتا اور وہ جھینپ کر مسکرا کر چلی جاتی۔ ”لاجواب چیز ہے ایلی۔ مگر ابھی نہیں کچھ سال کے بعد دیکھنا۔ وہ دیکھو ٹاٹ کے پیچھے۔ ارے تم تو اندھوں کی طرح کھڑے رہتے ہو“۔ اور ایلی کا دل دھک دھک کرنے لگتا اگر کسی نے دیکھ لیا تو محلے کا بڑا بوڑھا ادھر سے گزرتا تو ایلی یوں کسی اڑتی ہوئی چڑیا کو دیکھنے لگ جاتا جیسے وہاں کھڑے ہونے سے اس کا مقصد صرف چڑیا دیکھنا ہو۔ ارجمند آنکھیں بند کر کے بانسری بجانے لگتا۔ محلے کے سب لوگ انہیں گھورتے

"ارے لڑکوں یہاں کیا کر رہے ہو۔ خواہ مخواہ رستہ نہ روکو۔ جاؤ اپنا کام کرو۔" یہ سن کر ایلی کو پسینہ آ جاتا اور ارجمند چپکے سے جواب دیتا۔ "اچھا صاحب ابھی چلے جاتے ہیں۔ ذرا انتظار کر رہے ہیں بھائی صاحب کا" ارجمند کو بات ٹالنے میں کمال حاصل تھا۔

جلیل اور رفیق کے علاوہ محلے میں ایک ٹولی تھی۔ اجمل، صفدر، اکرم، دین محمد اور غلام بخش کی۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ ٹولی محلے کے جوانوں کی تھی۔ وہ جلیل اور رفیق سے بھی الگ تھلگ رہتے تھے۔ جوانوں کی اس ٹولی کے مشاغل تخلیے میں ترتیب دیئے جاتے تھے۔ وہ منظر عام پر کوئی ایسی حرکت سرزد نہ کرتے تھے جس ہر محلے والیوں کو ان پر نکتہ چینی کرنے کا موقعہ ملے چونکہ محلے والیوں کو جوانوں سے چڑ تھی۔ وہ چھوٹے بچوں سے پیار کرتیں لیکن جوں جوں وہ بڑا ہوتا جاتا توں توں وہ ان کی نظروں میں کھٹکتا۔ حتیٰ کہ جوان ہو کر وہ مشکوک ہو جاتا اور اس کے ہر فعل پر محلہ والیاں چونک کر دیکھتیں اور چہ میگوئیاں کرتیں۔ اس ٹولی کا کوئی فرد جب باہر چوگان میں نکلتا تو محلے والیوں کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو جاتیں جیسے وہ کوئی خطرناک ارادہ رکھتا ہو۔ محلے میں جوان ہونا جرم سمجھا جاتا تھا اور جوانوں کو اس بات کا پورا احساس تھا۔ لیکن وہ مجبور تھے ان کا احتجاج دبا دبا رہتا اور ان کی بیشتر قوتیں بزرگوں کے خلاف احتجاج اور سازش کرنے میں صرف ہو جاتیں۔

اجمل دسویں جماعت پاس کر کے اب کالج میں پڑھتا تھا اور کبھی کبھی چھٹی پر محلے میں آ جاتا تھا۔ اکرم ارجمند کا بڑا بھائی تھا اور وہ اتنا لمبا تھا کہ بڑی ڈیوڑھی کے علاوہ کسی دروازے سے جھکے بغیر گزر نہ سکتا تھا۔ وہ شملے میں نوکر تھا اور کبھی کبھار چھٹی لے کر محلے میں آیا کرتا تھا۔ دین محمد علی پور میں دکان تھی اور وہ پتلا دبلا ہونے کے باوجود بڑا معزز بنا پھرتا۔

صفدر کو دیکھ کر تو ایلی بڑا مایوس ہوا تھا کیا یہ وہی صفدر تھا جو دلی میں پارسی لڑکی سے

محبت کیا کرتا تھا اور صبح شام پارسی تھیٹر میں رہا کرتا تھا۔ وہ تو بالکل ایک سیدھا سادا نوجوان تھا۔ جس میں ذرا بھی پارسی جھلک نہ تھی۔ بہر حال اس میں ایک خوبی ضروری تھی۔ جب وہ کوئی تھیٹر کی دھن گنگناتا تو اس کی آنکھوں میں عجیب بوندا باندی سی ہوتی گلابی گلابی بوندیوں کی پھوار پڑتی۔ اس کی چوڑی کلائی پر نیلے رنگ کی سیاہی میں نہ جانے کیا کھدا تھا، جسے وہ اکثر دیکھتا اور پھر کسی خیال میں کھو جاتا۔ اس کی طبیعت بہت رنگین تھی۔ رفیق کی طرح دبی دبی رنگینی نہیں بلکہ چھلکتی ہوئی رنگینی ابلتا ہوا جوش لیکن جسمانی طور پر اس پر جمود طاری رہتا تھا۔ جیسے وہ تھک ہار کر بیٹھ گیا ہو۔ غلام بخش کی آنکھیں اکثر چھتوں تلے کچھ ڈھونڈنے میں مصروف رہتیں اور اس کی چھاتی تنی رہتی۔

کبھی کبھار محلے کی ان تینوں ٹولیوں کا میل بھی ہو جایا کرتا۔ سب سے بڑی ٹولی یعنی محلے کے جوان محلے کے نوجوانوں کو بلاتے چلو بھئی آج کرکٹ کا کھیل رہے گا۔ محلے کے نوجوان محلے کے لڑکوں مطلع کر دیتے۔ کھیل کی خبر سن کر لڑکوں کی باچھیں کھل جاتیں اور وہ گیند ابلا اور وکٹیں اٹھا کر قصبے سے باہر تالاب والے میدان کو چل پڑے۔ پھر جب وہ میدان میں وکٹیں گاڑ کر سنٹر ناپ کر تیار ہوتے تو محلے کے جوان آپہنچتے ان کے آتے ہی نوجوانوں کی حکومت کا دور ختم ہو جاتا رفیق اپنا خوشبو دار ریشمی رومال چپکے سے گردن سے ہٹا کر جیب میں ڈال لیتا اور ارجمند اپنا شوخ انداز ترک کر کے مودبانہ کھڑا ہو جاتا۔ صفدر اور اکرام آ کر ایک نظر میدان پر ڈالتے۔ صفدر ہاتھ میں گیند اٹھاتا اور قمیض کی آستینیں چڑھاتے ہوئے ایک بار بازو پر کھدے ہوئے حروف کی طرف دیکھ کر سر جھٹکتا اور تھیٹر کی دھن گنگنانے لگتا۔ ''حافظ خدا تمہارا۔'' اس وقت ایلی کی آنکھوں سے وہ میدان اوجھل ہو جاتا اور تھیٹر کے منظر پر ایک پارسی لڑکی آ کھڑی ہوتی۔ ''اے دلربا میں ہوں فدا۔'' صفدر کے مضبوط بازو اس کی جانب بڑھتے اور وہ جھینپتی۔

"ایلی تم ادھر جاؤ سٹاپ کے پاس۔" ایلی چونک پڑتا۔ "سنا تم نے" اکرم گردن جھکائے چلاتا اور غلام بخش خاموش ہنسی ہنسنے لگتا۔ ایلی کو اس وقت معلوم ہوتا کہ وہ میدان میں کھڑا ہے۔ تھیٹر میں نہیں اور کھیل شروع ہونے والا ہے۔

آصفی لڑکے کرکٹ کھیلنے کے بہت شوقین تھے لڑکے تو محلے ہی میں گیند ا اور تختی سے کرکٹ کھیل لیا کرتے تھے۔ مگر جوان اور نوجوان صرف میدان میں گیند بیٹ سے کھیلتے تھے۔ صفدر گیند پھینکنے کا بے حد شوقین تھا اکرم لمبا ہونے کی وجہ سے بہت زور سے ہٹ لگاتا تھا اور غلام بخش صرف گیند روکنے کا مشاق تھا۔ اکثر میچ بھی ہو جاتے تھے۔ جس میں ایلی کا کام صرف کھلاڑیوں کی چیزوں کی رکھوالی کرنا ہوتا تھا۔ بہر حال اسے میچ میں شامل ہونے سے بڑی دلچسپی تھی۔

بالا

ان دلچسپیوں کے علاوہ محلے میں ایک اور دلچسپی تھی اور وہ بالا تھا جو بذات خود ایک ٹولی تھا اپنے آپ میں اس قدر مگن رہتا تھا کہ اسے کسی کے ساتھ مل بیٹھنے کی خواہش ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔ بالا ایلی کا ہم عمر تھا اور اس مکان میں رہتا تھا جو ایلی کے مکان کے عین سامنے واقع تھا۔ صبح سویرے ہی بالا کر اپنے بہت بڑے تخت پوش پر چیزیں سجانا شروع کر دیتا۔ یہ گراموفون ہے یہ ریکارڈ ہیں۔ یہ منہ سے بجانے والا ہارمونیم ہے اور یہ تاش کی گڈیاں ایک دو تین۔

تخت پوش پر چیزیں سجانے کے بعد وہ ان کے درمیان بیٹھ جاتا اور پھر چیزوں کو بنانے سنوارنے اور ادھر سے ادھر ادھر رکھنے میں مصروف ہو جاتا۔ "یہ نیلم ہیں اور یہ زمرد وہ اس ڈبیا میں ہونے چاہئیں۔" وہ آپ ہی اپ گنگناتا رہتا۔ "یہ۔ ہائیں۔ آج اس کا رنگ مدھم کیوں پڑ گیا۔ ہاں آج بدھ ہے نا 'بدھ' نت نت بدھ کو پکھراج کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے اور لعل کا نکھرتا ہے۔ لو لعل کہاں ہے۔ آؤ بھائی ایلی ہے۔ آجاؤ بھائی ایلی یہاں میرے سر آنکھوں پر۔ ہی ہی ہی میں

دیکھ رہا تھا کہ لعل کہاں ہے۔ پکھراج یوں چمک رہا ہو گا یوں جیسے پالش کر رکھا ہو۔ یہ قیمتی پتھر حساب کے مطابق چمکتے اور پھیکے پڑتے ہیں۔ ہاں تو ہل کہاں ہے۔ ہی ہی ہی اٹھا کے لے جاتے ہیں۔ بڑا تنگ کرتے ہیں۔ بیچارے بڑے اچھے ہیں۔ ہی ہی ہی ابھی مجھے ڈیوڑھی میں ملا تھا ایک کہنے لگا۔ نیچے کنوئیں کے پاس ایک دیگ نیلم اور پکھراج کی بھری ہے۔ وہ تو ہمیں پتہ ہے سبھی جانتے ہیں اور وہ روزان دیگوں کو ادھر ادھر کرتے رہتے ہیں۔ رات بھر آوازیں آتی رہتی ہیں وہ انہیں ادھر ادھر کرنے میں ساری رات، ساری رات چھن چھن ہوتا رہتا ہے۔ قہقہے مارے ہیں روتے ہیں چیختے ہیں اچھا تاش کھیلو گے آؤ بھلا تمہیں جانکی بائی کا ریکارڈ سنائیں۔ بیاں موری مروڑ، ہی ہی بڑا اچھا ہے۔ ہائیں یہ گرد آ گرد پڑ جائے تو ریکارڈ خراب ہو جاتے ہیں۔ تت تت تت، ہی ہی لو سنو۔"

ایلی بالے کو دیکھ کر حیران ہوتا تھا۔ اسے یہ چیزیں کون دیتا تھا۔ وہ کون تھے جو اس کے گھر میں رہا کرتے تھے اور اسے تنگ کرتے تھے اور اسے بالکل تنگ نہ کرتے تھے اور کنوئیں والے کمرے کے نیچے کیا دبا ہوا تھا اور وہ دیگیں کس کی تھیں۔

سارے محلے میں مشہور تھا کے بالے کا گھر آسیب زدہ ہے اس لئے کہ مائی عمدہ نے وہاں چلہ کاٹا تھا۔ اور جب وہ آخری رات اکیلی وہاں بیٹھی ہوئی تھی تو دو کٹے ہوئے بازو اس کے سامنے آ گرے تھے اور پھر سار یکا سارا دھڑ دھم سے آ گرا اور سر کھڑا ہو گیا اور پھر وہ بھاگی ڈر کر بھاگی اور لوگوں کے دروازے کھٹکھٹانے لگی۔ اس کے پیچھے قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لوگوں نے ڈر کے مارے دروازے بند کر لئے۔ پھر عمدہ چیخیں سنائی دیں اور پھر خاموشی چھا گئی اور صبح عمدہ بے ہوش پڑی ملی اور اس کے گرد گندگی کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

آصفی محلے میں کئی ایک مکانات اور مقامات کے متعلق ایسی ہی باتیں مشہور تھیں۔ چچی عظمت کے چوبارے کی کھڑکی آپ ہی آپ کھل جاتی تھی اور اس میں سے بے

موسم کے میوے گرتے تھے۔ شیخاں کی حویلی کی سب سے اوپر والی منزل سے رات بھر آوازیں آتی تھیں۔ حسن دین کی ڈیوڑھی میں کوئی بزرگ رہتا تھا وہاں ہر جمعرات کو دیا جلایا جاتا تھا۔ ایلی کے گھر کا چوبارہ بھی آسیب زدہ تھا اور رحمت بی بی کے کوٹھے پر تو لوگوں نے آگ جلتی دیکھی تھی۔ محلے میں عمدہ کے علاوہ کئی لوگوں نے بھی وظائف پڑھے تھے اور وہ چلہ پورا کرنے میں کامیاب نہ ہوئے تھے۔

محلّہ والیاں

اس کے باوجود بچے آزادانہ ہر جگہ کھیلتے تھے اور محلے کی بوڑھی عورتیں انہیں گھورتی تھیں۔ ''کھیل کود کا وقت ہونا چاہئے۔ ہر وقت اللہ مارا گیند بلا اور پھر ہر وقت چیخ پکار اور اس پلید گیند کے چھینٹے ان لڑکوں کو تو اللہ ہی سمجھے۔ دیکھو تو کیا حال بنا رکھا ہے۔'' دوسری کھڑکی سے جھانکتی ''ٹھیک ہے بہن کیا زمانہ آیا ہے۔ بڑے بات کریں تو یہ منہ چڑاتے ہیں۔'' تیسری بولتی ''اب تو زمانہ ہی بدل گیا نہ بڑے کا خوف نہ بوڑھے کا لحاظ۔'' بچے انہیں دیکھ کر بھاگ جاتے اور وہ وہاں کھڑی گھنٹوں نئے زمانے پر لیکچر دیتی رہتیں اور چھپے ہوئے لڑکے ان کا منہ چڑاتے ''ہوں بڑی آئی ہیں!''

محلے کی بوڑھیاں محلے کے نوجوان، بچوں اور بوڑھوں پر آکاش بیل کی طرح چھائی ہوئی تھیں حتیٰ کہ محلے کے تمام مرد بھی ان سے دبتے تھے۔

بوڑھی چڑیل

لڑکے سب سے زیادہ ایلی کی دادی سے ڈرتے تھے کیونکہ وہ ہر بات پر انہیں ڈانٹتی تھی۔ ایک بار بات شروع کرتی تو پھر مسلسل لیکچر دیئے جاتی۔ حتیٰ کہ اس کے منہ سے کف جاری ہو جاتے۔ اسکی آواز سن کر سب بھاگ لیتے تھے اور پھر کسی تنگ گلی میں چھپ کر اس کا منہ چڑاتے۔ نوجوان اسے چڑیل سمجھتے تھے۔ جوانوں میں صفدر کو تو اس کے نام سے وحشت ہوتی تھی۔ ''مجھ سے تو بیر ہے اس بڑھیا کو خواہ مخواہ ہر

بات میں میرا نام گھسیٹ لیتی ہے۔"

ایلی کی دادی کو محلے کے لڑکوں سے سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ وہ اس کی دیوار کے ساتھ گیند کھیلتے تھے۔ جس سے دیوار کمزور ہوئی جا رہی تھی۔ اس پر صفدر کو اتنا غصہ آتا تھا کہ گھر بیٹھ کر بڑے اہتمام اور محنت سے ------------ پوٹاش کا ایک اتنا بڑا پٹاخہ تیار کرتا تاکہ تہوار کے دن دادی اماں کی دیوار پر مارے۔ پٹاخہ چھوٹتے ہی زناٹے کی آواز آتی اور دادی اماں کھڑکی میں جا کھڑی ہوتی۔ "اے ہے جوانوں کے سر پر تو بھوت سوار ہے۔ خون چڑھا ہوا ہے۔ یہ تو محلے کو تباہ کر کے رہیں گے۔"

دادی اماں کو چیختے سن کر صفدر کو عجیب سی روحانی مسرت حاصل ہوتی وہ اطمینان سے گانے لگتا۔ "اے دلربا میں ہوں جدا۔" ان تمام باتوں کے باوجود ایلی کو یقین نہ آیا کہ دادی اماں سخت مزاج ہیں حالانکہ جب بھی وہ گھر جاتا تو دادی دور سے اسے دیکھ کر برس پڑتی "بس تو بھی اب کہیں کا نہ رہا۔ ان کے محلے کے لڑکوں میں کھیل کر تو بھی بگڑ گیا۔" لیکن ایلی اس کی جھڑکیوں کی پروانہ کرتا اور اس کے کندھوں پر سوار ہو جاتا اور وہ تنگ آ کر کہتی: "کتنی دیر سے بیٹھی انتظار کر رہی ہوں کہ تو آئے تو مچھلی کھائے۔ صبح سے تیرے لئے پکا بیٹھی راہ تک رہی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کڑاہی کا ڈھکنا اٹھاتی۔ کڑاہی چھوٹی چھوٹی مچھلیوں سے بھری ہوتی۔ ایلی چھوٹی مچھلیا کھانے کا بہت شوق تھا۔ وہ کڑاہی اٹھا کر بھاگ جاتا اور دادی پھر اسے کوسنے لگتی اور چور چوری منہ پر پلہ لے کر مسکاتی 'بڑا شیطان ہو گیا ہے نکما کہیں کا۔

دادی اماں کے ساتھ ایلی کی پھوپھی زاد بہن سیدہ رہا کرتی تھی' جو ہر وقت دادی کے پاس بیٹھی رہتی اور دادی اماں کے کام کیا کرتی تھی۔ سیدہ کو دیکھ کر ایلی حیران ہوتا کہ وہ نوجوان ہونے کے باوجود دادی اماں کی طرح سر لٹکائے بیٹھی رہتی ہے۔ شادی ہو جانے کے باوجود اپنے میاں کے پاس کیوں نہیں رہتی او اس کی شکل اتنی غم

آلودکیوں ہے اور اس کے میاں کہاں رہتے ہیں اور وہ وہاں آتے کیوں نہیں؟

سیدہ کو دیکھ کر ایلی سوچ میں پڑ جاتا۔ لیکن اسے سیدہ سے یہ باتیں پوچھنے کی کبھی جرات نہ ہوتی تھی۔ ادھر اونچے چوبارے میں سیدہ کی بہن نیاز اپنے تینوں بچوں کے ساتھ رہتی۔ اس کی حالت سیدہ سے بھی بدتر تھی۔ یا تو وہ چپ چاپ پڑی رہتی اور یا اٹھتی تو نماز پڑھنے کھڑی ہو جاتی۔ محلے کی بہت سی عورتیں اسی طرح رہتی تھیں جیسے پیپ سے بھرے پھوڑے ہوں جیسے ان کے دل دکھتے دکھتے پھوڑے بن چکے ہوں۔ اس کی اپنی ماں تو ان سب سے مختلف تھی۔ وہ دن بھر بیسیوں کام کیا کرتی تھی۔ کبھی کپڑے سیتی کبھی گوٹا لگاتی۔ کبھی بچوں کے لئے گڑیا بنانے لگتی۔ کبھی کسی دولہا کے لئے عروسی پگڑی تیار کرتی اور ایلی کو پتنگ اڑا کر بھی تو وہی دیتی تھی۔ ایلی کو پتنگ اڑانا نہیں آتا تھا۔ ہاجرہ اسے خود پتنگ بنا کر دیا کرتی تھی۔ اس کی کتابوں پر خود ہی جلد چڑھایا کرتی تھی۔ ہاجرہ کو دنیا بھر کے سب کام کرنے آتے تھے۔ نہ جانے اس نے اتنے سارے کام کہاں سے سیکھ رکھے تھے۔

طوفانا

ابھی وہ محلے کی زندگی سے پورے طور پر محفوظ نہ ہونے پایا تھا کہ ایک روز علی احمد اور صفیہ آ گئے۔ دادی اماں انہیں دیکھ کر چلائی "علی احمد تو"۔ "ہاں" انہوں نے لا پرواہی سے کہا "یہ بیمار ہے۔" ہاجرہ نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ "اللہ خیر کرے۔ کون بیمار ہے کہیں صفیہ تو۔۔۔۔۔"

صفیہ کے آنے پر سارا محلہ ان کے گھر جمع ہو گیا۔

"اے کیا ہو صفیہ کو۔"

"کویں صفیہ کیا بات ہے۔ کون سی تکلیف ہو گئی تجھے؟"

صفیہ کا رنگ زرد ہو چکا تھا اور وہ پلنگ پر پڑی کھانستی رہتی تھی۔

"آرام آ جائے گا۔ تو خواہ مخواہ فکر کرتی ہے۔"

ایلی نے صفیہ کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ کی مہندی بالکل اڑ چکی تھی۔ انگوٹھیاں اور بھی میلی ہو گئی تھیں۔ مگر اس کا جسم ویسے کا ویسا ہی تھا۔ ماتھے پر شکن اسی طرح پڑی تھی۔ ایلی کو یقین نہ آتا تھا کہ وہ بیمار ہے۔ وہ اس کے قریب جاتے ہوئے ڈرتا تھا کہ کہیں ایک دم اس پر جھپٹ نہ پڑے۔ اگر وہ بیمار تھی تو اسکی تیوری کیوں چڑھی۔ بیمار تو گھورا نہیں کرتے۔ نہیں نہیں صفیہ بیمار نہیں اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا۔

اس کے باوجود صفیہ بیمار تھی اور لوگ روزانہ اس کی عیادت کے لئے ان کے گھر آیا کرتے تھے۔ وہ چپ چاپ چارپائی پر پڑی رہتی اور چھت کی طرف دیکھتی رہتی۔ "اے ہے تو کس فکر میں پڑی ہے۔ لڑکی!" محلہ والیاں اسے پیار سے گھورتیں۔ "انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ذرا پرہیز کا خیال رکھ اور بس۔!"

لیکن ان باتوں کے باوجود صفیہ کا چھت کو گھورنا نہ گیا۔ سارا دن وہ چھت کو گھورتی رہتی اور ہاجرہ اس کی چارپائی کے گرد یوں گھومتی رہتی۔ جیسے ہاجرہ شہنشاہ بابر ہو اور صفیہ اس کا بیمار بیٹا ہمایوں۔

پھر شام کے وقت جب گرمی بڑھ جاتی تو ہاجرہ صفیہ کو سہارا دیتی اور وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اسے کوٹھے پر لے جاتی تاکہ کھلی ہوا میں سو سکے۔ ایک رات جب وہ سب کوٹھے پر سو رہے تھے تو آندھی چلنے لگی۔ بوندا باندی ہونے لگی۔ ہاجرہ کا خیال تھا کہ جلد ہی آندھی ختم جائے گی اس لئے وہ صفیہ کو اٹھا کر برساتی میں لے گئی تاکہ اسے نیچے گرمی میں تکلیف نہ ہو۔ یہ آندھی ایک عام آندھی تھی۔ آندھیاں اکثر آیا کرتی تھیں۔ چند ایک منٹ کے لئے تیز ہوا چلتی بادل گرجتا چھینٹے پڑتے اور پھر مطلع صاف ہو جاتا۔ علی احمد سیدہ اور دادی اماں کے نیچے چلے جانے کے بعد وہ آندھی طوفانی صورت اختیار کر گئی۔ ہاجرہ گھبرا گئی۔ ہاجرہ کے لئے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کی مدد سے صفیہ کو نیچے لے جانا مشکل تھا۔ طوفان اور بھی تیز ہوتا گیا۔ ہوا مکانوں اور دکانوں سے ٹکرا ٹکرا کر یوں چیخنے لگی جیسے جنگل میں شیر دھاڑتا ہے۔ آسمان پر سیاہ

رنگ کی گھٹا چھا گئی۔ بجلی کی کڑک سے کان پھٹے جا رہے تھے۔ ایلی اور فرحت جاگ پڑے۔ وہ دونوں ڈر کر رونے لگے۔ ”اماں‘ اماں‘ اماں۔“ ادھر مریضہ کراہ رہی تھی۔ برساتی میں دو ہلے محراب تھے، جن پر پٹ نہیں لگے ہوئے تھے۔ ان محرابوں میں ہوا چنگھاڑ رہی تھی۔ ہاجرہ نے چلا چلا کر علی احمد‘ دادی اماں اور سیدہ کو آوازیں دیں، لیکن طوفان کی شدت کی وجہ سے اس کی آواز نچلی منزل تک نہ پہنچ سکی۔ طوفان کی شدت کے ساتھ مریضہ کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ ہاجرہ گھبراہٹ میں ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ مریضہ کراہ رہی تھی۔ بچے رو رہے تھے۔ ہوا سے محفوظ رکھنے کے لئے اس نے چارپائیاں مریضہ کے گرد کھڑی کر دیں اور ایلی اور فرحت سے کہا کہ انہیں تھامے رکھیں مگر ہوا کے جھونکوں نے چارپائیوں کو اٹھا کر پھینک دیا۔ دونوں بچے چارپائیوں کے ساتھ دیوار سے ٹکرائے۔ بچے ڈر کر چیخیں مارنے لگے۔ پھر دفعتاً ان کی نگاہ مریضہ پر جا پڑی۔ مریضہ دیوانوں کی طرح سر چلا رہی تھی۔ اس کا سر اور آنکھیں گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہل رہی تھیں۔ آنکھیں تھرائی جا رہی تھیں۔ دم اکھڑ رہا تھا۔ ہاجرہ گھبرا گئی۔ روتے ہوئے بچے سہم گئے باد و باراں کے اس طوفان کی نسبت وہ طوفان جو مریضہ کے سینے اور آنکھوں میں چلتا ہوا محسوس ہوتا تھا‘ کہیں زیادہ بھیانک تھا۔ ان کی توجہ بیرونی طوفان سے ہٹ کر صفیہ کی طرف مبذول ہو گئی۔

”میں جاتی ہوں۔ میں کسی کو بلاتی ہوں“ ہاجرہ گھبرا کر چلائی۔ صفیہ کا سر انکار میں اور بھی شدت سے ہلنے لگا۔ پھر ایک ساعت کے لئے صفیہ کا سر تھم گیا۔ اس کی آنکھوں کی وہ بھیانک مردنی کم ہو گئی۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ صفیہ نے ہاجرہ کا ہاتھ تھام لیا۔ میں میں نے تیری قادر نہ کی۔ اس کی نگاہ میں بے بسی کی ایک عجیب جھلک تھی۔ چند ساعت کے لئے اس نے اپنی نگاہیں ہاجرہ پر جمائے رکھیں پھر اس کی آنکھ سے ایک موٹا آنسو ڈھلک آیا اور رگال سے پھسل کر بالوں میں کھو گیا۔ پھر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور بازو گر کر لٹکنے لگا اور سر ہمیشہ کے لئے ساکت ہو گیا۔

''اماں'' ایلی نے چیخ ماری۔ ہاجرہ نے سر پیٹ لیا ''صفیہ' صفیہ۔''

ایک فقیر

طوفان تھم چکا تھا۔ نیچے بڑے کمرے میں پلنگ پر صفیہ کی لاش پڑی تھی اور اس کے گرد محلّہ والیاں بیٹھی باتوں میں مشغول تھیں۔ صفیہ کا جسم چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ لیکن اس کا جوڑا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ایلی نے دو ایک بار صفیہ کی طرف دیکھا' اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ موت کا بہانہ کرکے پڑی ہو۔ جیسے ابھی جاگ اٹھے گی۔ کہے گی ''ایلی بازار سے دودھ لا دو۔ ہاجرہ تو میری بیماری کا بہانہ کر کے آرام سے بیٹھی ہے۔ چل اٹھ برتن صاف کر چل اٹھ۔'' لاش میں جنبش ہوئی۔ ایلی کا دل ڈوب گیا۔ صفیہ کا جوڑا کھل کر لٹکنے لگا۔ محلّہ والوں نے باآواز بلند کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ ایلی چیخ مار کر بھاگا ''دادی اماں' دادی اماں۔'' دادی نے اسے تھام لیا۔ ''تو کیوں بیٹھا ہے۔ یہاں ادھر آ میں تجھے سلا دوں۔'' دادی اماں نے اسے بازو سے کھینچتے ہوئے کہا۔

صفیہ کی وفات پر ہاجرہ کئی دن تک روتی رہی۔ رہ رہ کر صفیہ کا وہ فقرہ یاد آتا تھا۔ ''میں نے تمہاری قدر نہ کی۔'' اس وقت اس کی آنکھوں میں فخر بھری چمک لہراتی اور گالوں پر آنسو بہنے لگتے۔ برسوں کی خدمت گزاری اور عشق کے بدلے اسے ایک فقرہ ملا تھا۔ ''میں نے تمہاری قدر نہ کی۔'' ہاجرہ اس فقرے کو تمغے کی طرح سینے پر لگائے پھرتی تھی۔ اس ایک فقرے کی وجہ سے برتری میں بدل گیا تھا۔ وہ اس ایک فقرے کی خاطر ایک بار پھر عمر بھر کسی خدمت گزاری میں بسر کر سکتی تھی۔

صفیہ کی موت سے علی احمد کے گھر کے روزمرہ میں کوئی خاص فرق نہ آیا۔ ایلی اسی طرح ارجمند سے انگریزی ماباؤں کی تفصیلات سمجھتا رہا اگرچہ عملی طور پر ان تفصیلات کا کوئی نتیجہ ظاہر نہ ہوا۔ کبھی کبھار کھڑکی کی درز سے وہ بھوری ڈکوری کے مختلف سائز دیکھتا رہا۔ محلے کے جوانوں کے ساتھ کرکٹ کے میدان میں جاتا رہا

جلیل اور رفیق کے ساتھ قاضی دروازے کے پاس اس تنگ گلی میں جھاڑو دینے والی شوخیوں کو بغور دیکھتا اور دادی اماں کے ساتھ لپٹ کر سوتا رہا۔

ہاجرہ اسی طرح دن بھا ورچی خانے میں برتن مانجھتی۔ کھانا پکاتی اور علی احمد کی چلمیں بھرتی رہی اور فرصت حسب معمول گھر کے کام کرنے کے علاوہ سہلیوں کے گھروں کے چکر لگاتی رہتی اور دادی اماں اسی طرح گھٹنوں میں سر دیئے چولہے کے پاس بیٹھی رہی اور ان کے پاس سیدہ خاموشی سے تنکوں سے زمین کریدتی رہی اور علی احمد وہی پھٹی ہوئی میلی دھوتی باندھے ڈیسک کے رجسٹر میں لکھتے رہے اور محلّہ کی چمگادڑیں رات کو احاطے پر چیخ چیخ کر منڈلاتی رہیں۔ بچے کھیلتے رہے۔ بوڑھیاں انہیں گھورتی رہیں اور محلے کے بوڑھے نماز ادا کرنے کے بعد کھانستے ہوں سر لٹکاء گھروں کے دروازے کھٹکھٹاتے رہے اور صفدر دادی اماں کی دیوار پر پھینکنے کے لئے منچھل پوٹاش کے پٹاخے تیار کرتے ہوئے گنگناتا رہا۔ ''حافظ خدا تمہارا۔ اے دلربا ہوں میں فدا۔''

سارہ صبورہ

پھر ایک دن علی احمد کے یہاں مہمان آ گئے۔

''ہاں یہی مکان تو ہے۔''

''تم آگے چلی جاؤ۔ گھبرانے کی کیا بات ہے۔ اے ہے تمہارا اپنا محلّہ ہے۔'' چاچی حاجاں کی آواز آئی۔

''کون آیا ہے۔ چاچی؟'' ماں جیواں بولی۔

''اپنے علی احمد کے مہمان آئے ہیں''

''کون مہمان آئے ہیں۔ چاچی کن کے گھر آئے ہیں؟''

''مہمان آئے ہیں۔'' دادی اماں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ''دیکھ تو لڑکی کون مہمان آئے ہیں۔ شام کوٹ سے تو نہیں آئے۔''

’’کون آیا ہے؟‘‘علی احمد قلم دیسک پر رکھتے ہوئے بولے اور پھر حسب عادت جلدی سے قمیض پہننے لگے۔ ہاجرہ باورچی خانے سے نکل کر چپ چاپ دروازے میں آکھڑی ہوئی اس کی آنکھیں ابھی سے پرنم ہو رہی تھیں کہ شاید مہمانوں کے آتے ہی صفیہ کی موت پر اظہار افسوس کرنا پڑے۔ شاید وہ آئے ہی اسی غرض سے ہوں۔ ایلی سہم کر کھڑا ہو گیا۔ فرحت اپنا دوپٹہ سنبھالنے لگی۔ سب سیڑھیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سیڑھیوں سے ہلکے ہلکے قہقہوں کی آواز سنائی دیں۔ کوئی ہنس رہی تھی۔ جیسے سکول کی لڑکیاں ہنستی ہیں۔ ایک کہہ رہی تھیں۔ ’’تم چلو آپا۔ چلو بھی نا۔‘‘ دوسری بولی ’’تو خواہ مخواہ جھجکتی ہے۔‘‘ پھر کوئی سریلی آواز میں ہنس پڑی جیسے گھنٹیاں بج رہی ہوں۔

’’اے ہے کون ہے؟‘‘ دادی اماں بولی۔ ’’آجاؤ نا اوپر۔‘‘

’’سلام کہتی ہوں۔‘‘ وہ دونوں دروازے میں آکھڑی ہوئیں۔ ’’فرحت کہاں ہے؟‘‘

’’ہائے۔‘‘ فرحت چلائی۔ ’’یہ تو سارہ صبورہ ہیں۔‘‘ اور بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔ ’’کون ہیں۔ دادی اماں؟‘‘ اخاطے سے عورتوں نے پوچھنا شروع کر دیا۔

’’کون آیا ہے؟‘‘

’’لڑکیاں ہیں۔‘‘ دادی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ ’’اپنی فرحت سے ملنے آئی ہیں۔‘‘

’’اپنی ہی بچیاں ہیں اللہ عمر دراز کرے۔‘‘

’’بڑی دور سے آئی ہیں۔ خیر سے۔‘‘

’’ہاں چاچی سہیلیاں جو ہوئیں۔‘‘

’’اچھا کیا جو ملنے آگئیں۔‘‘

’’کیا نام ہیں لڑکیوں کے؟‘‘

چند ا ایک ساعت میں محلّہ بھر میں یہ خبر پہنچ چکی تھی۔ جیسے تالاب میں پتھر پھینکتے ہی چھوٹی چھوٹی لہریں چاروں طرف پھیل جاتی ہیں۔

دیر تک محلے میں وہ لہریں ناچتی رہیں پھر سکون طاری ہوگیا۔ لیکن علی احمد کے گھر میں ایک دبا دبا طوفان ابھر رہا تھا۔ ادھر بڑے کمرے میں ہاجرہ ٗفرحت ٗ سارہ ٗصبورہ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ کمرے سے ہلکے لطیف قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ ایسے رنگین قہقہے جو محلے کے کسی گھر سے کبھی نہ دیئے تھے۔ باہر دادی اماں چولہے پر گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی اور ان کے پاس سیدہ سر ہاتھوں میں تھامے تیل سے بھری کڑاہی کو حسرت ناک نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اندر علی احمد قمیص پہنے بار بار چور نگاہوں سیجھانتے اور پھر حقے کے کش لینا شروع کر دیتے اور کھانستے۔ پھر وہ ایک دم اضطراب سے آواز دیتے۔ ’’ایلی کی ماں حقہ بھر دو۔‘‘ پھر قلم اٹھا کر لکھنے کی کوشش کرتے اور پھر کھانسنے لگتے۔ ’’ایلی کی ماں کون آئی ہیں؟ لڑکیاں ہیں۔ اچھا تو دوراہے سے آئی ہیں۔ دوراہے میں یہ لوگ رہتے کہاں ہیں؟ پھاٹک والے محلے میں۔ اچھا وہ جو سبز کھڑکیوں والا مکان تھا وہاں۔۔۔۔۔۔۔ ہوں تو اپنے قاضی اظہر حسین کی بیٹیاں ہیں۔ لو تم نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ وہ تو بالکل اپنے ہی ہیں۔ ہی ہی ہی۔ جب ہم دوراہے دورے پر جایا کرتے تھے تو قاضی اظہر ہی کے گھر رہا کرتے تھے۔ بڑے اچھے تعلقات تھے قاضی جی سے ہی ہی ہی ہی۔‘‘ ان کی باتوں کے دوران دادی اماں ان کی قمیض کو گھور گھور کر دیکھتی اور موہوم آئیں بھرتی۔ ایلی بھی ان کی قمیض کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کسی کے آنے پر وہ قمیص ضرور پہنا کرتے تھے۔ مگر جلد ہی مطمئن ہو کر اتار بھی دیتے تھے اور پھر اپنے کام میں لگ جایا کرتے تھے۔ لیکن نہ جانے سارہ صبورہ کے آنے پر انہوں نے قمیض اتاری کیوں نہ تھی۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ چلم اٹھائے خود باہر چولہے کی طرف آ رہے تھے۔ وہ تو چلم بھرنے کیلئے ایلی یا کسی اور کو آواز دیا کرتے تھے۔

"ہی ہی ہی۔" وہ ہنسنے لگے اور با آواز بلند بولے "اپنے قاضی اظہر کی بیٹیاں ہیں۔ایک مرتبہ ہم قاضی صاحب سے ملنے گئے۔ہی ہی ہی ہی۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کمرے کی طرف چل دیئے جس میں لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ قاضی صاحب بڑے تپاک سے ملے۔" وہ سبز کھڑکیوں والا مکان تھانہ پھاٹک محلے میں" وہ اندر گھس گئے۔" اچھا تو تم بڑی لڑکی ہو ان کی۔ہی ہی ہی۔سارہ ہو۔تم فرحت کی ہم جماعت ہو۔اور یہ صبورہ ہے۔ہی ہی ہی۔"

باہر چولہے کے پاس دادی اماں چمٹے سے زمین کرید رہی تھی اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔سیدہ کی آنکھوں میں چمک لہرا رہی تھی اور وہ حسرت ناک نگاہوں سے تیل کی کڑاہی کو گھورنے کی بجائے غور سے اس تنکے کا جائزہ لے رہی تھی جو چولہے کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔وہ آہستہ آہستہ کان سے دوپٹہ سرکائے جا رہی تھی۔

"ہی ہی ہی۔آؤ نا۔ادھر۔اس طرف۔اس کمرے میں، اچھا تو قاضی صاحب کا اب کیا حال ہے؟ ایلی بھئی بھاگ کر جا اور لے آ کچھ بوتلیں اور کچھ _______ادھر آؤ نا سارہ _____انہیں لے آؤ نا ایلی کی ماں _______ہی ہی ہی۔"

بہت ہی بھلے آدمی تھے ان کے ابا۔ہمارے دوست تھے۔ہی ہی ہی۔"

ہاجرہ مسکرا رہی تھی۔مگر اس کی مسکراہٹ میں بلا کا اضطراب تھا اور فرحت کے ماتھے پر بل پڑ رہے تھے۔علی احمد کی مسلسل ہی ہی ہی کی آواز آ رہی تھی۔دادی کا ہاتھ کانپے چلا رہا تھا اور رسیدہ کا کان بالکل ننگا ہو چکا تھا۔

شام کو ارجمند نے آواز _______ "آپا" ایلی چلایا۔لیکن نہ جانے کیوں ارجمند ایلی کا انتظار کرنے کے بجائے چپ چاپ اوپر آ گیا۔حالانکہ وہ عام طور پر ایلی کے گھر آنے سے گریز کیا کرتا تھا "دادی اماں سلام ایلی گھر ہے کیا؟" اس نے چور چوری دالان کی طرف دیکھا جہاں سارہ اور صبورہ بیٹھی تھیں اور پھر

دروازے سے باہر اس مقام پر کھڑا ہو گیا' جہاں دالان میں بیٹھی ہوئی لڑکیاں اسے اچھی طرح دیکھ سکتی تھیں۔ اس نے جیب سے ریشمیں رومال نکالا اور اسے گردن پر پھرنے لگا پھر وہ ایک انداز سے کھڑا ہو گیا۔ "بیٹھ جا۔" دادی اماں بولی "نہیں دادی اماں میں ٹھیک ہوں۔" ارجمند نے چوری چوری کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا اور پھر آواز نکالے بغیر کوئی شعر گنگنانے لگا۔ ایلی سامنے حیران کھڑا تھا۔ کیونکہ ارجمند جان بوجھ کر اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ کچھ دیر تو ایلی دیکھتا رہا پھر چپکے سے اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ اسے یوں قریب دیکھ کر ارجمند بولا "ایلی وہ کتاب تمہارے پاس ہے نا؟"

"کونسی کیسی کتاب؟" ایلی نے پوچھا۔

"بھئی وہی۔" وہ با آواز بلند بولا۔ "جو ماسٹر صاحب کل پڑھا رہے تھے کیا نام ہے اس کا۔" وہ پھر دبی آواز میں ایلی سے کہنے لگا۔ واہ وا کیا چیزیں ہیں۔ کیا بکوری ڈکوری ہیں۔ ہاں بھئی تو وہ کتاب ہے جس میں سے آج سوال کرنے ہیں۔" وہ پھر دادی اماں کو سنانے کے لئے چلایا۔ "بڑا والا نہیں چھوٹا والا ایڈیشن وہ گلابی گلابی سی۔" اس نے اندر دالان کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا چیز ہے واہ ______" ایلی کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ دادی اماں ارجمند کو گھور رہی تھی۔ اس کے ریشمیں رومال کو گھور رہی تھی۔ دفعتاً اس نے دادی اماں کی کڑی نگاہوں کو محسوس کیا۔ "اچھا وہ بولا" ذرا ہمارے گھر آؤ نا ایلی۔ وہ چھوٹی گلا گلابی۔ چھوٹا والا ایڈیشن۔ آؤ گے نا۔" اس نے اندر دالان کی طرف دیکھا۔ "میں انتظار کروں گا۔ ہائے کیا چیز ہے۔" اور وہ چلا گیا۔

ارجمند کے جانے کے بعد رفیق آ گیا اس کی نگاہیں یوں مطمئن تھیں' جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔ "پھوپھی کہاں ہے؟" اس نے زیر لب کہا "شاید ادھر ہو۔" وہ اپنے آپ ہی بولا اور دالان میں داخل ہو گیا۔ پھر وہ ٹھٹکا "اوہ۔ مجھے تو پتہ ہی نہ تھا۔" اس نے گویا

دیوار سے مخاطب ہو کر معذرت کی اور واپس جانے لگا۔ ''رفیق ہے۔'' ہاجرہ نے آواز دی۔ وہ رک گیا۔ ایک سرسری مگر بھگی نظر سارہ اور صبورہ پر ڈالی ایک ہلی سی آہ بھری۔ ''وہ کہا تھا نا پھوپھی جی نے سودا لانا ہے تو میں آ گیا۔ خیر خیر!'' اس کی آنکھوں میں گلابی چھینٹے اڑ رہے تھے۔

ہائے اللہ

ہی ہی ہی۔ اندر علی احمد ہنس رہے تھے۔ ''وہ بات بتانا تو میں بھول ہی گیا جب۔'' کہتے ہوئے چلم اٹھائے چلے آئے اور چولہے کے قریب جانے کی بجائے سیدھے دالان میں گھس گئے۔ ''ہی ہی ہی جب ہم سب قاضی صاحب کے مکان پر گئے تھے۔ ہی ہی ہی ادھر آؤ نا سارہ صبورہ تمہیں بات سنائیں۔ اس کمرے میں آؤ تم شرماتی کیوں ہو۔ یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔ ہی ہی ہی۔ قاضی صاحب کے گھر کو تو ہم اپنا ہی گھر سمجھا کرتے تھے۔ تم کیوں شرماتی ہو۔ آ جاؤ آ جاؤ''۔

وہ کھڑے ہنسے جا رہے تھے دادی اماں کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ سیدہ کا ڈوپٹہ کان سے گرتا جا رہا تھا۔

''بھئی فرحت یہ تمہارے کہنے کے بغیر نہیں آئیں گی۔ ٹھیک تو ہے۔ بھئی یہ آداب طور طریقہ کیسے چھوڑیں۔ جب تک میزبان خود نہ کہے کیسے آئیں اور بھئی فرحت تو ان کی میزبان ٹھہری۔ کیوں فرحت یہی بات ہے نا ہی ہی۔ آخر بڑے گھرانے کی لڑکیاں ہیں۔ بہت بڑا گھرانا ہے ان کا' کون نہیں جانتا ان کے گھرانے کو دور اہے میں۔ اچھا تو فرحت تم انہیں ساتھ لے آؤ۔ ادھر ہی ہی۔'' وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔

رات پڑ چکی تھی۔ لیکن ہاجرہ ابھی باورچی خانے میں بیٹھی انتظار کر رہی تھی کہ علی احمد کھانا کھالیں تو وہ فارغ ہو۔ صبورہ فرحت کے ساتھ گپیں مارنے میں مشغول تھی۔ دادی اماں جائے نماز پر بیٹھی تھی۔ سیدہ بستر میں لیٹی ہوئی تھی۔ ایلی دادی اماں کی

چارپائی پر اوندھا پڑا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ علی احمد اپنے کمرے میں سارہ کو وہ قصہ سنا رہے تھے' جب وہ قاضی صاحب سے پہلی مرتبہ ملے تھے۔

''ہی ہی ہی اور قاضی صاحب نت سمجھا۔ یہاں قریب ہو کر سنو نا۔ انہوں نے سمجھا کہ ہی ہی ہی اندھیرے میں نہ جانے کون ہے۔ ہی ہی ہی۔ ہاتھ چلانے شروع کر دیئے یوں۔ یوں ہی ہی ہی۔'' ہلکی سی باریک ہنسی کی آواز سنائی دی۔ ''ہی ہی ہی۔'' علی احمد بے تحاشا ہنسے چلے جا رہے تھے۔ ان کے کمرے میں نہ جانے کیا غدر مچ رہا تھا۔ جیسے واقعی قاضی صاحب پکڑ دھکڑ کر رہے ہوں۔ ہنسی کی ہلکی آواز آئی پھر بند ہو گئی۔ ''ہی ہی ہی۔'' بھاری آواز بھی بند ہو گئی۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر دفعتاً ہائے اللہ کی آواز آئی اور پھر علی احمد کے کمرے پر موت کی سی خاموشی چھا گئی۔

جائے نماز پر بیٹھے ہوئے دعا مانگتے مانگتے دادی اماں ہاتھ لرزے جیسے دفعتاً اسے تشنج کا عارضہ ہو گیا ہو پھر وہ دھپ سے سجدے میں گر گئی۔ سیدہ نے آہ بھر کر رضائی منہ پر لے لی۔ مشین پر کپڑا سیتے سیتے ہاجرہ کا ہاتھ کانپا اور دستہ مشین کی چرخی سے باہر نکل آیا اور ہاجرہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے صبورہ اور فرحت کی طرف دیکھنے لگی۔ فرحت نے ماں کی طرف دیکھا اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ لیکن صبورہ اسی طرح خوشی سے چلاتی رہی ہنستی رہی پھر دفعتاً اس نے محسوس کیا۔ جیسے کچھ ہو گیا ہو اور وہ خاموش ہو گئی۔

ایلی نے سر اٹھایا چاروں طرف گھبرا کر دیکھا۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ جیسے بہت کچھ ہو گیا تھا۔ اس کے دل پر ایک بوجھ سا پڑ گیا۔

کچھ بھی تو نہیں

چواؤں۔ ٹھک علی احمد کے کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ تمام گھر پر بھیانک سکوت طاری تھا۔ موت کا سکوت' موت! ایلی کانپ گیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے صفیہ آ گئی۔ جیسے وہ اس روز چارپائی پر پڑی دم توڑ رہی تھی۔ ایلی نے محسوس کیا کہ علی احمد کے ساتھ سارہ کمرے میں اسی طرح سر پٹک رہی تھی۔ ادھر سے ادھر۔ ادھر سے ادھر۔

آنکھیں پتھرائے جا رہی تھیں۔ ڈر کی وجہ سے اس کی چیخ نکل گئی۔ دادی اماں اچک کر اس کے پاس آ گئی۔ "کیا ہے دادی اماں" وہ زیر لب گنگنایا۔ "کچھ نہیں ایلی۔" دادی اماں نے کہا "کچھ بھی تو نہیں۔ سو جا تو۔" اور وہ اسے کانپتے ہوئے ہاتھ سے تھپکنے لگی۔

اگلے روز جب ایلی بیدار ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ گھر پر وہی بھیانک خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ اس صبح وہ تمام دنیا کے خلاف غصہ محسوس کر رہا تھا وہ کمرہ غلاظت سے بھرا تھا۔ وہ گھر وہ محلّہ وہ شہر سب گندگی سے بھرے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ محلے والے سبھی اندھے تھے۔ اندھے اور اپاہج۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ وہ گھر وہ محلّہ وہ شہر چھوڑ کر کہیں چلا جائے جہاں غلاظت نہ ہو جہاں گندگی نہ ہو جہاں بھیانک خاموشی نہ چھائی ہو۔ اس کی نگاہ دادی اماں پر جا پڑی جو چپ چاپ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔

اس نے پہلی مرتبہ دادی اماں پر غصہ محسوس کیا۔ کیا وہ گھٹنوں میں سر دینے اور سجدے کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکتی تھی۔ ویسے محلے کے لڑکوں کے خلاف تو اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی۔ جب صفدر اس کے مکان کی دیوار پر پٹاخہ چلاتا تو اس وقت وہ کیوں چیختی تھی۔ اے ہے مکان کی دیواریں ہل گئی ہیں" اب کیا مکان کی دیواریں نہیں ہل رہی تھیں۔ پھر وہ یوں چپ کیوں بیٹھی تھی اور فرحت کے پاس بیٹھی ہوئی وہ بھیگی بلی سارہ جھکی جھکی نگاہوں سے گھر والوں کو ٹٹول رہی تھی۔ اور صبورہ یوں چپ چاپ بیٹھی تھی جیسے کچھ کھو گیا ہو۔ ایلی نے پہلی مرتبہ سارہ کی طرف نگاہ بھر کر دیکھا۔ بھیگی بلی کیسی چور نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ اسے واضح طور پر معلوم نہ تھا کہ وہ اسے بری کیوں لگ رہی ہے۔ لیکن وہ اسے بری لگ رہی تھی۔

ادھر سے ابا کے حقے کی گڑ گڑاہٹ سن کر اس نے منہ بنایا۔ بڑے علی احمد بنے پھرتے ہیں۔ ہی ہی ہی۔ فضول دانت نکالتے رہنا۔ باہر دادی اماں بیٹھی بار بار

دالان کی طرف دیکھ کر آہیں بھر رہی تھی۔ اور سیدہ چپ چاپ بیٹھی آلو چھیل رہی تھی۔ ہاجرہ تو خیر برتن دھونے کے سوا کچھ کر ہی نہ سکتی تھی۔ ایلی دل ہی دل میں بل کھاتا رہا اگرچہ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کیوں بل کھا رہا ہے۔

پھر گھر میں یہ دستور ہو گیا علی احمد سارا دن اپنے کمرے میں بیٹھے رہتے۔ اگرچہ دن میں چار ایک مرتبہ خود حقہ کی چلم اٹھا کر دالان کی طرف چلے آتے حالانکہ انہوں نے کبھی خود چلم نہ بھری تھی اور پھر ہاجرہ کے کمرے میں جھانتے۔ ''ہی ہی کیا ہو رہا ہے۔ بھئی۔''

سارہ صبورہ ''گپیں چل رہی ہیں۔ خوب خوب۔ صبورہ کو گپیں بڑی پسند ہیں۔''

دن میں دو ایک بار ارجمند آ جاتا۔ ''ایلی ایلی بھئی وہ سوال چھٹی مشق کا پندرواں سوال وہ کیسے ہو گا۔ اپنی سے تو نہیں ہوتا۔ بھئی واہ آج تو صندلی پیراہن' زیب تن ہے۔ یہ آج معلوم ہوا کہ چاہ غب غب صندلی پیراہن پر کیا بہار دیتا ہے۔''

رفیق آ کر پوچھتا ''پھوپھی آج مچھلی بہت سستی بک رہی ہے' کیا خریدو گی؟'' اور چھپ چھپ کر اندر جھانتا آہیں بھرتا۔

رات پڑتی کو علی احمد آتے۔ ''ہی ہی ہی صبورہ سو گئی کیا ابھی نہیں سوئی ______ یہی عمر تو ہے گپیں ہانکنے کی ہی ہی ہی ہی اور سارہ۔ سارہ تو دیر تک جاگنے کی عادی ہے۔ کیوں سارا۔ اچھا بھئی''۔

یہ کہہ کر وہ باہر نکل آتے۔ اور پھر دالان سے آواز دیتے ''فرحت کی ماں صبورہ سو جائے تو مجھے آج کا حساب لکھوا دینا۔ اور۔ اور۔'' اور وہ عجیب انداز سے ہنسنے لگتے۔

اس پر ہاجرہ کہتی ''ہائے لڑکیو اتنی دیر ہو گئی ہے اب سو جاؤ'' اور فرحت فوراً لیٹ کر کہتی۔ ''بھئی ہم تو اب سوتے ہیں۔ نیند آ گئی۔ آؤ صبورہ تم بھی جاؤ'' اور زبردستی صبورہ کو لٹا لیتی اور پھر آنکھیں بند کر کے یوں پڑ جاتی جیسے نہ جانے کب کی سوئی ہوئی

ہو۔

سارہ چپ چاپ اپنی چارپائی پر چلی جاتی مگر وہ لیٹتی نہ تھی۔ ایک طرف چپ چاپ بیٹھ رہتی۔ اس پر ہاجرہ محسوس کرتی۔ جیسے کمرے میں گھٹن پھیل رہی ہو اور وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر کوئی بات چھیڑنے کی کوشش کرتی مگر سارہ چپ چاپ بیٹھی رہتی۔

پھر جب صبورہ سو جاتی تو علی احمد کی آواز آتی ''فرحت کی ماں۔ فرحت کی ماں آج کا حساب تو لکھوا دو آکر۔ صبورہ سو گئی ہے نا۔''

علی احمد کی آواز سن کر دادی اماں کا ورد بلنے لگتا اور وہ رکوع کے بغیر ہی سجدے میں گر جاتی۔ ادھر سارہ کنکھیوں سے ہاجرہ کی طرف دیکھتی۔ ہاجرہ اٹھ بیٹھتی اور سارہ چپ چاپ اس کے پیچھے چل پڑتی۔ جب وہ صحن سے گزرتیں تو سیدہ اپنا منہ رضائی میں لپیٹ لیتی۔ ایلی گھبرا کر اٹھ بیٹھتا لیکن دادی اماں نماز پڑھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اسے تھپکنے لگتی۔ پھر کچھ دیر کے بعد ہاجرہ ان کے کمرے میں جھانکتی۔ ''سو گیا؟'' ایلی کو جاگتے دیکھ کر گھبرا کر بات بدل لیتی اور ہاجرہ کے جانے کے بعد گھر پر ہنگامہ خیز سکوت چھا جاتا۔

پھر ایک رات صبورہ اور فرحت حسب معمول باتیں کرتے کرتے لیٹ گئی تھیں اور سارہ دوپٹہ اوڑھے یوں صبورہ کی چارپائی کے کونے پر بیٹھی تھی۔ جیسے اسے ابھی اٹھ کر کہیں جانا ہو اور ہاجرہ منتظر کھڑی تھی کہ کب آواز پڑے اور وہ سارہ کو راستہ دکھا کر اپنے فرض سے فارغ ہو جائے کہ دفعتاً علی احمد کی آواز سنائی دی۔ جیسے وہ بالکل بدلی ہوئی ہو۔ ''صبورہ جاگ رہی ہے۔'' انہوں نے سرال میں کہا۔

صبورہ! ہاجرہ کے ہونٹ ہلے۔ اس نے حیرت سے چھوٹی سی بچی کی طرف دیکھا۔ جس نے ابھی عنفوان شباب میں قدم رکھا ہی تھا۔

صبورہ کی آنکھیں یوں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ جیسے دفعتاً بینائی سے محروم ہو گئی ہوں۔

دادی اماں نے صبورہ کا نام سنا تو اس نے پہلی ہی رکعت میں سلام پھیر دیا۔

''کس نے بلایا ہے مجھے؟'' صبورہ اٹھ بیٹھی ''مجھے بلایا ہے مجھے؟ چچا نے بلایا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک لہرائی ''مجھے بلایا ہے۔ مجھے۔'' اور وہ شور مشاتی چلاتی ہوئی بولتی ''آتو رہی ہوں میں۔'' اور پھر آپ ہی آپ علی احمد کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ یہ دیکھ کر سارہ بیٹھی بیٹھی چارپائی پر ڈھیر ہو گئی۔ جیسے کوئی گٹھڑی گر کر اوندھی ہو گئی ہو اور فرحت نے منہ موڑ کر اوپر کمبل لے لیا اور ہاجرہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔

چراؤں ٹھک دروازہ بند ہو گیا۔ گھر پر سناٹا چھا گیا۔ ایلی نے دانت پیس کر رضائی پر گھونسہ مارا۔ اس روز دادی اماں اسے تھپکنا بھول گئی۔ اس نے یہ بھی نہ کہا ''سو جا ایلی۔ کچھ بھی نہیں کچھ بھی تو نہیں۔''

لو لیٹر

اگلے روز ایلی ارجمند یک گھر بیٹھا تھا اور ارجمند اسے سمجھا رہا تھا ''بڑی والی کو نہیں چھوٹی والی کو۔ وہ جو گلابی سی ہے۔'' ''اچھا'' ایلی نے سمجھے بغیر کچھ کہنے کی غرض سے کہا۔ ارجمند نے زیر لب کہا ''سب بڑی والیاں بیکار ہوتی ہیں۔ ان سے عشق نہیں ہو سکتا۔ اور اس لئے انہیں لو لیٹر نہیں لکھا جا سکتا اور اگر لکھو بھی تو بیکار ہے پوچھو کیوں؟ اس لئے کہ ان کا دل دھک دھک نہیں کر سکتا اور دھک دھک نہ کرے تو پھر عشق کیونکر ہو سکتا ہے۔ سمجھے کیا سمجھے۔ تو جان من لو لیٹر چھوٹی والی کو لکھا جائے ہکوری ڈکوری کو۔''

''ہاں۔'' ارجمند چلایا ''بالکل موزوں ہے عمر اس کی لو لیٹر کے لئے اور اگر ہم نے لو لیٹر نہ لکھا تو وہ خفا ہو جائے گی کہ لو لیٹر بھی نہ لکھا مجھے بڑے عاشق بنے پھرتے تھے اور اس کا دل دکھے گا۔ سمجھے۔''

لیکن ایلی گھبرا رہا تھا۔ ''اگر اس نے علی احمد سے کہہ دیا تو۔'' ''انہوں'' ارجمند

بولا" تم انہیں نہیں جانتے۔" ارجمند اسے سمجھانے لگا۔" انگر اینڈی ماباؤں لو لیٹر کے سہارے جیسی ہیں جب تک لو لیٹر نہ پڑھ لیں طبیعت کو چین نہیں پڑتا تازہ موصول نہ ہو تو پرانے پڑھ پڑھ کر وقت کاٹتی ہیں۔ ان کے ٹرنک لو لیٹروں سے بھرے ہوتے ہیں اور چاہے کوئی لکھ دے انہیں۔ پڑھتی ضرور ہیں اور پھر کیا مجال جو کسی کو بتائیں۔ انہوں بالکل نہیں بتاتیں۔"

"بالکل نہیں۔"

"تو پھر۔" ایلی نے پوچھا۔

"پھر کیا۔ پھر پھر ا اور ایک لو لیٹر۔" ارجمند بولا۔

"اچھا" ایلی نے تھوک نگلنے کی بے کار کوشش کی۔" کس چیز سے لکھیں۔ میں بتاؤں آنسوؤں سے لکھیں۔"

"مگر آنسو آئیں گے کہاں سے۔ ہم تو بھئی ہنسنے کے قائل ہیں۔ رونے کے نہیں۔ البتہ خون سے لکھنا آسان رہے گا۔"

"وہ کیسے؟"

"پن چبھو لیں گے کیا؟"

"تکلیف نہ ہو گی کیا؟"

"واہ اس میں کیا ہے۔ لیکن سوا یہ ہے لڑکیاں خون پسند نہیں کرتیں۔ اس لئے سیاہی سے لکھ دو۔"

"اچھا لیکن لکھیں کیا؟" ایلی نے پوچھا" یہ مسئلہ تو چٹکی بجانے میں حل ہو جائے گا ہاں۔" ارجمند نے کہا" یہ اتنے پریم شاستر پڑے ہیں۔ ان میں سے چن لو۔" ارجمند نے کشمیری بازار کی چھپی ہوئی چار روتی کتابوں کا ایلی کے سامنے ڈھیر لگا دیا۔

سارا دن وہ خط کا مضمون چھانٹتے رہے۔ آخر شام کے چار بجے قریب خط مکمل ہو

گیا۔ اس میں زیادہ تر شعر لکھے ہوئے تھے۔ "مائی ڈیئر لکھوں یا میری جان لکھوں یا دلربا لکھوں۔ اے جان من میں تم کو القاب کیا لکھوں۔" یہ شعر تو القاب کی حیثیت رکھتا تھا۔ نفس مضمون کا شعر یہ تھا "اس حسن ترے کی بیوٹی نے مرے جینٹل ہارٹ کو توڑ دیا۔ جب سے تم پر ہوا ہوں شیدا نائٹ سلیپنگ چھوڑ دیا۔" اس شعر کے چناؤ میں بڑی لے دے ہوئی تھی مگر ارجمند نے صاف اعلان کر دیا تھا کہ اگر یہ شعر نہ لکھا گیا تو لیٹر ادھورا رہ جائے گا۔ کیونکہ سکول کی لڑکیاں صرف انہی شعروں کو پسند کرتی ہیں۔ جن میں انگریزی کی چاشنی ہو ورنہ وہ اپنا لو لیٹر کسی سہیلی کو بھی نہیں دکھا سکتیں کہ وہ یہ نہ سمجھ لے کہ اسے کسی گنوار نے لو لیٹر لکھا ہے۔

ارجمند کی بات معقول تھی اور نہ بھی ہوتی تو بھی ایلی لکھنے پر مجبور تھا کیونکہ اسے تو لو لیٹر کے متعلق علم ہی نہ تھا۔ وہ نہ جانتا تھا کہ لو لیٹر لکھنے سے ہو گا کیا۔ شام تک لو لیٹر تو مکمل ہو گیا لیکن اسے صبورہ تک پہنچانا بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ ایلی کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس کی قمیض کی وہ جیب جلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جس میں اس نے لو لیٹر اس کی جیب میں ڈال دینا اور جیب میں نہ ڈال سکو تو اسے دور سے دکھانا۔ دیکھ کر وہ بے قرار ہو جائے گی اور خود ہی منت کر کے مانگ لے گی۔

دوسری تجویز تو ایلی کے لئے قطعی طور پر ناقابل قبول تھی دکھانا بڑی جرأت کا کام تھا۔ البتہ چوری چوری اس کی جیب میں رکھنا شاید ممکن ہو۔ لیکن وقت یہ تھی کہ اس کی قمیض میں جیب نہ تھی۔ عجیب قمیض پہنتی تھی۔ وہ اس نے پہلی مرتبہ دیکھا کہ اس کی قمیض شروع سے لے کر آخر تک انوکھی تھی۔ جا بجا چنٹیں پڑی ہوئی تھیں کہیں کھلی کہیں تنگ کہیں کچھ کہیں کچھ ایسی قمیض تو محلہ بھر میں کسی کی نہ تھی۔

پھر جب دونوں بہنیں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں تو دفعتاً اسے لو لیٹر کا خیال آیا اور پسینہ آ گیا۔ دل دھڑکنے لگا لیکن ہمت کر کے اس نے وہ رقعہ اس کے جوتے میں ڈال دیا۔ جلدی میں اسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ جوتا کس کا تھا۔ سارہ یا صبورا

کا۔

اگلے دن وہ علی احمد کے روبرو سر لٹکائے کھڑا تھا۔ "بول" وہ کہہ رہے تھے "سچ سچ بتادے۔" اور سارہ ان کے قریب کھڑی مسکرا رہی تھی "بتا وہ گرج رہے تھے "ہوں تو تمہیں نے شرارت کی ہے شرم نہیں آتی۔"

"شرم نہیں آتی شرم نہیں آتی"۔ چاروں طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔ غصے بھری آوازیں' اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ دیوانہ وار چلانے لگے۔ شرم نہیں آتی اور علی احمد کے سامنے تن کر کھڑا ہو جائے شرم نہیں آتی۔ ہی ہی ہی اور باہر نکل جائے اس مکان سے دور۔ اس شہر سے دور۔

"دفع ہو جاؤ ہماری نظروں سے دور ہو جاؤ" علی احمد گرجے اور ایلی چپ چاپ آ کر چارپائی پر پڑ گیا۔

تمام گھر میں چاروں طرف شور مچا ہوا تھا۔

ہی ہی ہی ہی۔ شرم نہیں آتی۔

قاضی صاحب تو سمجھ لو ہمارے بھائی تھے۔ ذرا قریب ہو جاؤ نا۔ شرم نہیں آتی۔

شرم نہیں آتی۔ شرم نہیں آتی۔ محلے کے کوے چلا رہے تھے۔

چراؤں' ٹھک علی احمد کا دروازہ بند ہوتے ہوئے کراہ رہا تھا شرم نہیں آتی۔

غصے میں بھنا کر ایلی نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ منہ سوجھا ہوا تھا۔ کنپٹیاں تھرک رہی تھیں۔ "شرم نہیں آتی" وہ بہ آواز بلند چلایا لیکن گھیس گھیس کے علاوہ اس کے منہ سے کچھ نہ نکل سکا۔ بے بسی اور لاچاری کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

بیداریاں

بام آباد

چھٹی ختم ہونے پر علی احمد کا تبادلہ بام آباد ہو گیا، لیکن علی احمد تن تنہا بام آباد جانے کے لیئے تیار نہ تھے۔

علی احمد تنہائی سے ڈرتے تھے شاید وہ اپنے آپ سے خائف تھے وہ کمرے میں اکیلے سو نہ سکتے تھے۔ اگر سوتے میں ان کے کمرے سے لوگ چپ چاپ نکل آتے تو جونہی آخری آدمی باہر نکلتا، وہ گھبرا کر جاگ اٹھتے۔ اسی وجہ سے ان کا کسی کمرے یا مکان میں اکیلے رہنا ممکن نہ تھا۔ تنہائی کے علاوہ خاموشی بھی ان پر گراں گزرتی تھی۔ رات کے وقت اگر ان کی آنکھ کھل جاتی تو وہ اس چھائی ہوئی خاموشی سے ڈر کر اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتے تا کہ اپنی آواز کا سہارا لیں یا وہ اپنی بیوی کو پکارتے اور یا حقہ بھر کر اس کی گڑگڑ سے تسکین حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔

لہٰذا بام آباد تنہا جانا کیسے ممکن تھا ایلی کی ماں ان کے ساتھ جانے کی خواہشمند نہ تھی وہ جانتی تھی کہ اسے ساتھ لے جانے سے علی احمد کا مقصد صرف یہی تھا کہ اپنا کمرہ آباد رکھنے کے لئے گھر میں ایک عورت کی موجودگی کا بہانہ قائم ہے۔

اس روز علی احمد دادی اماں کے پاس چپ چاپ بیٹھے تھے۔ دادی اماں کہہ رہی تھیں "اے ہے۔ لڑکی اگر تو ساتھ چلی جائے تو کم از کم علی احمد کو روٹی کی تکلیف تو نہ ہو گی۔" اور دروازے سے لگی ہوئی ہاجرہ رو رہی تھی۔ اس کے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

"اللہ رکھے تیرے بال بچے ہیں تو ہی تو اس گھر کی مالکہ ہے تو ساتھ جائے گی تو ہی گھر بسے گا نا۔"

"نہ میں نہیں بنتی مالکہ اس گھر کی"۔ ہاجرہ نے ہچکی لے کر کہا۔ "بہت چاکری کر دیکھی ہے۔"

دادی بولی۔ "آخر تو نہ جائے گی تو گزارہ کیسے ہوگا۔" "ہاجرہ نے کہا۔میرے بغیر انہیں کسی چیز کی کمی ہے کیا۔"

"چل چھوڑ اب" دادی اماں بولی۔

پھر نہ جانے کیسے چند ہی منٹوں میں محلہ والیاں آ پہنچیں جیسے انہوں نے پہلے ہی سے پروگرام بنا رکھا ہو۔

"اے ہے کیوں نہ جائے گی تو" چاچی حاجاں ہاتھ چلا کر بولی "اللہ عمر دراز کرے تیرے بچوں کی تو نہ جائے گی اپنے گھر تو ہوگا کیا۔"

"تو ان آنے جانے والیوں کی پروا کرتی ہے آتی ہیں تو آجائیں۔ آئیں گی اور چلی جائیں گی۔ ان کل موہنیوں کا کیا ہے جی۔ گھر تو تیرا ہی ہے نا۔ اپنے لئے نہیں تو ان بچوں کے لئے تجھے ضرور جانا چاہیے۔

محلے کی بوڑھیاں ہاجرہ کے گرد چیلوں کی طرح منڈلانے لگیں۔ ان کی چیخیں سن کر ایلی نے محسوس کیا کہ بام پور کا طوفان آیا ہی چاہتا ہے۔ پہلے تو ہاجرہ نے جلی کٹی سنانے کی کوشش کی پھر اس نے ہچکیوں سے احتجاج کیا اور بالآخر خاموش ہوگئی اور اس کی خاموشی پر ایک ہنگامہ بپا ہوگیا۔

"ہاجرہ جائے گی' ہاجرہ جائے گی۔"

"اے ہے کیوں نہ جائے اپنے گھر۔"

"ہی ہی ہی۔" علی احمد ہنسنے لگے "تو سامان باندھ دو نا اسکا۔" اور سامان باندھا جانے لگا اور دو روز میں وہ سب بام آباد جا پہنچے۔

بام آباد ایک نیا شہر تھا۔ لیکن جب ایلی نے اسے دیکھا تو اس میں کوئی ایسا نیا پن دکھائی نہ دیا۔ ایلی کا خیال تھا کہ نیا شہر بھی ویسا ہی ہوگا جیسے نیا گھر ہوتا ہے لیکن اسے پہلی بار معلوم ہوا کہ نیا شہر نئے گھر سے قطعی طور پر مختلف ہوتا ہے۔

بام آبا ایک ویرانہ تھا' وسیع ویرانہ۔ اس کی سڑکیں بے تحاشہ چوڑی تھیں کہ سڑک

پار کرنا مشکل ہو جاتا۔ پختہ سڑکیں تو درحقیقت بہت چھوٹی تھیں مگر ان کے اردگرد بہت ساری زمین خالی پڑی ہوئی تھی۔ بازاروں کے دونوں طرف دکانوں کی جگہ جھونپڑیاں بنی تھیں۔ جن میں عجیب سی دکانیں لگی ہوئی تھیں۔ سڑک کے درمیان دو چوک آتے تھے۔ وہ چوک اتنے وسیع تھے کہ ایک طرف سے دوسری طرف چلتے چلتے ایلچی تھک جایا کرتا۔ علی پور کا آصفی محلّہ اس ایک چوک میں سما سکتا تھا۔ سڑک ختم ہوتے ہی ویرانہ شروع ہو جاتا پھر ہسپتال کی عمارت آتی جس پر ہر وقت موت کا سا سکوت طاری رہتا۔ دائیں طرف ہائی سکول کی عمارت تھی۔ ایک بہت بڑی پختہ اور خوبصورت عمارت شکل وصورت میں وہ انگریزی کے حرو ای (E) سے ملتی تھی۔ بڑی عمارے سے ہٹ کر کچے کمروں کی ایک لمبی قطار تھی اور اس سے مغرب کی طرف ایک مربع بلڈنگ تھی جس کے سامنے بہت بڑا پھاٹک لگا ہوا تھا۔ یہ سول کا بورڈنگ ہاؤس تھا۔

سکول کے اردگرد وسیع میدان تھے۔ جن میں ریت اڑتی تھی۔ ریت میں کہیں کہیں جھاڑیاں اگر ہوئی تھیں۔ سکول سے پرے یہاں وہاں کھجور کے درخت لگے ہوتے تھے اور سڑک پر اونٹوں کے قافلے آتے جاتے رہتے تھے۔

سکول سے بہت دور شہر کے دوسرے سرے پر علی احمد کا مکان ایک گلی میں واقع تھا۔ اس مکان میں چار کمرے تھے۔ ایک بہت بڑا صحن جس میں ایک کونے پر خاردار درخت لگا تھا۔ مکان کے ایک طرف کئی ایک غریب کنبے آباد تھے۔ وہیں ایک کوٹھڑی میں مائی رفیقاں اور اس کا بیٹا گاماں رہتے تھے۔ دوسری طرف ایک گھوڑا ڈاکٹر رہتے تھے جن کا رنگ بے حد کالا تھا مگر جن کی پیشانی محراب دار تھی۔ ڈاکٹر کا بیٹا فرید بھرپور جوان تھا۔ اس کا منہ کتنا چوڑا تھا اور اس کا جسم کس قدر پھیلا پھیلا سا تھا۔ ڈاکٹر کے گھر میں دو جوان لڑکیاں تھیں۔ زاہد اور عابدہ' جو ہر وقت نمازیں پڑھنے میں لگی رہتی تھیں۔ ان کی آنکھیں موٹی موٹی تھیں۔ لیکن وہ اس قدر

کالی کیوں تھیں۔ ان کی آوازیں یوں سنائی دیتی تھیں جیسے گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ وہ دوں فرحت کی سہیلیاں بن گئیں۔ اس بات پر ایلی کو بڑا غصہ آیا اسے فرحت کی سہیلیوں سے بے حد چڑ ہوگئی تھی۔ فرحت کی سہیلیوں کا خیال آتے ہی اس کی نگاہوں تلے سارہ اور صبورہ آجاتیں اور پھر آواز آتی "سارہ سوگئی ہے کیا۔" اور پھر چراؤں ٹھک دروازہ بند ہوجاتا۔ "ہونہہ سہیلیاں۔!" ایلی کے دل میں غصے کی ایک لہر اٹھتی اور وہ ہوا میں ایک گھونسہ چلا دیتا۔

زاہدہ اور عابدہ نے صحن کی درمیانی دیوار سے ایک اینٹ نکال رکھی تھی تاکہ آپس میں باتیں کرسکیں اور علی احمد آتے جاتے وزدیدہ اور حسرت بھر نگاہوں سے اس سوراخ کی طرف دیکھا کرتے اور ہاجرہ علی احمد کی نگاہوں کو دیکھ کر اپنا سینہ تھام لیا کرتی ہائے اللہ اب کیا ہوگا اور ایلی محسوس کرتا کہ اب وہ سوراخ بڑا ہوجائے گا۔ بڑھتے بڑھتے دروازہ بن جائے اور پھر ایک دن آواز آئے گی۔ زاہد سوگئی کیا اور عابدہ چپکے سے دروازے سے نکل کر گھر میں آجائے گی اور پھر علی احمد کے کمرے میں گھس جائے گی۔ پھر دروازی بند ہوجائے گا اور پھر۔ پھر۔ لیکن غصے سے اس کا منہ اس قدر سرخ ہوجاتا کہ "پھر" متعلق اسے کوئی دلچسپی نہ رہتی۔

رفیقاں

بام آباد میں سب سے پہلی عورت جوان کے گھر آئی رفیقاں تھی۔ "بی بی کوئی کم ہو وے تاں ڈسونا" اس کے انداز میں بے بسی جھلک نمایاں تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں ایلی نے محسوس کیا کہ اس کی جھکی جھکی آنکھیں نہ دیکھنے والی نظر آنے کے باوجود دیکھتی تھیں۔

ہاجرہ پہلے ہی روز رفیقاں کی دکھ بھری کہانی سن رہی تھی اور اس کا پلو بھیگا ہوا تھا۔ ایلی نے ایک نظر دونوں کو دیکھا اور پھر غصے سے بے تاب ہوکر باہر چلا گیا۔

رفیقاں روز ان کے یہاں آنے لگی۔ اس کے ساتھ اس کا چھوٹا بیٹا گاماں بھی ہوتا

تھا۔ وہ آکر گھر کے کام کاج میں ہاجرہ کا ہاتھ بٹاتی اور اس روزن میں علی احمد خلاف معمول خود چلم اٹھائے باورچی خانے میں آجایا کرتے۔

"اوہ۔ رفیقاں ہے۔ کیا حال ہے رفیقاں اچھی تو ہے۔ بڑی دیر کے بعد دیکھا ہے تجھے۔" اور رفیقاں مسکراہٹ بھینچنے کی کوشش کرتی اور نظریں جھکا لیتی اور علی احمد اپنے آپ باتیں کرتے کرتے تھک جاتے اور پھر اپنے کمرے میں چلے جاتے اور وہاں پہنچ کر آواز دیتے "رفیقاں ذرا آنا تو۔" اس پر ہاجرہ کی تیوری چڑھ جاتی اور رفیقاں مسکرا کر سر جھکا لیتی جیسے وہ سب سمجھتی ہو اور چپ چاپ بیٹھی کام کیے جاتی۔

لیکن ایلی کو محسوس ہوتا جیسے اس کی خاموشی میں ہاں کی جھلک ہو جیسے اس کا جی چاہتا ہو کہ اٹھ کر علی احمد کے کمرے میں چلی جائے اور پوچھ آپ نے بلایا ہے جی لیکن وہ بیٹھے رہنے پر مجبور تھی۔ بی بی کیا کہے گی اور بی بی بات بات پر کچھ نہ کچھ کہا کرتی تھی آواز پڑنے پر وہ زیر لب کہتی "اونہوں۔ ان تلوں میں تیل نہیں رفیقاں ایسی نہیں۔ سب عورتیں ایک سی نہیں ہوتیں کہ بلاوے کے منتظر ہوں۔" یہ سن کر رفیقاں مسکرائے جاتی اور ایلی مبہم طور پر محسوس کرتا۔ جیسے رفیقاں کا جی کچھ اور چاہتا ہے اور وہ کچھ اور کر رہی اور ایلی کی نگاہ میں رفیقاں کی مسکراہٹ دودھاری چھری کی طرح محسوس ہوتی تھی اور وہ رفیقاں سے نفرت کرتا اور یہ نفرت روز بروز شدید تر ہوتی جاتی تھی۔

لیکن ہاجرہ رفیقاں کے گن گاتی تھی۔ بات بات پر رفیقاں کی تعریف' رفیقاں کی شرافت اور نیکی کی گھر میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ شاید اسی دھوم کی وجہ سے رفیقاں قطعی طور پر مجبور ہو گئی تھی کہ علی احمد کی آواز سننے کے باوجود چپ چاپ بیٹھی رہے۔ اس کے باوجود جب وہ علی احمد کے کمرے کے دروازے کے قریب سے گزرتی تو اس کی گردن تن جاتی۔ گھگھرا یوں کھلتا اور بند ہوتا کہ عجیب سے دائرے بنتے چلے جاتے اور ایلی محسوس کرتا جیسے اس کا جی چاہتا ہو کہ رک جائے اور چوری چوری مسکرانے کی

بجائے قہقہہ مار کر ہنس دے کیوں بلایا ہے مجھے۔ کس نے بلایا ہے مجھے' مگر وہ چلے جاتی چلے جاتی۔ ایلی سمجھتا تھا کہ ہاجرہ کی توقعات نے اس کا وہاں رکنا ناممکن کر دیا اور ہاجرہ کے ان محبت بھرے جذبات سے جو اس نے رفیقاں سے وابستہ کر رکھے تھے۔ صفیہ کی بو آئی تھی اور ایلی کو محسوس ہوتا تھا جیسے رفیقاں صفیہ کی جانشیں ہو۔ ایلی کو اس بات پر اور بھی غصہ آتا تھا۔

علی احمد کا گھر ایک عجیب گھر تھا۔ اس میں دو طاقتیں برسرِ پیکار تھیں۔ علی احمد اور ہاجرہ ہر نو وارد کو دیکھ کر دونوں طاقتیں اسے اپنی اپنی طرف کھینچتیں۔ علی احمد کے دروازے سے قہقہوں کی آواز سنائی دیتی اور باورچی خانے سے دبی دبی آہوں کی۔ وہ کمرہ اور باورچی خانہ دونوں ہی مظلوم تھے۔ کمرہ ہی ہی کرنے پر مجبور تھا اور باورچی خانہ آہیں بھرنے پر۔ فطرت ان دونوں کی مجبوریوں پر مسکراتی تھی۔ جیسے وہ ان دونوں کے راز سے واقف ہو اور ان دونوں کی کشمکش سے دور ایلی اور فرحت ایک دیوانے میں اکیلے زندگی کے دن کاٹ رہے تھے۔ تن تنہا۔

ہر نو وارد کے پاؤں کے آہٹ سن کر دونوں بھائی بہنوں کے کان کھڑے ہو جاتے۔ اب کیا ہو گا۔ وہ اشتیاق بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگتے۔ نو وارد کمرے اور باورچی خانے کے درمیان لٹک جاتی اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے۔ بالآخر یا تو وہ باورچی خانے میں جا پہنچتی اور یا علی احمد کے کمرے میں رک جاتی اور پھر مکان سے یا تو قہقہوں کی گونج سنائی دیتی اور یا آہوں کی۔ ہر صورت میں مکان پر ایک اداسی چھا جاتی۔ جس میں دبی دبی چیخوں کی گھٹی گھٹی آوازیں سنائی دیتیں اور ایلی ڈر کر چلاتا آپا اداسی کیوں ہے۔ اور فرحت آہ بھر کر کہتی "اب تو سوئے گا بھی کہ نہیں۔"

صفیہ کی موت کے بعد بھی گھر میں ہاجرہ کی حیثیت ایک نوکرانی سی تھی۔ وہ دن بھر باورچی خانے میں برتن مانجھتی۔ آہیں بھرتی اور آنے جانے والیوں کے پاس بیٹھ کر

آنسو بہاتی رہتی ''ایلی کی ماں'' کمرے سے آواز آتی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھتی ''جی۔ آئی۔'' اور پھر دروازے کے باہر چوکھٹ سے لگ کر پوچھتی۔ ''جی کیا ہے؟'' جیسے کوئی فقیر بھیک مانگنے کے لئے کھڑا ہو۔ ہاجرہ فطراً اور ازلی طور پر بھکارن تھی۔ ڈر، خوف ہراس اور احساس کمتری اس کی گھٹی میں پڑے تھے جو اس نے وراثت میں ایلی کو بخش دیئے تھے۔

بند کمرا

پھر علی احمد کے دفتر میں کلرکوں کی بھرتی کے لئے امتحانات شروع ہو گئے اور علی احمد کے گھر میں سفارشات کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ وہ پہلا موقعہ تھا جب کہ ایلی کو احساس ہوا کے امتحانات اس قسم کے نتائج بھی پیدا کر سکتے ہیں۔

ڈیوڑھی میں غریب سائلوں کی منتیں سنائی دیتیں اور پھر کھجوروں سے بھری ہوئی ٹوکری اندر آجاتی اور پھر علی احمد کو خود باہر جا کر ٹوکری بھیجنے والے کو ڈانٹنا پڑتا۔ پھر مزید منتوں کی آوازیں بلند ہوتیں اور پھر ٹوکری دوبارہ گھر میں آ پہنچتی۔

ان دنوں سفارشوں کا تانتا بندھا تھا۔ شاید اس لئے کہ بام پور غریبوں کا شہر تھا۔ یا شاید اس لئے کے علی احمد کے ٹین کے سپاہی کے متعلق لوگ جان چکے تھے۔

علی احمد اپنے کمرے سے باہر سائلوں کی طرف دیکھتے اور پھر یوں کام میں لگ جاتے۔ جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔ ادھر ہاجرہ ان سمانوں کو منہ نہ لگاتی اور بات کئے بغیر اپنے کام میں مشغول رہتی۔ پھر ایلی چوری چوری جھانکتا اس کی توجہ لوگوں کی نسبت اس ٹوکری پر پڑتی۔ جو ان کے ساتھ ہوتی۔ علی احمد کی توجہ ٹوکری کے بجائے اس شخص پر پڑتی جو سفارش کے لئے آتا تھا۔ چار ایک بار دیکھنے اور جانچنے کے بعد وہ باہر نکلتے اور غصے میں چلاتے ''ہاں بھئی کیا کام ہے۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں قطعی طور پر مجبور ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اندر چلے جاتے اور از سر نو کام میں مشغول ہو جاتے۔

اکثر سفارش براہ راست علی احمد کے کمرے میں جا پہنچنا اور ابتدائی جھاڑ جھپاڑ

کے بعد ہی ہی ہی ان کا قہقہہ گونجتا اور ایلی کو معلوم ہو جاتا کہ ٹین کا سپاہی بیدا ہو چکا ہے اور ابھی وہ رزم گاہ میں اتر آئے گا اور پھر ________ گھر پر موت کا سناٹا چھا جائے گا اور اس سناٹے میں رنگین مگر دبی دبی ہنسی کی آواز بھرے گی۔ پھر دفعتاً سب ٹھیک ہو جائے گا اور نتائج خوشگوار ہوں گے۔ جیسے دکھی شہزادی کی کہانی میں مشکلات لڑائیوں اور امتحانات کے بعد سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد سب ہمیشہ خوش و خرم رہتے ہیں۔

اس سے پہلے ایلی کو مبہم سا احساس تھا کہ سب قصور علی احمد کا ہے اور وہ سوچا کرتا نہ جانے وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ کیوں دروازہ کھلتا ہے اور پھر بند ہو جاتا ہے۔ کیوں ٹین کا سپاہی ہنس ہنس کر لڑتا ہے اگرا سے خوب معلوم تھا کہ علی احمد کمرے میں جو کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ جسے قہقہوں اور بھیانک سناٹے سے تعلق ہے۔ گناہ ہے لیکن اسے یہ معلوم نہ تھا کہ وہاں ہوتا کیا ہے۔ بلکہ اس کے دل میں دبی دبی آرزو تھی کہ کبھی وہ اتفاقاً وہاں چلا جائے اور اتفاقاً اس کی نظر پڑ جائے اور پھر اسے غصہ آنا شروع ہو جاتا نہ جانے اپنی بے بسی پر یا اس عمل پر جو اس کے خیال میں وہاں ظہور پذیر ہوتا تھا۔

اب ایلی کو مبہم سا احساس ہونے لگا کہ علی احمد بیچار مجبور تھے ان کی نگاہوں سے ان کی مجبوری واضح ہوتی تھی۔ ان کی ہی ہی ہی میں ان کی مجبوری صاف سنائی دیتی تھی۔ وہ کیوں اور کیسے مجبور تھے اسے معلوم نہ ہوا۔ بہر حال وہ مجبور تھے۔ قصور ان کا تھا جو اپنے عزیزوں کو ساتھ لاتی تھیں۔

کو را اور آسا

کور بھی پہلی مرتبہ بھائی کی سفارش کرنے آئی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی ماں تھی۔ خود آسا تھا جسے دفتر میں کلرک بننے کا بے حد شوق تھا تینوں کا قافلہ چپ چاپ اندر آ گھسا۔ آگے آگے ماں تھی۔ درمیاں میں کور تھی اور پیچھے آسا۔ ماں کے کپڑے میل

سے بھرے ہوئے تھے اس کا جسم لٹا ہوا تھا۔ نگاہ حرص آلود تھی۔ اسے دیکھ کر انتہائی غلاظت کا احساس ہوتا تھا۔ کور سیاہ فام گوشت تھا۔ کور سیاہ فام گوشت کا ایک گول مٹول لوتھڑا تھی۔ جس پر بھڑ کیلے کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ جو اس لوتھڑے کو اور بھی بدنما بنا رہے تھے۔ اس کا قد ٹھنگنا تھا۔ سر چھوٹا اور گول جس میں چوٹی چھوٹی آنکھیں رینگتیں اور سفید دانت رضامندی کی چمک سے روشن تھے۔

آسا ایک اونچا لمبا لڑکا تھا۔ اس کا چہرہ ذہنی چمک سے کورا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حماقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور اس کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کور کے پیچھے پیچھے چلنے کی عادی ہے۔

یہ قافلہ چپکے سے مکان میں داخل ہوا اور علی احمد کے متعلق ابتدائی معلومات حاصل کرنے کے بعد باہر صحن میں اس مقام پر خیمہ زن ہو گیا۔ جہاں سے اندر کام میں منہمک علی احمد پورے طور پر دکھائی دیتے تھے۔ علی احمد نے باہر دیکھا۔ کور کے دانت چمکے۔ انہوں نے جلدی ہی سر جھکا کر لکھنا شروع کر دیا۔ کور اپنے گھگھرے اور چولی کو ٹھیک کر کے علی احمد کی طرف منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔ بڑھیا نے اس کی طرف پیٹھ کر لی۔ آسا آسمان کی طرف اڑتی ہوئی چیلوں کا بغور معائنہ کرنے لگا۔ کور کے دانت پھر چمکے اس نے ایک بھرپور انگڑائی لی۔ علی احمد کے ہاتھ سے قلم چھوٹ کر رجسٹر پر جا گرا۔ ”کون ہے؟“ وہ بولے۔ جواب میں دانت چمکے اور بغیر کسی تمہید کے کور اٹھ کر علی احمد کے کمرے میں جا داخل ہوئی۔ اس پر بوڑھیا اس خاردار درخت کو دیکھنے میں مصروف ہو گئی۔ جو صحن میں پھیلا ہوا تھا اور آسا تنکے سے زمین پر بیل بوٹے بنانے لگا۔

اس روز علی احمد کے کمرے سے ٹین کے سپاہی کی ہی ہی ہی سنائی دینے کی بجائے ربڑ کی گڑیا کی چیں چیں سنائی دے رہی تھی۔ اور ایلی حیران تھا اور فرحت یوں خلا میں گھور رہی تھی جیسے کچھ بھی نہ ہو۔

دفعتاً دروازہ کھلا اور ہنستی ہوئی نکل۔ ''ماں۔ ماں آسا فیل تو نہیں۔ آسا تو پاس ہے۔ نہ جانے کس نے اس سے کہہ دیا ہے کہ تو فیل ہے خواہ مخواہ تو پاس ہے۔ میں نے خود نتیجہ دیکھا ہے۔ تو نے کہا نہیں تھا۔'' اس نے آسا کو مخاطب کر کے کہا۔

''یہ تو پاگل ہے۔'' آسا کی ماں بولی۔

آسا پاگلوں کی طرح ہنسا اور پھر خاموش ہو گیا کور کے دانت چمکے علی احمد سر کھجانے لگے۔ ''آؤں گی۔ ضرور آؤں گی۔ بابو جی۔'' وہ بولی ''چل ماں'' اور مڑ مڑ کر دانت چمکاتی ہوئی سیاہ گھگھرے کو ٹانگوں پر لپیٹی ہوئی چل پڑی۔ اب آسا سب سے آگے تھا پیچھے اس کی ماں اور سب سے پیچھے کور تھی۔

انہیں جاتے دیکھ کر ایلی باہر نکلا۔ مضطربانہ گھر میں گھومنے لگا۔ باورچی خانے میں داخل ہوا تو دفعتاً سرگوشیوں کی آوازیں بند ہو گئیں۔ ہاجرہ چولہے کے پاس بیٹھی تھی۔ اس سے ذرا پرے رفیقاں گھگھرے پر بوٹیاں بنا رہی تھی۔

ظاہر تھا کہ وہ دونوں کور کے متعلق باتیں کر رہی تھیں۔ لیکن کیوں ایلی کے آنے پر وہ دفعتاً چپ کیوں ہو جایا کرتی تھیں۔ یوں سر سے سر جوڑ کر دبی دبی آواز میں پہروں باتیں کرتے رہنا اور رفیقاں کے ہونٹوں پر وہ دبی دبی مسکراہٹ جیسے وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہو جیسے وہ ہاجرہ کو فریب دے رہی ہو۔ اماں اسے اس قدر اچھا کیوں سمجھتی تھیں اور وہ چلتے وقت جان بوجھ کر اس طرح قدم کیوں اٹھاتی تھی کہ اس کے گھگھرے میں دائرے پڑیں اور علی احمد کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کی گردمورنی کی طرح تن کیوں جاتی تھی۔ ایلی کو ان سب باتوں کی وجہ سے رفیقاں سے نفرت تھی۔

شدید نفرت ایسی نفرت جو اسے کور سے بھی نہ تھی۔

نوکرانی کے ہاں بچہ

چند ہی دنوں ان کے یہاں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک روز وہ گلی میں کھیلنے کے بعد

جب گھر میں داخل ہوا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو فرحت نے اسے روک دیا۔

"اونہوں اندر نہ جانا"

وہ اس بات پر حیران رہ گیا "کیوں اندر کیا ہے"

"اماں بیمار ہیں۔" فرحت نے کہا۔

"تو کیا ہوا" ایلی نے کہا۔ وہ تو ان کا اپنا کمرہ تھا۔ علی احمد کا کمرہ تو نہ تھا جس میں جانے سے ہمیشہ گھبرایا کرتا تھا اور داخل ہونے سے پہلے ان جانے میں کھانستا اور پھر نگاہیں جھکا کر داخل ہوتا جیسے کوئی جرم یا گناہ ہو مگر یہ تو ان کا اپنا کمرہ تھا۔ پھر فرحت کا اسے روکنے سے کیا مطلب تھا۔ اگر اماں بیمار تھیں تو کیا تھا۔ بیماری کی وجہ سے کمرے میں جانے کی ممانعت تو نہیں ہو سکتی۔ اماں دفعتاً میم تو نہیں بن گئی تھیں کہ بیماری میں لوگوں سے ملنا چھوڑ دیا تھا یہ سب فرحت اپنی طرف سے کہہ رہی تھی۔ ایلی نے سوچ کر سینہ تان لیا۔ "نہیں نہیں میں جاؤں گا۔" وہ بولا۔

عین اس وقت رفیقاں دوڑتی ہوئی باہر نکلی "تمہیں مبارک ہو۔ تمہارے ہاں ایک ننھا بھائی ہوا ہے۔" بھائی ہوا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ بھائی کیسے ہو سکتا تھا۔ رفیقاں کا مطلب کیا تھا۔ اماں کے یہاں بیٹا لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ اماں تو اس گھر کی نوکرانی تھی۔ نوکرانی کے گھر بیٹا۔ اماں تو علی احمد کے کمرے میں کبھی نہ گئی تھی۔ اماں کو تو کبھی آواز پڑتی تھی۔ ہاجرہ سو گئی کیا۔ اماں تو ایسی نہ تھی۔ پھر اماں کے ہاں بیٹا نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ گناہ تھا بے عزتی تھی۔ نوکرانی کے بے عزتی۔ اماں نے تو کسی کلرک کو بھرتی نہ کرانا تھا۔ پھر یقیناً رفیقاں بکتی تھی۔ وہ دوڑ کر اندر گیا اور ننھے منے بچے کو دیکھ کر شرم سے زمین میں گڑ کے رہ گیا۔ پھر وہ باہر آ بیٹھا اور محسوس کرنے لگا۔ جیسے وہ آسا ہو۔ جیسے علی احمد نے اس کی ماں کو بھی کھلونا بنایا ہو اس خیال پر اس کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔

وہ صحن میں خاردار درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ چاروں طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

دور تک کچی اینٹوں کی منڈیروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور اس سے پرے ریت کے ٹیلے اداس کھڑے تھے۔ آسا۔ آسا درخت پر بیٹھا ہوا کوا چلایا۔ اس نے غصہ میں ایک پتھر اٹھا کر اس کی طرف پھینک دیا۔

ہاجرہ کے کمرے میں شور مچا ہوا تھا۔ محلے والیاں اونچی آواز میں چلا رہی تھیں۔ ''بہن تمہیں مبارک ہو۔''

وہ ہاجرہ کو مبارک باد کیوں دے رہی تھیں۔ لوگ کیوں ہاجرہ کے کمرے میں جمع ہوتے جا رہے تھے۔ کیوں لوگوں کو تو چاہئے تھا کہ اس سے نفرت کریں جو نوکرانی ہونے کے باوجود گود میں بچہ لئے پڑی تھی۔ لیکن اماں کو بھی احساس نہ تھا۔ کس بے شرمی سے مسکرا رہی تھی۔ اسے شرم نہ آتی تھی۔ مگر اماں تو ایسی نہ تھی۔

ایلی شرم سے پانی پانی ہوا جا رہا تھا۔ اب وہ لوگوں کو کیسے منہ دکھائے گا اب وہ اپنی ماں کے سامنے کیسے جائے گا اور فرحت ______ فرحت کو اس بات پر کتنا دکھ ہوگا۔ مگر فرحت تو خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔ کیا فرحت کو یہ بات گوارا تھی۔ کیا اس حادثہ پر اسے دکھ نہ ہوا تھا۔ ادھر ابا اپنے کمرے میں آقاؤں کی طرح اطمینا سے بیٹھے لکھ رہے تھے۔ جیسے انہیں نوکرانی اور اس کے نوازئیدہ بچے کی خبر ہی نہ ہو۔

بچے کی مبارکباد دینے کیلئے مختلف قسم کے لوگ آتے تھے۔ کچھ تو ہاجرہ کی کوٹھڑی میں جا کر گھس جاتے اور کچھ علی احمد کے کمرے سے آگے نہ جا سکتے۔ کوران لوگوں میں پیش پیش تھی۔ ''بابو مبارخ ہو'' وہ دور سے چلاتی ہوئی آئی پھر علی احمد کے کمرے میں داخل ہو کر یوں مطمئن ہو گئی۔ جیسے علی احمد ہی زچہ اور بچہ ہوں۔

علی احمد کا کمرہ کور کے لئے مخصوص ہوا جا رہا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ دانت چمکائی گھگھرا اچھالتی آموجود ہوتی۔ ''کہو بابو جی کیا حال چال ہے ننھا کیسا ہے۔ اس کے سفید دانت سیاہ رنگ میں چمکتے۔ ''آ گئی تو'' علی احمد اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے۔

''اچھا تو ابھی یقین نہیں آیا۔'' وہ پنکھے کی رسی ہاتھ میں پکڑ کر چابک کی طرح جھلاتے ہوئے چلاتی۔

یہ دیکھ کر ٹین کا سپاہی جوش میں آ جاتا ''اچھا یہ جرأت۔''

پھر کمرے میں اودھم مچ جاتا اور ایلی غصے میں مٹھیاں بھینچتا ہے ''کتنی مکروہ آواز ہے کور کی' انداز کس قدر ننگا ہے۔ ننگا اور غلیظ'' اسے کور سے نفرت تھی اور وہ آسا کو دیکھ کر غصے میں کھولنے لگتا تھا۔ کیونکہ وہ محسوس کرتا جیسے خود آسا ہو اور کلرکی کا امتحان پاس کرنے کے لئے باجرہ کو لے کر آیا ہو۔

ایلی بڑی محنت سے اپنی توجہ کسی اور طرف مبذول کرنے کی کوشش کرتا مگر ان آوازیں اس کے کانوں پر ہتھوڑوں کی طرح پڑتیں۔ پھر دفعتاً علی احمد کے کمرے کا دروازہ کھلتا اور علی احمد کی آواز سنائی دیتی ''ایلی' ایلی۔''

دھرم بھرشٹ

اس وقت ایلی کا علی احمد کے کمرے میں جانا کس قدر دشوار اور پر اذیت ہوا کرتا اور وہ دروازے پر جا کر رک جاتا۔ اندر جانے کی ہمت نہ پڑتی۔ پھر وہ انتظار کرتا کہ ایک بار پھر آواز پڑے تو اندر جائے۔ باہر چلچلاتی دھوپ میں اسے کافی دیر تک کھڑا رہنا پڑتا۔ اندر ربڑ کی گڑیا نہ جانے کیا کیا تماشے کرتی۔ ان تماشوں میں وہ دونوں بھول جاتے کہ انہوں نے ایلی کو آواز دی تھی۔

''ایلی'' دوسری مرتبہ آواز پڑنے پر وہ ڈرتا ڈرتا اندر داخل ہوتا اکثر دونوں ایک دوسرے سے یوں باتوں میں مشغول ہوتے ایک دوسرے میں اس حد تک کھوئے ہوتے کہ دیر تک قریب کھڑے ایلی کی طرف ان کی توجہ مبذول نہ ہوتی۔ پھر علی احمد چونک کر کہتے ''او ہ تو آ گیا ایلی۔ وہ میز پر بوتل پڑی ہے۔ اس میں پانی لے آ۔ کور کو پیاس لگی ہے۔'' ایلی غصہ سے تنگ منہ والی بوتل کو دیکھتا ____________ گردن مروڑ کر اسے اٹھا لیتا۔

''ایلی۔'' کور چلاتی ''کنوئیں سے لانا۔''

ایلی کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ کنوئیں سے لانا۔ بڑی آئی دھرم والی چاہے خود روز بھرشٹ ہوتی رہے۔ پر دھرم بھرشٹ نہ ہو۔ اس گھر کا پانی نہ پئے گی۔ مٹکے کا پانی نہ پئے گی۔ دھرم بھرشٹ ہوتا ہے۔ لیکن بند کمرے میں خون چوسنے سے دھرم برشٹ نہیں ہوتا۔ مسلمان سے کشتی لڑنے سے دھرم شٹ نہیں ہوتا۔ ہتھیلی پر دو روپے رکھوانے سے دھرم بھرشٹ نہیں ہوتا۔ بڑی دھرم والی بنی پھرتی ہے۔ کنوئیں سے لانا غصے میں وہ بل کھاتا۔ لیکن بل کھانے کے علاوہ وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔ چلچلاتی دھوپ میں چلتا ہوا، غصے کی آگ میں کھولتا ہوا وہ کنوئیں پر پہنچتا راستے میں وہ بار بار دانت پیس پیس کر بوتل کی گردمروڑتا۔ جیسے وہ کور ہو بوتل کی گردن مروڑنے سے اس کی ایک گونہ تسلی ہو جاتی تھی۔

بام آباد میں کنوئیں نہیں تھے۔ جن میں ڈول ڈال کر پانی نکالا جا سکتا۔ وہاں سب کنوئیں راہٹ والے تھے۔ چلچلاتی دھوپ میں ایلی کو تن تنہا رہٹ کو بیل کی طرح کھینچا ڑتا اور تو اس کے چلانے سے رہٹ کا چکر ہلتا بھی نہ تھا۔ دم لینے کے بعد ہو پھر سے رہٹ کو دھکیلتا اور پھر تھک کر رک جاتا تا کہ تازہ دم ہو کر اسے چلا سکے اور جب چلتا ہانی کا اتنا بڑا دھارا بوتل پر گرتا تو بوتل گر کر اوندھی ہو جاتی اوندھی نہ بھی ہوتی تو بھی پانی ادھر ادھر بہ جاتا اور بوتل خالی رہ جاتی۔ اس نے کئی بار علی احمد کے گھر میں کور کے نزدیک اور کوئی برتن نہ تھا، جس میں دھرم بھرشت کئے بغیر پانی پیا جا سکتا ہو۔ علی احمد بیچارے کر بھی کیا سکتے تھے وہ کور کی بات سن کر ہنس دیتے اور کور انہیں ہنستا دیکھ کر کمرے میں لگے ہوئے پنگھے کی رسی معنی خیز انداز سے گھماتی جس پر علی احمد اور بھی ہنسنے لگتے اور بات شروع ہوئے بغیر ہی ختم ہو جاتی۔

علی احمد رسی کا سگنل دیکھتے ہی ٹین کے سپاہی میں تبدیل کر ربڑ کی گڑیا پر وار کرنا شروع کر دیتے۔ جیسے کہ ایک سپاہی کا فرض ہوتا ہے اور ایلی بوتل ہاتھ میں اٹھائے

کھڑے کا کھڑا رہ جاتا اور اس کی رہٹ اور بوتل کی داستان علی احمد اور کور کے قہقہوں میں دب کر رہ جاتی۔

ایک روز کنوئیں سے پانی لاتے ہوئے اسے ایک خوفناک خیال آیا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ دوپہر کی کڑکتی دھوپ میں بام آباد کا وہ ریتلا میدان ویران پڑا تھا۔ دور تک گلیوں میں کوئی نہ تھا۔ اس نے بوتل کی طرف دیکھا ایک بار پھر چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ مطمئن ہونے کے بعد ایلی نے منہ میں تھوک بھرا اور پھر دھڑکتے ہوئے بوتل میں تھوک دیا۔

اس روز پانی لاتے ہوئے وہ بے حد مسرور تھا۔ جیسے اس نے اپنے دشمن کو ہمیشہ کے لئے زیر کر لیا ہو۔ جیسے اس کا انتقام پایہ تکمیل تک پہنچ چکا ہو۔ پھر دفعتاً اسے ایک اور خیال آیا وہ رک گیا اور بوتل زمین پر رکھ کر سوچنے لگا۔ اس کا دل دھک دھک بج رہا تھا۔ منہ سرخ ہو رہا تھا۔ اور بدن پر چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ لیکن وہ ڈر گیا اس میں اس قدر جرأت نہ تھی اس کے علاوہ اس کھلے میدا میں کوئی جگہ نہ تھی۔ جہاں وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنا سکتا۔ لیکن ڈیوڑھی میں پہنچ کر دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ وہاں اسے کوئی بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔ کوئی نہیں۔ خوشی سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا وہ خوش تھا۔ اس کا انتقام ادھورا نہ رہے گا۔ اس نے بوتل ایک کونے میں رکھ دی۔ دروازے کی کنڈی چڑھا دی اور پھر _______ بوتل میں پانی کی سطح ابھر رہی تھی۔

اس روز کور کو بوتل سے پانی پیتا دیکھ کر اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ خوشی اس کے دل میں یوں چھلک رہی تھی، جیسے سوڈے کی بوتل میں جھاگ اچھلتے ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ فرحت اور ہاجرہ دونوں کو اپنی مسرت میں شریک کر لے۔ محلے کے ہر دروازے کو جا کر کھٹکھٹائے اور انہیں اپنا راز بتائے اور پھر ان کو اپنے ساتھ علی احمد کے کمرے میں لے آئے تا کہ وہاں وہ سب کور کو بوتل سے پانی پیتے دیکھیں۔

اماں کو بتانا بےکار تھا۔ اماں تو نصیحتیں کرنے کے سوا کچھ جانتی ہی نہ تھی ایلی کوئی

بات بھی وہ جواب میں نصیحت فرما دیتی کہا کرتی تھی کوئی برا کرتا ہے تو کرنے دو لیکن تم اس کے ساتھ برائی نہ کرو۔ اس پر ایلی محسوس کرتا۔ جیسے اماں عیسائی ہو جو ایک گال پر تھپڑ کھا کر دوسرا پیش کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ہونہ اماں تو خواہ مخواہ بنتی تھیں۔ اس کے علاوہ جب سے اس کے یہاں بچہ ہوا تھا۔ ایلی کی اس کے متعلق رائے بدل چکی تھی۔ اس لئے وہ خاموش رہا۔ اس نے بوتل کے پانی کا راز کسی کو نہ بتایا البتہ اس روز کے بعد اسے بوتل بھرنے کی کوفت سے نجات مل گئی۔

اس سے پہلے وہ کور کی آمد کی خبر سن کر گھبرا جایا کرتا تھا۔ اب اسے بوتل بھرنے کے لئے جانا پڑے گا۔ چلچلاتی دھوپ میں کنوئیں کا بھاری چکر دھکیلنا پڑے گا لیکن اب جونہی وہ گھر میں داخل ہوتی ایلی کا جی چاہتا کہ وہ جلدی پانی مانگے اور ایلی بوتل میں نفرت کا زہر بھر کر لا دے۔ اب اسے کنوئیں چکر چلانے اور بوتل بھرنے میں کوفت کی بجائے مسرت ہوتی اور پھر جب چوگان میں بیٹھ کر وہ منہ میں تھوک اکٹھا کرتا تو اس کا چہرہ خوشی سے لال ہو جاتا پھر ڈیوڑھی کی طرف بھاگتا اور بالآخر بوتل اٹھا خوشی خوشی علی احمد کے کمرے کی طرف چل پڑتا۔ اس خوشی میں یہ قطعی طور پر بھول جاتا کہ علی احمد کے کمرے میں کھانس کر داخل ہونا چاہئے اور وہاں جانے سے پہلے سر جھالینا چاہئے۔

انوکھے جذبات

اس زمانے میں وہ محبت کے اولین جذبات سے واقف ہو رہا تھا۔ اس کے دل میں نئے انوکھے جذبات ابھر رہے تھے۔ بلا وجہ سکول کے دو ایک لڑکے اچھے لگنے لگے تھے۔ حالانکہ اچھا لگنے کی کوئی وجہ معلوم نہ ہوتی۔ پھر بھی وہ اسے اچھے لگتے تھے۔ مثلاً اس کے ہم جماعتوں میں ایشور لال پرکاش اور گھنشام تھے۔ مثلاً اسے گھنشام کا چپ چاپ کھڑا ہونا۔ وہ ایک عجیب انداز سے کھڑا ہوتا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ سیدھی ہوتی۔ دوسری یوں خمیدہ رہتی جیسے ازلی طور پر اس میں سیدھا ہونے کی

صلاحیت ہی نہ ہو۔ ہونٹ یوں آپس میں چٹکی سی بنائے رہتے جیسے ابھی کوئی بات کرنے والے ہوں، مگر ہونٹوں پر آئی ہوئی وہ بات ہونٹوں میں دبی رہتی۔

پھر وہ پرکاش تھا۔ پرکاش کا پھولا پھولا چہرہ اور اس کے رخسار پر وہ سیاہ تل اسے بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا اور ایشور لال کا وہ قہقہہ۔ اس کا بے تکلف انداز۔ اس کا لمبا سا منہ اور میلے دانت اسے بڑے اچھے لگتے تھے۔ ایلی صبح شام ایشور لال کے ساتھ رہتا تھا اور شوق سے اس کی باتیں سنتا رہتا۔ حالانکہ ایشور لال کے دانت بڑے بھدے اور زرد تھے اور اس کے منہ سے بو آتی تھی مگر وہ بو کتنی اچھی لگتی تھی اسے ایشور لال کا بولے جانا بولے جانا۔ اونچی آواز میں شور مچانا۔ اس کی پھٹی پھٹی آواز سن کر ایلی محسوس کرتا۔ جیسے اس پر ہپناٹزم کر دیا گیا ہو۔ وہ کیفیت کس قدر پر لذر محسوس ہوتی تھی۔

روز شام کے وقت ایلی اس طرف نکل جاتا۔ جس طرف گھنشام کا گھر تھا اور گھنٹوں گلیوں اور بازاروں میں اس امید پر آوارہ پھرتا کہ شاید گھنشام کسی کام کے لئے باہر نکلے اور پھر۔ پھر اسے دیکھ کر رک جائے۔ کھڑا ہو جائے اسی طرح جس طرح سکول کے برآمدے میں کھڑا ہو جائے اسی طرح جس طرح سکول کے برآمدے میں کھڑا رہتا تھا۔ ایک ٹانگ سیدھی اور دوسری میں خم، پھر وہ دونوں پاؤں ملا لیتا اور پنجوں کے بل کھڑا ہو کر ایڑیاں اٹھا لیتا ارو پھر پنجوں پر جھولنے لگتا۔ ایلی کو یوں لگتا جیسے کوئی ننھا سا فرشتہ فضا میں تیر رہا ہو۔ اس کے ہونٹ کلی سے بنے رہتے تھے۔ نہ جانے ہونٹ کیوں کلی سے بن جاتے تھے۔ جیسے اس نے کوئی بڑی شگفتہ بات سنی ہو یا کہنے والا ہو۔

بیٹھے بٹھائے ایلی کے دل میں اضطراب سا پیدا ہو جاتا اس کا جی چاہتا کہ وہ ایشور لال کی باتیں سنے یا گھنشام کے سامنے کھڑا ہو اور فضا میں کوئی پیارا فرشتہ جھول رہا ہو یا پرکاش کا گول چہرہ اس کی نگاہوں میں سما جاتا اور وہ بے تاب ہو کر اٹھ بیٹھتا

اور باہر گلی میں جا کر ٹہلتا تو پڑوس والے گھر سوے زاہدہ' عابدہ کی آوازیں کان میں پڑتیں کس قدر سریلی آوازیں تھیں۔ دل میں تیر کی طرح چبھ جاتی تھیں اور پھر اندر جا کر ڈولنے لگتیں جیسے دل میں کوئی فرشتہ پنجوں کے بل کھڑا جھول رہا ہو۔ آوازوں میں کیسا جادو تھا۔ کیوں۔ شکلیں تو بالکل سیدھی سادی تھیں۔ رنگ بھی کالا اور ان میں کچھ بھی تو جاذب نظر نہ تھا۔ لیکن آوازیں ایلی کو بیتاب کر دیتی تھیں۔ تیکھی سریلی اور رولچدار آوازیں۔

پھر دفعتاً اسے خیال آتا کہ قریب ہی وہ چٹنی سفید نرس میز کے مقابل کھڑی آپ ہی آپ شرما رہی ہوگی۔ جیسے اس کی عادت تھی۔ مسکراتے ہوئے اس کے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے تھے۔ لیکن وہ مسکراتی کیوں تھی۔ مسکرانے کی کوئی وجہ بھی تو معلوم نہ ہوتی تھی۔ زرد رنگ کے مرہموں کے مرتبانوں اور کڑوی دوائیوں کی بوتلوں کے درمیان کھڑے ہو کر مسکرانا۔ ایلی کے لئے یہ عقدہ ناقابل حل تھا۔ پھر اس کی چال۔ کس پھبن سے چلتی تھی۔ مسکراتی تو جیسے چراغ روشن ہو جایا کرتے۔ مگر وہ ایلی کو دیکھ کر قطعاً نہ مسکراتی تھی۔

ہاں اس روز جس روز اماں نے اسے بلایا تھا۔ جب ان کے گھر ننھا ہوا تھا اس روز _____ علی احمد باز نرس سے باتیں کرتے رہے تھے۔ نرس مسکراتی تھی اور منہ موڑ لیتی تھی پھر منہ موڑ کر مسکراتی تھی اور علی احمد گھوم کر پھر اس کے سامنے آ کھڑے ہوتے تھے۔

زاہد اور عابدہ کے خیال سے بچنے کی کوشش میں ایلی نرس کے خیال میں کھو جاتا مگر ڈسپنسری کی کھڑکی تک جانے کی اس میں ہمت نہ پڑتی۔ پھر اس کے خیال کا رخ زاہدہ کے بھائی فرید کی طرف منعطف ہو جاتا کتنا شوق تھا اسے نرس کو دیکھنے کا۔ فرید بھرپور جوان تھا۔ اس کا جسم کتنا بڑا تھا۔ موٹے موٹے ہاتھ۔ پھولی پھولی پنڈلیاں اور بھرے بھرے بازو۔ وہ نرس کے لئے ہر وقت مضطرب رہتا تھا۔

"ایلی" وہ اسے گلی میں دیکھ کر رک جاتا۔ "ایلی ذرا جانا تو ہسپتال کی کھڑکی سے جھانکنا ہے یا چلی گئی۔ خدا کے لئے ابھی جاؤ۔ یار ہم تو مر گئے۔ تباہ ہو گئے۔ اس کے لئے اور پھر وہ مضطربانہ گلی میں گھومنے لگتا۔ بار بار جسم کھجاتا اور ڈسپنسری کی کھڑکی سے نرس اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کر منہ موڑ لیتی اور اپنے کام میں لگ جاتی جیسے کچھ خبر یہ نہ ہو کہ باہر کون کھڑا ہے۔

نرس مسکراتی کیوں تھی۔ مسکرانے کے بعد منہ کیوں موڑ لیتی تھی۔ ایلی کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ پھر وہ ہسپتال کیطرف جاتا کھڑکی میں سے دھڑکتے دل سے جھانکتا۔ کتنی سفید تھی وہ چٹی سفید ایلی کو گورا رنگ بے حد پسند تھا۔ لیکن نرس اس کی طرف دیکھتی بھی نہ تھی۔ مسکراتی بھی تو اسے محسوس ہوتا جیسے وہ مسکراہٹ بالکل روکھی پھیکی ہو۔ نہ جانے ایلی کے روبرو نرس وہ مسکراہٹ کیوں نہ مسکراتی تھی جو وہ فرید کے سامنے مسکرایا کرتی تھی اور ایلی کو دیکھ کر وہ منہ بھی تو نہ موڑتی تھی۔ اس پر ایلی کو بے حد دکھ ہوتا اس کا جی چاہتا تھا کہ کسی کونے میں جا کر رو دے چیخیں مار مار کر روئے۔ مگر رونا بھی تو نہ آتا تھا اسے۔

اس روکھی مسکراہٹ والی نرس سے مایوس ہو کر وہ ازسر نو گھنشام کے خیال کی طرف متوجہ ہو جاتا اور ہسپتال کی کھڑکی کو چھوڑ کر بازار کی برف چل پڑتا۔ شاید گھنشام کہیں بازار میں کھڑا ہو۔ شاید ایشور گلی میں کھیل رہا ہو۔ یا شاید پرکاشت ______۔

ایلی کے دل میں انوکھی بیداریاں پیدا ہو رہی تھیں۔ جوں جوں اس کے دل میں نئی آرزوئیں تشکیل پائے جاتیں توں توں اس کے دل میں علی احمد کے کمرے سے نفرت بڑھتی جاتی اور اس کمرے میں جانے والیوں کے خلاف بغض شدید تر ہوتا جاتا اور اماں اور رفیقاں کے متعلق شبہات تقیت پکڑتے جاتے۔

اماں تو اب ننھے میں کھو چکی تھیں۔ صبح و شام' دن رات وہ ننھے کی دیکھ بھال میں وقت بسر کرتی اور باقیماندہ وقت باورچی خانے میں گزارتی۔ فرحت بھی ہر وقت

ننھے کو کھلانے میں لگی رہتی تھی۔ رفیقاں اسے کھلاتی تو نہ تھی۔ مگر بڑے شوق سے دیکھتی۔ آتے ہی سیدھی ننھے کی طرف جا کر اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہتی ''یہ ننھا بال ہے۔ یہ مینڈھا سائیں ہے۔'' اور پھر باورچی خانے میں بیٹھ کر گھگھرے پر دھاگے سے بوٹیاں بنانے میں مصروف ہو جاتی۔

علی احمد اب بھی سارا دن حساب کتاب لکھنے میں وقت صرف کرتے تھے اور کور بھی مہینے میں صرف شاذ ایک مرتبہ آتی تھی۔ اب تو ایلی کو کور میں چنداں دلچسپی نہیں رہی تھی وہ اس کی بوتل میں تھوکنے سے بھی اکتا چکا تھا۔ جب کبھی علی احمد اس سے پانی لانے کو کہتے تو وہ چپکے سے بوتل اٹھا کر باہر نکل آتا اور پھر گھڑے سے پانی بھر لیتا پھر کچھ دیر گلی میں کھیلنے کے بعد بوتل اٹھا کر ابا کے کمرے کی طرف چل پڑتا اور کور سمجھتی کہ وہ پانی کنوئیں کا ہے۔ کور کو پانی کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی کہاں تھی وہ تو بند کمرے میں ربڑ کی گڑیا کی طرح چیں چیں کرتی اور جاتے وقت دو روپوں کیلئے علی احمد سے جھگڑا کرنے میں مصروف ہو جاتی۔ علی احمد کا بھی کور سے دل بھر چکا تھا کیونکہ اب وہ اس کے آنے پر بھی کام میں لگے رہتے تھے اور اس کے جانے سے پہلے ہی پھر سے لکھنے میں مصروف ہو جاتے۔ نہ جانے ان دنوں وہ کسے چٹھیاں لکھ رہے تھے۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ ایک چٹھی لکھ کر ایلی کو دیتے ''لو بھئی اسے لیٹر بکس میں ڈال آؤ۔''

پہلی مرتبہ جب ایلی نے لفافے کا پتہ پڑھا تو وہ حیران رہ گیا۔ استانی کے نام چٹھی اور وہ بھی شاہ کوٹ والی کیا وہی جس نے شلوار کی جگہ چادر لپیٹ رکھی تھی؟ وہ تو شاید اس بات کو اہمیت نہ دیتا لیکن گلی میں فرید نے اسے پکڑ لیا ''ہوں استانی کو خط جا رہا ہے۔ کون ہے یہ استانی۔ دال میں کچھ کالا ہے دوست!'' اس وقت ایلی نے بھی محسوس کیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ دال کون تھی اور کالا کون تھا۔ استانی تو دال نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر فرید نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور عجیب سی

نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ ''ایلی'' اس نے معنی خیز نگاہوں سے اسے دیکھا ایلی کے جسم میں جھنجھناہٹ سی دوڑ گئی۔ ''ایلی'' فرید نے اس پر بھرپور نگاہ ڈالی۔ ایلی کی ایڑیاں ہوا میں معلق ہوئیں اور وہ فضا میں جھلو لنے لگا جیسے وہ کوئی ننھا فرشتہ ہو۔ وہ محسوس کرنے لگا جیسے وہ خود گھنشام ہو اور کوئی ایلی اس کی طرف دیکھ رہا ہو۔ اس کے جسم میں چیونٹیاں سی دوڑنے لگیں۔

اس روز ایلی دیر تک آئینے کے سامنے کھڑا رہا۔ لیکن وہاں ایک بھدے کالے اور بھونڈے لڑکے کے سوا کچھ نہ تھا پھر اس نے باہر جا کر صابن سے منہ دھویا شاید وہ پہلا دن تھا۔ جب اس نے اس شدت سے محسوس کیا تھا کہ وہ بد صورت ہے۔

اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ فرید اسے ایسی نگاہوں سے کیوں دیکھتا تھا۔ نہ جانے وہ ایسی آنکھیں کیونکر بنا لیا کرتا تھا اور پھر اس کا ''ایلی'' کہہ کر خاموش ہو جانا۔ جیسے اس کی آواز حلق میں خشک ہو گئی ہو۔ لیکن اس کے اپنے جسم پر چیونٹیاں سی کیوں رینگنے لگتی تھیں۔ وہ چیونٹیاں گدگدی کیوں کرتی تھیں۔ جس سے دل میں کچھ کچھ ہوتا تھا۔ عجیب سا احساس تھا وہ'

ان جانے میں ایلی کو فرید سے ڈر لگنا شروع ہو گیا اور اس نے فرید کے گھر کی طرف جانا چھوڑ دیا۔ لیکن کیوں۔ وہ یہ نہ جان سکا۔ اس کے باوجود جب کبھی وہ کپڑے بدلتا یا نیا جوڑا پہنتا۔ تو اسے کوئی نہ کوئی ضروری کام پڑ جاتا اور مجبوراً اسے گلی میں اس سمت کو جانا پڑتا۔ جہاں فرید کا گھر تھا۔ جاتے ہوئے اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ ہر آہٹ پر اس کے دل پر عجیب سا دباؤ محسوس ہوتا۔ جیسے کسی نے اسے پکڑ لیا ہو۔ ''ایلی'' اسے خواہ مخواہ آوازیں سنائی دیتیں اور پھر جسم پر چیونٹیاں رینگنے لگتیں۔ گلی میں فرید نہ ملتا تو وہ اطمینان کا سانس لیتا لیکن دل میں دبی دبی سی خلش کانٹے کی طرح لگی رہتی اور بالآخر مایوس ہو کر گھنشام کے گھر کی طرف چل پڑتا ۔شاید گھنشام بازار میں کھڑا ہو۔ اس کی نگاہ تلے گھنشام آ کھڑا ہوتا۔ جس کے پاس

ہی فرید کھڑا ہنس رہا ہوتا فرید اور گھنشام۔ اب اس کے ذہن میں لازم وملزوم ہوئے جارہے تھے۔ روز بروز بے تاب ہوا جارہا تھا۔ بات بات پر اس کا دل دھڑکتا ایک اضطراب چاروں طرف سے اس پر یورش کر دیتا اور اس اضطراب کے تعاقب میں وہ آوارہ پھرتا۔ گلی میں میدان میں بازاروں میں اور گھر میں بھی وہ مختصر سا گھر دفعتاً اس قدر وسیع کیوں ہو گیا تھا اور علی احمد کا کمرہ روز بروز سکڑ کر چھوٹا کیوں انہیں اوران کے کمرے کو آسانی سے نظر انداز کر سکتا تھا۔

کشمیر کا سیب

ان دنوں علی احمد مضطرب رہنے لگے تھے۔ لکھتے لکھتے وہ قلم رکھ کر باہر آجاتے اور کسی ٹوٹی ہوئی چارپائی پر ہاتھوں میں سر تھام کر لیٹ جاتے۔ دیر تک چپ چاپ لیٹے حقہ پیتے رہتے پھر دفعتاً جوش میں اٹھ بیٹھے اور کسی نہ کسی بہانے کشمیر کی بات شروع کر دیتے۔ ”اجی کیا بات ہے کشمیر کی۔ اللہ تعالیٰ نے زمین پر جنت کا نمونہ اتار رکھا ہے۔ رہنے کا مزہ ہے تو کشمیر میں۔“ وہ کسی کو مخاطب کئے بغیر کہتے ”سرو قد درخت ٹھنڈی نہریں] ھل بے اندازہ۔ پھل کھاؤ، چشموں کا ٹھنڈا پانی پیو۔ اجی وہاں کے رہنے والے حسین نہیں ہوں گے تو کون ہوگا۔“ یہ محسوس کر کے کہ ان کی بات کوئی نہیں سن رہا علی احمد کبھی نہ گھبراتے تھے۔ ”جنہوں نے صبح شام سیب کھائے ہوں ان کی شکل سیب سی نہ ہوگی تو پھر کیسی ہوگی۔ سیدھی بات ہے کیوں رفیقاں جو سیب کھا کر پلے گا وہ بڑا ہو کر سیب بن جائے گا۔ ہی ہی ہی۔ کیا کہتی ہے۔“ اندر باورچی خانے میں رفیقاں چپ چاپ بیٹھی مسکراتی رہتی۔ ”کیا بات ہے کشمیر کی۔ واہ وا کسی شاعر نے کہا ہے۔

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

ایلی یہاں آؤ۔ ادھر تمہیں اس شعر کا مطلب آتا ہے کیا؟“ وہ شعر پھر سے دہراتے

اور ایلی کی خاموشی پر کہتے "آؤ تمہیں اس کا مطلب سمجھائیں لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ کشمیر ہے کہاں ـــــــ وہ تو ٹھیک ہے یہ بتاؤ کہ وہاں گرمی کیوں نہیں پڑتی اور وہاں چشمے کیوں پھوٹتے ہیں۔ شاباش ٹھیک پہاڑ تو ہے لیکن پہاڑ پر رہنے والے۔ رفیقاں تم جانتی ہو پہاڑ پر رہنے والوں کے چہرے سیب کی طرح کیوں ہوتے ہیں۔ ایلی کی ماں تم نے دیکھا ہے کسی جو برسوں کشمیر میں رہا ہوں۔ سبحان اللہ کیا رنگ روپ ہوتا ہے۔ میمیں بیچاری کیا مقابلہ کریں گی۔ انگریز تو بدصورت ہوتے ہیں۔ ان کے منہ پر تو نحوست برستی ہے۔ لیکن کشمیر والے۔ واہ واہ سبحان اللہ"

گھر میں کسی کو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ علی احمد بام آباد کے ویرانے میں بیٹھے بیٹھے دفعتاً کشمیر کیسے جا پہنچے۔ ہاجرہ نے یہ عالم دیکھا تو ایک دن چپکے سے رفیقاں کے کان میں بولی "کوئی بات ہے ضرور کوئی بات ہے میں جھوٹ نہیں کہتی۔ میری بات یاد رکھو۔ اگر بات نہ نکلی تو میرا ذمہ اور بات نکلنے میں دیر بھی نہیں لگے گی ہاں۔ میں تو تیور پہچانتی ہوں ان کے۔"

رفیقاں ہونٹ پر انگلی رکھ کر حیرانی سے ہاجرہ کی طرف دیکھتی "اچھا۔ لو میں بیچاری کیا جانوں۔"

بڑی بیچاری تو دیکھو۔ ایلی گھورتا۔

پھر دفعتاً ننھا بیمار پڑ گیا اور سب کی توجہ ننھے کی طرف مبذول ہو گئی۔ ہاجرہ رفیقاں اور فرحت ہاجرہ کے پاس بیٹھی رہتیں۔ ایلی کو دن میں دو تین بار ڈسپنسری جانا پڑتا۔ وہ نرس تک پہنچ تو جاتا لیکن اس سے براہ راست بات کرنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا۔ کئی بار وہ بات کرنے کے لئے فرید کو ساتھ لے جاتا اور نرس فرید کی طرف دیکھے بغیر جھینپتی۔

نرس کی آمد پر علی احمد قمیص پہن لیتے اور ننھے کی چارپائی کے قریب آ کھڑے ہوتے۔ "ہی ہی ہی۔" وہ نرس سے اپنی بات شروع کر دیتے۔

نرس کے جانے کے بعد علی احمد ان سب کو تسلی دیتے۔

''گھبراؤ نہیں ٹھیک ہو جائے گا۔ بالکل ٹھیک ہو جائے گا سیب کھلاؤ اسے سیب لیکن سیب کشمیر کا ہو۔ کلو کا نہ ہو۔ ایلی بھاگ کر ایک سیب لے آؤ۔ وہ دو ____ آنے جیب سے نکال کر کہتے۔ بس سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایلی کی ماں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ مگر ایلی کلو کا نہ لانا تھوڑا سا رس نکال کر بچے کو دو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ کہتے ہیں نا انگریز۔ این ایپل اے ڈے۔ کیپس دی ڈاکٹر اوے' کیا سمجھے ایلی۔ اچھا تم آؤ گے تو تمہیں سمجھا دیں گے۔''

رفیقاں آتی تو علی احمد اسے روک لیتے ''رفیقاں ٹھہر تو سہی۔ تو تو بام آباد کا سکندر اعظم معلوم ہوتی ہے۔ آندھی کی طرح آتی ہے بگولے کی طرح چلی جاتی ہے۔ اس طرح بھاگنے دوڑنے سے فائدہ اور پھر بام آباد میں یہ کوئی جگہ ہے کیا بالکل فضول بے کار یہاں تو اچھا خاصا آدمی بیمار پڑ جاتا ہے۔ اب دیکھو اندر ننھا بیمار پڑا ہے۔ میری اپنی صحت تباہ ہو چکی ہے۔ تم بھی تو زرد پڑ رہی ہوں۔ کیوں' رفیقاں آنکھیں جھکائے مسکرائے جاتی۔ اچھا تو سکندر اعظم اب کی گرمیوں میں ہم تمہیں کشمیر لے چلیں گے۔ تم بھی اور ننھا بھی وہا جا کر یوں سرخ ہو جاؤ گے۔ جیسے جیسے ____''

کور کی آمد پر وہ قہقہہ مار کر صحن اٹھ بیٹھتے ''آیئے مہاراج لو بھئی یہ راجپوتانے کے شدھ سا ہنسی بھی آ گئے۔ تم چاہے جا کر ساری عمر کشمیر رہو کچھ فرق نہیں پڑے گا۔'' اور کور یہ بات سن کر پنکھے کی رسی کی چابک بنا لیتی اور اسے گھمانے لگتی۔ علی احمد ہنسنے لگتے۔

ادھر کور اور علی احمد کے درمیان ہنگامہ شروع ہوتا ادھر ساتھ والے کمرے میں ننھے کی حالت بد سے بدتر ہوئی جاتی۔ ننھے پر ہاجر کا سر جھکا ہوتا۔ گالوں پر آنسو رواں ہوتے اور چارپائی کے پاس رفیقاں چپ چاپ کھڑی ہوتی۔ اس پر ایلی نرس کو بلانے کے لئے بھاگتا۔

نرس کو گھر آتا دیکھ کر ٹین کا سپاہی جانکتا اور اپنی رزم گاہ کو چھوڑ کر نکل آتا پھر دفعتاً یہ محسوس کر کے اس نے قمیض نہیں پہنی ہوئی علی احمد لپک کر اندر داخل ہوتے اور قمیض پہن کر نرس کے روبرو آکھڑے ہوتے۔

''کیوں کیا بات ہے؟'' وہ کہتے ''خیریت تو ہے کیا بچے کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے کہ آپ تشریف لائی ہیں۔ آپ کے آنے پر ہر شخص کا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ نرس۔'' وہ مسکراتے۔

دفعتاً انہیں خیال آتا۔ کہتے ''اگر آپ برا نہ مانیں نرس تو پوچھوں کیا آپ کشمیر کی رہنے والی ہیں۔ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہی ہی ہی۔''

ان کی باتیں سن کر ہاجرہ اندر ننھے کو گود میں لئے بیٹھی آنسو بہائے جاتی اور رفیقاں اسے سمجھاتی تسلی دیتی۔ ایلی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہاجرہ روتی کیوں تھی۔ وہ کیوں توقع کرتی تھی کہ علی احمد اس کے بچے میں دلچسپی لیں۔

دلچسپی تو وہ لیتے تھے۔ اکثر آکر دیکھتے بھی ''گھبراؤ نہیں۔'' مسکرا کر کہتے ''ٹھیک ہو جائے گا۔ گرمیوں میں اسے کشمیر لے چلیں گے۔'' لیکن ہاجرہ چاہتی تھی کہ نوکرانی کے بچے کی بیماری کی وجہ سے آقا اپنی زندگی حرام کر لیں۔ نرس سے باتیں نہ کریں۔ کور سے کشتی نہ لڑیں۔ یہ سوچ کر ایلی کو آقا پر نہیں بلکہ نوکرانی پر غصہ آتا تھا۔

پھر ایک روز علی احمد کو ایک ضروری خط موصول ہوا۔ خط پڑھتے ہی وہ اٹھ بیٹھے اور جلدی سے تیاری کرنے لگے۔ پھر وہ ہاجرہ کے کمرے کے دروازہ ہر آکھڑے ہوئے۔ ہاجرہ اور سب عورتیں بچے کے اوپر جھکی ہوئی تھیں۔

''کیا حال ہے؟'' وہ بولے۔ ''واہ تم ویسے ہی گھبرا جاتی ہو فضول۔ آخر بیماری جاتے جاتے ہی جائے گی۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں بچے بیمار ہوا ہی کرتے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اچھا تو میں دو دن کے لئے سرکاری کام پر جا رہا ہوں۔ گھبرانا نہیں دو روز کے بعد آجاؤں گا ہاں ہاں ______ ایلی، ایلی یہ لو۔'' انہوں نے چند پیسے اس

کے ہاتھ میں تھما دیئے "خرش کر لیا۔ اچھا بھائی میں جاتا ہوں۔"

ننھے کی حالت خراب ہوتی چلی جا رہی تھی۔ سانس اکھڑ رہا تھا۔ منہ سوج رہا تھا۔ ہاجرہ کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ رفیقاں کے ہونٹوں پر وہی مبہم سی شرارت آمیز ہنسی تھی۔

فرحت چپ چاپ بیٹھی ابا کو جاتے ہوئے حیرانی سے دیکھ رہی تھی اور علی احمد بڑے اطمینان سے انہیں الوداع کہتے ہوئے تسلی دے رہے تھے "کوئی بات نہیں میں جلد آجوؤں گا سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

آٹھ دن کے بعد علی احمد لوٹے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی چلانے لگے۔ "ایلی کی ماں تمہیں مبارک ہو۔ اب تم تنہا نہ رہو گی۔ تمہارا ایک ساتھی گھر میں آجائے گا۔"

"ہائیں تم اس قدر خاموش کیوں ہو۔" انہوں نے گھر پر چھائی ہوئی خاموشی کو محسوس کر کے کہا اور پھر جیسے یک دم کچھ یاد آجانے پر بولے۔

"ہاں ننھے کا کیا حال ہے؟"

ہاجر کے منہ سے ایک دبی ہوئی چیخ سن کر وہ گھبرا گئے۔

"اوہ۔ تم نے مجھے بتایا ہی نہیں مجھے تار دے دیا ہوتا کوئی آدمی بھیج دیا ہوتا۔ تت تت تت۔ کتنا پیارا بچہ تھا۔ بے حد افسوس ہے۔" انہوں نے آہ بھری۔ "مگر اللہ کے کاموں میں کس کو دخل ہو سکتا ہے۔ صبر کے سوا چارہ نہیں اس طرح رونے سے کیا ہوتا ہے۔ رونا دھونا بے کار ہے۔ بالکل بیکار قسمت میں یونہی لکھا تھا۔" قسمت! ہاجرہ نے ماتھے پر زور سے ہاتھ مارا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس شام علی احمد صحن میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے "وہ اپنی استانی شام کوٹ کی ہے نا۔ تم جانتی ہو نا۔ نہیں جانتی۔ ہاں ایہلی جانتا ہے' کیوں ایلی جب تم میرے ساتھ دورے پر گئے تھے اور اس نے تمہیں مٹھائی کھلائی تھی یاد ہے نا۔ اس کی لڑکی ہے۔

سولہ سال کی عمر ہوگی۔ کشمیر میں پرورش پائی ہے۔ رنگ انار سا ہے۔ آخر کیوں نہ ہو۔ جس نے اناج کی جگہ پھلوں پر پرورش پائی ہو۔ اس کا رنگ انا سا کیوں نہ ہوگا۔ ساری بات طے ہوگئی ہے تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔ میں نے سوچا تھا۔ ایلی کی ماں اتنے بڑے گھر میں اکیلی رہتی ہے۔ کوئی تو ساتھی ہونا چاہیئے۔ لو بس اب تیار ہو جاؤ۔ ایلی کی ماں۔ ہم سب علی پور جارہے ہیں۔ ایلی کی دادی نے بلایا ہے۔ سارا انتظام تمہیں کو کرنا ہوگا ایلی کی ماں۔ تمہارے سوا گھر میں اور کون ہے۔ ہی ہی ہی'' وہ ہنسنے لگے۔

ہاجرہ کی آنکھیں بالکل ہی پتھرا گئیں۔ رفیقاں مسکرانے لگی اور ایلی علی پور جانے کی خوشی میں ناچنے لگا۔ ایلی کو بھائی کی موت پر چنداں غم نہ ہوا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اچھا ہی ہوا کہ نوکرانی کے گناہ کا نشان مٹ گیا۔ اب اسے کوئی یاد دلانے والا نہ تھا کہ وہ آسا ہے۔

علی پور جانے کی خبر سن کر ایلی کی توجہ اپنے ساتھیوں کی طرف مبذول ہوگئی اور وہ یوں بہل گیا جیسے کوئی بچہ کھلونا ملنے پر بہل جاتا ہے۔ نویں جماعت کا امتحان ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے علی پور جانے کی خبر اس کے لئے بے حد خوش کن تھی۔

شہ بالا

علی پور پہنچتے ہی محلے والوں نے ایلی پر سوالوں کی بوچھاڑ کر ڈالی۔

''کیوں ایلی کیا باپ کی شادی پر آئے ہو۔ کیا کہتا ہے۔''

''ایلی شہ بالا بنے گا اپنے ابا کا ہے نا'' ____ ''کیوں میاں تمہاری نظر میں بھی کوئی کشمیر کا سیب ہے۔ ابھی سے چناؤ کر لو میاں پھر پچھتاؤ گے۔''

''اے ہے ایلی بیٹے سے مذاق کیوں کرتے ہو۔ وہ کیوں بنے شہ بالا کسی کا۔ اس کے تو دولہا بننے کے دن آرہے ہیں۔ بھئی اسے دق نہ کرو۔''

''کیوں بھئی اماں کو ڈولی میں بٹھا کر کب لائے گا۔ ایلی۔''

ایلی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا جواب دے۔ ویسے وہ کوشش تو کرتا تھا کہ کوئی چمکیلی بات کرے لیکن نا جانہ کیوں اسے بات پر شرم محسوس ہونے لگتی اور اس کی آواز گلے میں خشک ہو کر رہ جاتی۔ اس پر عورتیں اسے چھیڑتیں۔

”لے لڑکے کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔“

”اے ہے اس کے گلے میں تو آواز خشک ہو گئی۔“

”نہ بیٹے ایلی برا نہ مان۔ اس کا ایک ہے علی احمد تو ہے ہی ایسا۔“

”عورتوں کے بغیر اس کا وقت کٹنا مشکل ہے۔ مگر بیٹا چاہے کوئی آئے کوئی جائے گھر کا مالک تو ہی ہے اور گھر کی مالکہ تیری ماں ہاجرہ۔“

”ان آنے جانے والیوں کو کون پوچھتا ہے ماں۔“

ادھر علی احمد کے گرد لوگوں نے حلقہ باندھ رکھا تھا۔ ”کیوں علی احمد نہ رہ سکا تو نئی شادی کئے بغیر شرم نہیں آتی علی احمد۔ یہ کیا تیرے دولہا بننے کا وقت ہے۔ گھر بیٹی جوان ہو چکی ہے۔ لڑکا دسویں پاس کر چکا ہے۔“ ”عیل احمد کوئی کشمیر کا سیب ہمیں بھی لا دو۔“

لیکن علی احمد کے حلق میں آواز خشک نہ ہوتی تھی نہ ان کا شہرہ زرد پڑتا اور نہ ہی ان کی زبان لڑکھڑاتی اور وہ سب کو کوئی نہ کوئی جواب دے کر خاموش کر دیتے۔ داروغہ سے کہتے بھائی داروغہ کشمیر کے میب لانے کی چیزیں نہیں۔ بھئی وہ تو دال سے توڑ کر کھانے کی چیز ہے۔ ہمت ہے تو ہاتھ بڑھاؤ۔“

جانوں مائی سے کہتے ”الو مائی اللہ نہ کرے میں کیوں رہوں شادی کے بغیر مرد ہوں میں مرد اور وہ بھی تیر بیٹا۔“

پھر جیواں آ کر چلاتی۔ ”علی احمد تیرے تو بال بھی سفید ہو گئے۔“

”ہاں ماں“۔ وہ جواب دیتے ”دل سفید نہیں ہوا۔ ابھی ایمان کی روشنی سے منور ہے اور اللہ رسول کی سنت کا لحاظ ہے۔“

"اے ہے۔ علی احمد۔" جیواں ہنس کر دوہتڑ مارتی "تو تو بھانڈ ہی رہے گا۔ ساری عمر۔" اور علی احمد ہنستے اور جیواں چلاتی اور ان کا گھر قہقہوں سے گونجنے لگتا۔

اس وقت ایلی کو علی احمد سے عقیدت سی محسوس ہونے لگتی۔ ان کی باتیں سن کر وہ ان کے تمام قصور بخش دیتا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ بھی علی احمد کی طرح باتیں کر سکے لیکن بات کرتے وقت اس کی زبان اٹک جاتی تھی۔ گلہ بیٹھ جاتا۔ دل کو کچھ کچھ ہونے لگتا تھا اور اس کا جی چاہتا تھا کہ بھاگ جائے دور جہاں کوئی نہ ہو۔ کوئی نہ ہو۔

علی پور پہنچ کر پہلے تو ہاجرہ بہت روئی تھی رو رو کر اس نے برا حال کر لیا۔ وہ ننھے کی باتیں کر سکے لیکن بات کرتے وقت اس کی زبان اٹک جاتی تھی۔ گلہ بیٹھ جاتا۔ دل کو کچھ کچھ ہونے لگتا تھا اور اس کا جی چاہتا تھا کہ بھاگ جائے دور جہاں کوئی نہ ہو۔ کوئی نہ ہو۔

علی پور پہنچ کر پہلے تو ہاجرہ بہت روئی تھی رو رو کر اس نے برا حال کر لیا۔ وہ ننھے کی باتیں کرتے ہوئے آنسو بہاتی رہتی۔ "اور پھر ایسا سمجھدار اور متحمل مزاج۔ رونا تو جانتا ہی نہ تھا وہ ہائے اتنی تکلیف وہ بیماری لگی اسے کہ توبہ ہے۔ زہر باد کوئی معمولی بیمار نہیں بہن۔ لیکن اس بچہ نے اف تک نہ کی۔ رویا ہی نہیں۔ بس حیران نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتا رہا کہ میں کہا آ گیا جہاں میری کسی کو قدر نہیں۔ جہاں کسی کو میرے دکھ کی خبر نہیں۔"

ہاجرہ کے آنسو سر تو ٹپکنے لگتے اور وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو جاتی۔ "بیماری میں بھی اس کا مسکرانا نہ گیا۔ یوں مسکراتا۔ — جیسے سیانے لوگ مسکراتے ہیں۔ میں روتی تھی اور وہ مسکراتا تھا۔ بیمار نے اسے ذرا بھی مہلت نہ دی۔" ہاجرہ وہ رو رو کر بچے کی باتیں کرتی رہتی اور پلو سے آنسو پونچھتی رہتی۔

ہاجرہ بار بار علی احمد کے بے حسی کا قصہ بیان کرتی رہی۔ "انہیں اپنے شغل سے کام۔ کوئی مرے یا جئے ان کی بلا سے۔ انہیں تو کشمیری سیب کا عشق لگا تھا۔ کہتے

تھے۔ کشمیری پھلوں پر پلی ہے۔ دسویں پاس ہے۔ انگریزی فرفر بولتی ہے۔ اچھا ہے بہن ہم بھی اس سے اٹھنا بیٹھنا۔ چلنا پھرنا۔ بات کرنا سیکھیں گے۔ مجھے تو خوشی ہے بہن کہ گھر میں میم آئے گی۔ سچ کہتی ہوں۔ میرا خدا شاہد ہے۔ بہن مجھے کلمے کی قسم مجھے کوئی دکھ نہیں۔ بس یہی دکھ ہے کہ ننھا تڑپ تڑپ کر مر رہا تھا اور میاں کو کشمیری سیب کی دھن لگی تھی۔ دو پیسے کی دوا تک نہ منگوائی۔ نرس کو دیکھنے آتی تھی تو اس سے ٹھٹھے کئے جاتے تھے۔ توبہ ہے۔ گھر میں کوئی دم توڑ رہا ہو اور لوگ اپنی حرص و ہوس میں کھوئے ہوئے ہوں۔ کیا زمانہ آیا ہے۔ مجھے سوکن کا دکھ تو نہیں۔ اس ننھے پھول سے بچے کا دکھ ہے۔" اور وہ از سر نو رونے لگتی۔ اس وقت ایلی کو محسوس ہوتا کہ ہاجرہ بچے کا نام لے کر نہ جانے کس دکھ کی وجہ سے رو رہی ہے۔ سوکن کا دکھ نہ تھا تو وہ اتنی قسمیں کیوں کھاتی تھی۔ کلمہ کیوں پڑھتی تھی۔

پہلے تو ہاجرہ ننھے کے لئے روتی رہی اور علی احمد کے بے وفائی کا گلہ کر کے آنسو بہاتی رہی پھر دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ لوگ یہ نہ سمجھ رہے ہوں کہ وہ سوکن کی آمد کی وجہ سے رو رہی ہے اور بیٹے کے بہانے اپنے لٹے ہوئے سہاگ پر آنسو بہا رہی ہے۔ ہاجرہ سب کچھ برداشت کر سکتی تھی۔

یہ نہیں کہ لوگ اس کی قوت برداشت کا مذاق اڑائیں۔ اس پر خاوند پسندی کا جرم عائد کریں۔ اس لئے وہ خاموش ہو گئی اور اٹھ کر علی احمد کے بیاہ کی تیاری میں لگ گئی اور یوں شوق سے انتظامات کرنے لگی جیسے خاوند کی بجائے اس کے بیٹے کی شادی ہو رہی تھی۔ انتظامات پر وہ بات بات پر اعتراض کرتی "نہیں نہیں یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میں دولہن کو یہ پہننے نہ دوں گی۔ دولہن کیا کہے گی۔ سسرال والے کیا سمجھیں گے۔ اور یہ زیور تو اب پرانا ہو گیا ہے۔ دولہن کے لئے نئی طرز کی چیز ہونی چاہئے۔"

اماں کے اس انہماک اور شوق کو دیکھ کر ایلی حیران ہوتا تھا۔ لوگ حیران ہوتے

تھے اور حیرانی کا اظہار بھی کرتے تھے۔ ''ہاجرہ تم کیوں جان مار رہی ہو۔ لو خواہ مخواہ۔ چھوڑو کرنے دو آپ ہی اسے۔ تمہیں کیا پڑی ہے۔ ایسا بھی نہیں ہونا چاہئے انسان کو۔''

یہ سن کر ہاجرہ کی آنکھ میں چمک سی لہراتی۔ ''اے ہے بہن اس میں کیا ہے۔ سوکن آئی ہے تو بیک شک۔ اپنے اپنے نصیب ہیں۔ جو اللہ نے نصیب میں لکھ دیا بسم اللہ۔''

اس پر لوگ اس کی طرف عجیب نگاہوں سے دیکھتے۔ حیرانی شکوک میں بدل جاتی اور وہ سوچتے ضرور اس میں کوئی بھید ہے۔ ایلی بھی ان شکوک کو شدت سے محسوس کرتا اور اسے اماں پر غصہ آتا لیکن کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ غصہ کیوں محسوس کر رہا ہے اور اس کے اپنے دل میں شکوک کیوں پیدا ہوتے ہیں۔ اس گھر کی تمام تر باتیں ہی عجیب تھیں۔ صرف ایک دادی اماں تھیں جو گھر کی الجھنوں سے دور بیٹھ کر مسکراتی رہتی تھیں۔

ایلی کو صرف دادی اماں پر بھروسہ تھا جس کسی بات میں دخل نہ دیتی تھی اور کھری کھری سنا دیتی تھی۔ ''علی احمد رسی جل گئی پر بل نہ گیا۔'' اس نے علی احمد کی شادی کے متعلق صرف یہی ایک جملہ کہا تھا اور پھر خاموش ہو کر جائے نماز پر جا بیٹھی۔

گھر کے باقی تمام لوگ عجیب تھے۔ ابا اپنی دھن میں کھوئے ہوئے تھے۔ اماں یوں مکے کی حاجن بنی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ انسان نہیں بلکہ فرشتہ ہو۔ صرف دو پروں کی کسر تھی اور سیدہ۔ کیسی چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی۔ جیسے منہ میں زبان نہ ہو۔ مسکراتی بھی تو ہونٹوں کے کونوں سے کسی کو پتہ نہ چلے۔

گھر کی ان الجھنوں سے اکتا کر ایلی باہر نکل جاتا اور محلے کے لڑکوں کو بلا کر سب کچھ بھول جاتا یا تو وہ ارجمند کے چوبارے میں جا کر کھڑکی کی درز سے بکور اٹکورا دیکھتا رہتا یا محلے کے کنوئیں کے پاس کھڑے ہو کر انکر اینڈی ماباؤں کو آزماتا یا جمیل

کے ساتھ جا کر تنگ گلی میں پیڑے کھاتا یا رضا کی دوکان پر بیٹھ کر اس کی اناپ شناپ باتوں پر ہنستا یا بالا کے ہاں جا کر گرامو فون سنتا اور یا محلے کے سب لڑکوں کو اکٹھا کر کے میدان میں گیند بیٹ کھیلنے میں مصروف ہو جاتا۔ ان مصروفیتوں میں دن بیت جاتا اور شام پڑ جاتی اور پھر دادی اماں کی آواز محلے میں گونجتی۔ ''ایلی اب تو آئے گا نہیں سارا دن لنڈوروں کی طرح پھرتا ہے۔ آ اب رات ہو گئی۔ ایلی۔'' پھر وہ چپکے سے دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھتا اور دادی اماں اسے دیکھ کر غصے سے چیختی اور وہ بے خوف آگے بڑھ کر اس کے کندھوں پر چڑھ جاتا اور وہ ہنس پڑتی اور پھر وہ دونوں ایک چارپائی پر سو جاتے اور دادی اماں اسے تھپکتی۔ ''سو جا لنڈور کہیں کا۔'' اس وقت ابا لیمپ کی روشنی میں مہاجنوں کی طرح حساب ملانے میں مصروف ہوتے۔ دو اور تین پانچ' آٹھ۔ تیرہ یہ ہوئے دو سو تیرہ اور ہاجرہ چیزیں دیکھتے ہوئے بڑبڑاتی ''لو یہ قمیص کا کپڑا بالکل بے کار ہے۔ دولہن کیا کہے گی۔'' اور علی احمد چلاتے ''تو تو پاگل ہو گئی ہے۔ اٹھارہ روپے گز کا ہے۔ اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔ دو سو تیرہ اور چھ سو چھبیس یہ ہوئے کل ____''

دولہن

دولہن کی آمد پر محلے میں ایک شور مچ گیا۔ چاروں طرف سے عورتوں نے علی احمد کے گھر کی طرف یورش کر دی۔

''آؤ بہن دلہن کو دیکھ آئیں۔''

''دولہن آ گئی کیا؟''

''ابھی آئی ہے ابھی۔''

''ہائے میرا دوپٹہ کہاں ہے؟''

''کہتے ہیں کشمیر میں پلی ہے۔''

''سنا ہے وہ تو انگریزی فر فر بولتی ہے۔'' اور وہ دوپٹے سنبھال کر علی احمد کے گھر کی

طرف چل پڑتیں۔

دولہن کی آمد کی خبر سن کر ایلی نے جھرجھری لی۔ اس کے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی اور وہ چپ چاپ کھڑے کا کھڑا رہ گیا نہ جانے کیوں وہ گھر جانے سے ڈرتا تھا۔

"اے ہے تو یہاں کھڑا۔ ایلی۔" وہ اسے سہا ہوا کھڑا دیکھ کر بولیں "اور تمہارے گھر میں اللہ کے فضل سے نئی دولہن آئی ہے۔"

دوسری بولی "بہن اللہ کے فضل سے کیوں کہو۔ یوں کہو کہ علی احمد کے شوق کی وجہ سے۔"

پہلی بولی: "اب جو آ گئی ہے تو اس پر اللہ کا فضل ہو۔ خوش یا دکھے۔"

ایلی حیرانی سے ان کی باتیں سنتا تھا۔ عجیب باتیں تھیں ان کی۔ وہ علی احمد پر غصے سے بل کھاتیں اور ساتھ ہی ان کی رنگین مزاجی کی وجہ سے ان کی جانب کھنچی جاتیں۔ ہاجرہ سے ہمدردی کا اظہار کرتیں اور ساتھ ہی اسے مورد الزام بھی سمجھتیں۔ کتنی عجیب بات تھی۔

دولہن کو دیکھنے سارا محلہ علی احمد کے گھر اکٹھا ہو رہا تھا مگر ایلی محسوس کرتا تھا جیسے اسے گھر نہیں جانا چاہئے۔ اس میں گھر جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی، لیکن آخر اسے گھر جانا ہی پڑا اور وہ چپکے سے ایک کونے میں جا کھڑا ہوا۔ بڑے کمرے میں عورتوں کے ہجوم کے درمیان پلنگ پر ایک سرخ رنگ کی گٹھڑی سی لپٹی پڑی تھی دو حنا مالیدہ ہاتھ لٹک رہے تھے۔ کتنی رنگدار مہندی تھی نہ جانے مونگیا قمیض کی وجہ سے وہ اور بھی سرخ دکھائی دے رہی تھی یا شاید اس لئے کہ ہاتھ بہت سفید تھے۔ ایلی نے نفرت بھر جھرجھری محسوس کی اور منہ موڑ لیا۔

ادھر عورتوں نے اسے دیکھ کر شور مچایا "ایلی یہاں آ۔ اپنی امی کو سلام کر آ کر۔"

"سلام جی۔" اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور پھر سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

"اے ہے لڑکا سلام کہتا ہے۔ اسے پیار تو کر لے دولہن۔"

''اللہ رکھے تیرا بیٹا ہے۔''

''پلا پلایا بیٹا مل گیا تجھے یہ بھی کسی کسی کے نصیب میں ہوتا ہے۔''

مونگیا چادر تلے سے حنائی ہاتھ ایلی کی طرف بڑھا۔ اس نے سر جھکا دیا اور منہ موڑ کر سانس بند کر کے کھڑا ہو گیا تاکہ اسے حنا کر رنگ دکھائی نہ دے۔ بو نہ آئے۔ سر تھپکنے کے بعد وہ حنائی ہاتھ اس کے منہ پر آ لگا۔ مہندی کی بو کا ایک طوفان اُمڈ آیا۔ اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے ڈور گئے۔ نہ جانے اس بو میں کیا تھا۔ ایلی کے جسم کا بند بند ٹوٹنے لگتا تھا۔ تار تار بجنے لگتا۔ گھبرا کر اس نے اپنا آپ چھڑا لیا اور صحن کی طرف بھاگا۔

''شرماتا ہے۔'' ماں جیواں چلائی۔ ''بڑا شرمیلا لڑکا ہے۔''

دوسری بولی ''ایسا اچھا بیٹا ملا ہے تجھے۔''

ایلی دادی اماں کے تخت تک پہنچ چکا تھا۔ اس کا دل مالش کر رہا تھا۔ سر گھوم رہا تھا اندر وہ سب ہنس رہی تھیں۔

''دیکھ آیا اماں کو۔'' دادی اماں نے کہا ''بیٹھ جا۔'' دیر تک وہ خاموش بیٹھے رہے۔

''میں نے تیرے لئے کچھ رکھا ہوا ہے۔ وہاں مٹی کی ہنڈیا میں۔'' دادی اماں اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

دوسرے کمرے میں علی احمد مضطربانہ طور پر ٹہل رہے تھے۔ بار بار وہ باہر نکلتے ''مائی جیواں تجھ پر تو پھر سے جوانی آ رہی ہے۔ ہلدی کا برتن کھاتی ہے کیا؟''

''شرم کر علی احمد۔'' مائی جیواں ہنستی۔ ''شرم کر۔'' لیکن اس کے انداز سے ظاہر ہوتا جیسے وہ اس کے بے شرمی بے حد مسرور ہو۔

چاچی حاجاں چلاتی ''لے آ گیا تیرا کشمیر کا سیب۔ تجھے مبارک ہو علی احمد۔''

''کیوں چاچی؟'' وہ جواب میں پوچھتے ''خسارے کا سودا تو نہیں کیا ہم نے۔''

وہ مسکرا کر کہتی ''علی احمد پہلے تو ہمیشہ مٹی پر گرا کرتا تھا۔ اب کی بار تو جیت گیا ہے۔''

''پسند ہے تمہیں چاچی؟''

''اچھی ہے۔ اپنی لڑکیوں کی طرح ہی ہے۔ بیچاری' ناک نقشہ برا نہیں رنگ سفید ہے۔ آنکھیں کالی تو ہیں پر ذرا کھلی کھلی ہیں۔ بہر حال ناک نقشہ برا نہیں۔''

''تیرے ناک نقشے کی طرح ہے کیا'' چاچی ہنسے جارہی تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کی ایلی پھر دولہن کے کمرے میں جا داخل ہوا اور چور چوری اسے دیکھنے لگا۔ سفید جسم سے چارپائی بھری ہوئی تھی۔ اسے سفید رنگ بہت پیارا لگتا تھا اور ان جانے میں وہ بھرے جسم کو دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتا تھا۔ عورتیں ایک ایک کر کے چلی گئیں۔ پھر وہ دولہن کے پاس جا بیٹھا۔ دفعتاً دوپٹے میں حرکت ہوئی اور ایک بڑا سا سفید منہ ننگا ہو گیا اور وہ چوری چوری اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''ہائیں۔'' اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کی امیدوں کے عالی شان محل کو پاؤں کی ٹھوکر سے چور چور کر دیا ہو۔ دولہن کی آنکھوں میں فرق تھا اور اس کا چہرہ خالی ورق کی طرح سر سر کورا تھا۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے اسے دھوکا دیا گیا ہو جیسے اس کی توقعات کو ٹھکرایا گیا ہو اسے جان بوجھ کر غلط فہمی میں مبتلا رکھنے سے علی احمد کا کوئی خاص مقصد ہوگا۔ غصے سے اس کی کنپٹیاں بجنے لگتیں اور وہ بھاگا۔ دور' دور دولہن سے دور اس جیتے جاگتے دھوکے سے دور باہر صحن میں پہنچ کر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ کئی دن تو اس صدمہ کی وجہ سے وہ سخت اداس رہا پھر اس نے اپنے آپ کو محلے کی زندگی میں کھو دیا تاکہ گھر کے واقعات کو دل سے بھلا کر اپنی خوشی کو محفوظ کر سکے۔

نماز کمیٹی

اس زمانے میں علی پوری میں خلاف تحریک کے تحت نماز کمیٹیوں کا دور دورہ تھا۔ مسلمانوں میں اسلام کے متعلق بڑا جوش تھا ہر محلے میں نماز کمیٹیاں قائم ہو رہی تھیں۔ نوجوان لڑکے علی الصبح منہ اندھیرے جاگ پڑتے اور سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے

ایک دوسرے کو جگاتے ۔ پھر جلوس کی شکل میں شہر کا چکر لگاتے ۔ محلے محلے پھرتے اور گا گا کر لوگوں کو جگاتے ۔ نماز پڑھنے کی تلقین کرتے ۔ لڑکوں کو نماز پڑھنے سے اس قدر دلچسپی نہ تھی ۔ البتہ اکٹھے ہو کر گاتے ہوئے جگہ جگہ جانا ۔ مجاہدانہ انداز سے گھومنا اور مجاہدانہ شان سے للکار للکار کر گانا یا غازی مصطفےٰ پاشا کمال کی شان میں قصیدے پڑھنا اور امان اللہ خان کے گن گانا اور علی برادران کو سراہنا ____ ایلی کو یہ شغل بے حد پسند آیا ۔ کیوں نہ پسند آتا محلے کے جوان اس بات میں شان امتیاز سمجھتے تھے ۔ جب وہ باہر نکلتے تو ان کا انداز عجیب ہوتا جیسے ہیرو ہوں ۔ جیسے مصطفےٰ پاشا کا گیت گانے والے خود مصطفےٰ کمال ہوں ۔ جنہوں نے زمانے کی نگاہوں سے بچنے کے لیے بھیس بدل رکھا ہو ۔ اس شغل میں بھی شریک ہوتے تھے ۔ رفیق ، اعظم ، غلام علی ، ضیاء ، اور صفدر لیکن صفدر اور غلام علی کی حیثیت صرف منتظمان کی سی تھی ۔ وہ صبح جاگتے لال ٹینوں کا انتظام کرتے ۔ انہیں جلاتے پھر نعتوں کی کاپیاں نکال کر گیتوں کی دھنیں قائم کرتے اور بالآخر چھوٹے لڑکوں کو گانے کا کام سونپ کر خود سگریٹ سلگا کر جلوس کے ساتھ چل پڑے ۔

بڑے لڑکوں میں صرف اعظم تھا جو انتظامات کرنے کے علاوہ گانے میں بھی پیش پیش ہوتا تھا ۔ ایلی اعظم کو دیکھ کر فخر سے پھولے نہ سماتا ۔ اس کا لے ، گانے کا انداز ، گردن اٹھا کر چلنے کی عادت اور گاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے کا انداز ایلی کو بے حد جاذب معلوم ہوتے تھے ۔ اس کے گلے میں یا کندھوں پر ایک شان بے نیازی سے رومال پڑا ہوتا تھا ۔ جس پر کمبل بڑی شان سے لٹکتا اور پھر گاتے ہوئے اس کی گردن کا زاویہ کس قدر خوبصورت معلوم ہوتا تھا ۔ ایلی کا جی چاہتا کہ وہ بھی اعظم کی طرح بے نیازی سے چلے اور شان استغنٰی سے گائے اور اس کا کمبل بھی ویسے ہی لٹکے ۔ لیکن سردی کی وجہ سے وہ کمبل میں ٹھٹھرتا ہوا چلتا اور گاتے ہوئے اس کی گردن پھول جاتی اور آواز چیختی اور کنپٹیاں درد کرنے لگتیں ۔ ایلی کی آواز تو بہت بلند تھی لیکن اس

کے گانے میں مٹھاس نہ تھی۔ عام طور پر وہ آواز بہت اونچی نکالتا اور ابتدا ہی میں ایسی سُر قائم کر لیتا جسے نبھانا مشکل ہو جاتا۔ پھر وہ سب اصرار کر کے اسے گانے والوں کے گروپ کا سردار بنا دیتے۔ یہ بہت بڑا امتیاز تھا۔ اسی امتیاز کی وجہ سے وہ بہت سویرے جاگ اٹھتا اور باہر نکل جاتا کہ نماز کمیٹی کے لیے لیٹ نہ ہو جائے۔

علی پور میں جب وہ جلوس کی صورت میں چلتے تو بند کھڑکیاں کھل جاتیں۔ چھتوں سے خمار آلود چہرے جھانکتے' منڈیروں سے انگڑائی لیتے ہوئے بازو دکھائی دیتے' بڑے لڑکے سگریٹ کا کش لے لے کر کھڑکیوں منڈیروں اور چھتوں کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتے اور ساتھ ہی ٹولی ہدایات دیتے رہتے۔ دریچوں سے مہین آوازیں سنائی دیتیں۔ "آ کر دیکھو تو نماز کمیٹی والے ہیں۔ دیکھو تو۔"

مسجد کے زیرِ سایہ

دوپہر کے وقت وہ ارجمند کے یہاں چلا جاتا اور وہ دونوں "انکر اینڈی ماباؤں" کے تمام سامان سے لیس ہو کر کنوئیں کے قریب جا کھڑے ہوتے اور ہر آتی جاتی لڑکی پر انکد اینڈی چلاتے۔ ارجمند ریشمیں رومال لہراتا۔ اس کے ہونٹ بانسری پر رکھے ہوتے لیکن بانسری بجانے کی بجائے وہ کچھ اور ہی ظاہر کرتے اور وہ دبی زبان سے کہتا "اف! غضب ہے۔ قیامت ہے۔ اب لڑکپن چھوڑ دے ظالم چباب آنے کو ہے۔"

ان دونوں کو وہاں کھڑا دیکھ کر کنوئیں کے پاس والے مکان سے برتن بجنے کی آوازیں آنا شروع ہو جاتیں پھر کوئی قہقہہ مار کر ہنستی اور با آواز بلند کسی کو پکارتی "حانشاں آئے گی بھی یا نہیں۔ ہی ہی ہی ہی۔" اس کے قہقہے سن کر ایلی کو علی احمد کا کمرہ یاد آ جاتا اور وہ سوچنے لگتا "کیا ہر مکان میں علی احمد کا کمرہ ہوتا ہے' کیا ہر بندے دروازے کے پیچھے ٹین کے سپاہی چھپے ہوتے ہیں۔"

پھر دفعتاً ٹاٹ کا پردہ ہلتا اور ایک بھرے جسم کی لڑکی سامنے آ کھڑی ہوتی۔ ارجمند

کا رومال ہلتا بانسری منتیں کرتی۔ آنکھیں چم چمک کر دیکھتیں۔ بازو بغل گیرے ہونے کے اشارے کرتے۔

اس وقت ایلی کے ماتھے پر پسینہ آ جاتا۔ آنکھیں جھک جاتیں۔ دل دھک دھک کرنے لگتا۔ کوئی آنکلتا تو وہ اس انداز سے ادھر ادھر دیکھنے لگتا۔ جیسے کسی اور کام میں مصروف ہو۔ جیسے اسے ارجمند سے کوئی تعلق نہ ہو۔ جیسے وہ راہ چلتے چلتے رک گیا ہو۔ اور ٹاٹ کے پردے سے مسکراتی ہوئی نوجوان لڑکی کی موجودگی کا اسے قطعی علم نہ ہو جیسے وہ انکر اینڈ ی ماباؤں کے عمل سے قطعی ناواقف ہو۔

ادھر ارجمند کا ریشمیں رومال اس کی گردن پر آ گرتا بانسری کا زاویہ بدل اور وہ یوں آسمان کی طرف دیکھنے لگتا۔ جیسے اللہ سے لو لگا کر اس کی حمد و ثناء میں کوئی دھن بجا رہا ہو۔

اس کے باوجود آتے جاتے شکوک بھری نگاہوں سے انہیں دیکھتے اور پھر مسکرا کر آگے نکل جاتے۔ ان کے جانے کے بعد ٹاٹ کے پردے کی اوٹ سے چھپی ہوئی لڑکی کا بازو یا آنکھ پھر سے باہر نکل آتی اور ارجمند کا رومال پھر سے لہرانے لگتا۔ ایلی کا دل پھر سے دھڑکنے لگتا اور اس کی پیشانی پھر سے پسینے سے بھیگ جاتی۔ اس خطرناک کھیل میں وہ زیادہ دیر مشغول نہ رہ سکتے تھے۔ اس لئے کہ آتے جاتے لوگ انہیں وہاں اس طور کھڑے دیکھ کر گھورتے تھے۔ شاید خطرناک ہونے ہی کی وجہ سے یہ کھیل ان کے لئے بے حد دلچسپ تھا۔ حالانکہ ایلی کو کبھی اتنی مہلت نہ ملی تھی کہ وہ ٹاٹ سے جھانکتے ہو چہرے کو نظر بھر کر دیکھ سکے وہ صرف یہی جانتا تھا کہ وہ بڑا سا چہرہ سفید سفید ہے اور وہ بانہیں مخملیں گوشت سے لبالب بھری ہیں اور وہ آنکھیں بے حد کالی اور سوخ ہیں۔

پھر وہ دونوں کنوئیں کو چھوڑ کر پرانی حویلی تھی، جو اب منہدم ہو چکی تھی۔ مشرق کی طرف چند ایک پختہ مکانات تھے۔ شمال کی سمت میں ایک گلی نکل گئی تھی، جس میں دور

تک کچے مکانات بنے ہوئے تھے۔ یہ گلی آصفی محلے سے تعلق نہ رکھتی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ پرانے زمانے میں آصفیوں کا کام کاج کرنے والے کمیں یہ گلی انہیں کی تھی اگر چہ اب ان کی مجلسی حیثیت آصفیوں سے کسی صورت کم نہ تھی۔

پرانی حویلی کے میدا کے پرے مشرق میں شیخوں کے چند ایک مکانات تھے۔ کنوئیں کے پاس ایک مکان میں سید آ کر آباد ہو گئے تھے اور اس کے قریب چند کشمیری آ بسے تھے۔ اب آصفی محلہ مغربی حصہ تک محدود تھا۔ وہ پختہ وسیع میدان جسے منڈی کہتے تھے اس کا مرکزی حصہ تھا۔ آصفی لڑکے عام طور پر اس مرکزی حصے میں کھیلنے سے گھبرایا کرتے تھے۔ کیونکہ وہاں کھیلنے سے انہیں محلے کی عورتوں کی نگاہوں تلے رہنا پڑتا تھا اور وہ بات بات پر اعتراض کرتیں "اے نالی کا گند اچھالتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ سارا دن ناپاک چھینٹے اڑاتے رہتے ہو۔ چھوڑو اس گندے کھیل کو۔" گلی میں کھیلنے پر وہ چلاتیں۔ "کسی کا سر پھوڑ کر اطمینان کا سانس لو گے تم یہ کیا شعیفوں کا کھیل ہے۔" منڈی میں انکر اینڈی ماباؤں کا کھیل تو بالکل بیکار اں تو ریشمی رومال تک لہرایا نہ جا سکتا تھا۔ بانسری بجانا تو الگ چیز تھی۔ اگر وہاں ریشمی رومال لہرایا بھی جا سکتا تو بھی اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا کیونکہ منڈی کے گرد رہنے والی لڑکیاں کھڑکیوں میں نہیں آسکتی تھیں۔ یا تو ان میں اس قدر جرات نہ تھی اور یا شاید حس ہی نہ ہو وہ دبے پاؤں چلتیں جیسے پاؤں کی آہٹ ان کی دشمن ہو۔ نیچی نگاہوں سے دیکھتیں۔ بند ہونٹوں سے مسکراتیں اور یوں آہستہ بولتیں جیسے وہ لڑکیاں نہیں بلکہ چلتے پھرتے سائے ہوں اور پھر منڈی میں ہر آہٹ بوڑھیوں کے کان کھڑے ہو جاتے۔

"کون ہے۔ اے ہے شریفوں کے بیٹے بھی اب بانسریاں بجانے لگے۔ میراثی بن گئے۔ کیا توبہ ہے کیا زمانہ آیا ہے۔"

"ریشمی رومال لہراتے ہوئے شرم نہیں آتی کیا۔" چاروں طرف بوڑھیاں

کھڑکیوں میں آ جمع ہوتیں۔ "یہ ذرا دیکھنا ماں بر کتے۔ چاچی حاجاں ذرا آؤ تو۔"

سارے محلے میں انکر اینڈی ماباؤں کے لئے صرف دو مناسب مقامات تھے ایک تو کنوئیں کے پاس مسجد کے قریب جہاں بڑی ڈیوڑھی تھی اور دوسرے پرانی حویلی کے میدان میں بڑی لالٹین کے نیچے

کپ اور کیپ

جب وہ دونوں لالٹین کے نیچے کھڑے ہوتے اور ارجمند بانسری کی سروں کو چھیڑتا تو دفعتاً عصمت اللہ کے مکان کی کھڑکی کی چق کو حرکت ہوتی جسے دیکھ کر ارجمند زیر لب کہتا "وہ مارا دیکھا جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔" پھر وہ چق کی طرف دیکھ کر آنکھیں چمکاتا اور ایلی مخاطب ہو کر کہتا "دیکھا ادھر بین بجی ادھر سانپ ناچنے لگا۔ اسے کہتے ہیں انکر اینڈی ماباؤں۔"

ارجمند کی باتیں سن کر ایلی فخر محسوس کرتا کیونکہ ارجمند کی فتح اس کی اپنی فتح تھی۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سانپ کون ہے۔ کہاں ہے اور اس کے ناچنے کا مطلب کیا ہے۔ شق کی طرف تو وہ بھی دیکھتا تھا۔ مگر اتنی دور سے چق کے پیچھے اسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا پھر وہ دوسری جانب دیکھنے لگتا شاید سانپ ادھر ناچ رہا ہو۔

اسے یوں کھوئے ہوئے دیکھ کر ارجمند چلاتا "نہیں یار۔ کیپ کپ سمجھے کیپ کھڑکی میں آ بیٹھی ہے وہ ہلی چق تو وہ اب دیکھا۔ افریا کس غضب کی چیز ہے بس سمجھ لو بالکل تیار ہے۔ ذرا سی کسر ہے ایک آنچ کی اگر ہماری ڈسپنسری یہاں علی پور میں ہوتی اور کیپ کسی روز دوا لینے آ نکلتی تو سب ٹھیک ہو جاتا۔ معاملہ صاف ہو جاتا۔ لیکن اب یہاں ڈسپنسری جو نہیں کیا کیا جائے۔"

ایلی محسوس کرتا کہ انکر اینڈی ماباؤں میں ایک ڈسپنسری کا ہونا اشد ضروری ہوتا ہے۔ لیکن سوچنے پر اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ ڈسپنسری اس سلسلے میں کیا مدد کر سکتی ہے۔ ڈسپنسریاں تو علی پور میں بھی تھیں۔ جہاں لمبی میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ میزوں پر روئی

کے پھاہے پڑے ہوتے اور کمپاؤنڈر قینچی لئے کھڑا رہتا۔ پھر بڑی بڑی بوتلیں اور وہ عجیب سی بو جسے سونگھنے سے انسان خواہ مخواہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ بیمار ہے اور وہ ڈاکٹر جس کے ماتھے پر چکنیں پڑی رہتیں۔ ہاتھوں میں ربڑ کی ٹوٹیاں لٹکتیں۔ جو نہایت خشک آواز میں باتیں کرتا تھا۔ اور مریضوں کی بات یوں بے پروائی سے سنتا تھا۔ جیسے سن ہی نہ رہا ہو۔ ایسی جگہ کے ہونے سے بھلا کیا فائدہ ہو سکتا تھا اور فائدے سے ارجمند کا مطلب کیا تھا۔

"کیپ کیپ" ارجمند کی آواز سن کر ایلی پھر چونکتا اور کھڑکی کی طرف دیکھتا کھڑکی میں ایک زرد رو لڑکی کا چہرہ دیکھ کر اس کا دل دھڑکنے لگتا اور وہ نگاہیں پھیر لیتا پھر ارجمند کا رومال ہلتا اور اس کے بالوں اور گالوں سے مس کرتا ہوا چھاتی پر آ گرتا اور ارجمند اسے یوں گلے لگا لیتا جیسے کوئی جاندار چیز ہو۔ یہ دیکھ کر کیپ مسکراتی اور لوچدار آواز سے پڑوسن کو بلاتی۔ "سکینہ سکینہ۔"

وہ دونوں اسے کیپ کہا کرتے تھے۔ نام ارجمند نے تجویز کیا تھا تاکہ سننے والوں کو معلوم نہ ہو کہ وہ کس کے متعلق باتیں کر رہے ہیں۔ ایلی جب چوگان میں لڑکوں کے ساتھ کھڑا ہوتا تو ارجمند اس کے پاس آ کر بہانے سے اپنے سر پر ہاتھ رکھ لیتا۔ جس سے ایلی کو معلوم ہو جاتا کہ کیپ کے متعلق کوئی بات ہے یا کیپ کھڑکی میں کھڑی ہے یا وہ چوگان کی طرف آ رہی ہے یا اس کے سکول سے آنے کا وقت ہو چکا ہے۔

اگر کسی خاص مصروفیت کی وجہ سے ایلی ارجمند کا اشارہ نہ سمجھتا تو ارجمند ٹوپی کے متعلق کوئی بات کر دیتا۔ ایلی ہم نے ایک کیپ خریدی ہے آؤ دکھائیں۔ غضب کی چیز ہے۔ ایسا خوبصورت رنگ ہے کہ تمہیں کیا بتائیں۔ واہ واہ دیکھو اور پھڑک جاؤ۔"

اس پر ایلی کی سمجھ میں آ جاتا کہ کوئی بات ہے اور پھر ایلی کسی بہانے کھیل چھوڑ کر

ارجمند کے ساتھ چل پڑتا اور وہ دونوں پرانی حویلی کے میدان میں جا کھڑے ہوتے اور کیپ کھڑکی میں آکر سکینہ کو آوازیں دیتی اور اب آواز بلند ہنستی یا انگریزی پڑھتی یا ویسے ہی کھڑکی میں کھڑی ہو کر سکینہ سے باتیں کرنے لگتی۔

"کل چھٹی ہے نا۔ پرسوں سے سکول کا وقت بدل جائے گا۔ پرسوں سے نو بجے لگے گا سکول ____ اور دھائی بجے ختم ہوگا۔"

اس پر ارجمند چلاتا "نوٹڈ، نوٹڈ" اور پھر زیر لب گنگناتا "ڈارلنگ ما بدولت تین بجے ڈیوڑھی پر ڈیوٹی دیا کریں گے تاکہ حضور کا باقاعدہ استقبال کیا جائے جو حضور کے شایان شان ہو۔" اتنے میں کیپ کے گھر سے ایک چھوٹی سی لڑکی مسکراتی ہوئی نکل آتی۔

ارجمند چلاتا "کپ کپ مدھ بھری پیالی۔"

وہ خواہ مخواہ شرماتی اور مسکاتی اور ان کے پاس سے گزر جاتی۔

"مدھ بھری پیالی۔" ارجمند باآواز بلند کہتا "چند سال کے بعد کیا غضب ہوگا۔ کیا قیامت ٹوٹے گی۔ کیا فتنہ بیدار ہوگا۔ اف پیالی پیالہ بن جائے گی۔ پتی پھول بن جائے گی۔ پتی پھول بن جائے گی کلی کھل کر چمن ہو جائے گی کیا سمجھے ایلی۔"

ایلی حیرت سے ارجمند کی طرف دیکھتا۔ ارجمند کی باتیں کس قدر دلفریب تھیں۔ اسے کیسے اچھے فقرے یاد تھے اور وہ اردو کس بے تکلفی سے بولتا تھا۔ "کاش" ایلی سوچتا "میں بھی پانی پت جاتا اور وہاں سے خوبصورت زبان سیکھ آتا اور پھر میں بھی ایسے جملے بول سکتا۔" لیکن ایلی تو سیدھی سادھی بات کرتے ہوئے بھی جھینپ جاتا تھا پاگلوں کی طرح وہ کپ کی طرف دیکھ تو سکتا تھا لیکن بات کر سکتا تھا اور وہ پیالی تھی بھی تو بے حد خوبصورت۔ کس قدر سفید رنگ تھا اور اس پر سرخی جھلکتی بھی تھی مگر وہ مدھ اس مدھ سے کس قدر مختلف تھی جو کیپ سے چھلکا کرتا تھی۔ حالانکہ کیپ رعنائی اور حسن میں کپ کے مقابلے میں ہیچ تھی۔

جب کپ لجائی ہوئی ان کے پاس سے گزرتی تو ارجمند ہنس کے کہتا ''جان من کیا دو سال کے بعد بھی ہمیں یاد رکھو گی بھلا نہ دینا خاکسار کو۔''

کپ کھلکھلا کر ہنس پڑتی اور ایلی دل گویا کھل کر پھول بن جاتا۔

ارجمند کہتا ''چلو بھئی اب بھورتی ڈکوری کی باری ہے۔ دعا کرو سائز بڑا نہ ہو۔'' پھر وہ ارجمند کے گھر بند کھڑکیوں کی درزوں سے جھانکتے رہتے۔ لیکن عام طور پر ان کا شوق پورا نہ ہوتا اور سامنے کا دالان ویران رہتا۔ اگر کبھی کوئی عورت غسل کرنے آتی بھی تو ایلی کی آنکھیں آپ ہی آپ بند ہو جاتیں اور وہ محسوس کرتا۔ جیسے وہ جرم کر رہا ہو لیکن اس وقت اس کا دل دھڑکتا نسیں تھرکتیں اور سانس مشکل سے آتا۔ یہ کیفیت تکلیف دہ ہونے کے ساتھ ساتھ لذت بھی تھی ایلی کی تمام تر دلچسپی اس کیفیت سے وابستہ تھی۔ اس منظر سے نہیں وہ منظر صرف اس لئے ضروری تھا کہ اس کی موجودگی سے ایلی کو یہ کیفیت حاصل ہوتی تھی۔

نسا نذیراں

بھورڈکوری سے فارغ ہو کر ایلی جمیل کے یہاں چلا جاتا اور وہ دونوں مل کر روپے گنتے جو جمیل نے ماں کی صندوقچی سے چرائے ہوتے ایک دو تین چار____ پھر وہ مل کر منصوبے بناتے۔ منصوبے بناتے وقت سامنے چوبارے میں ایک لڑکی آ جاتی انہیں دیکھ کر لڑکی کو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ وہ اٹھ بیٹھتی چار ایک قدم چلتی پھر لوٹ آتی پھر کھڑکی میں کھڑی ہو کر انگڑائیاں لیتی پھر سرہانہ اٹھا کر اسے سینے سے لگاتی۔ گود میں بٹھاتی پھر وہ ناچنا شروع کر دیتی۔ ناچ ختم ہونے پر وہ پھر سے انگڑائیاں لینا شروع کر دیتی۔ از سر نو کھڑکی میں آ جاتی۔ دوپٹہ اتار کر پھینک دیتی۔ بالوں کو لپیٹ لیتی پھر انہیں کھول دیتی۔ پھر دوپٹہ اوڑھ لیتی اور از سر نو ناچنے لگتی۔ ایلی نے کئی مرتبہ اسے دیکھا تھا۔ لیکن اس نے جمیل سے بات نہ کی تھی۔ نہ ہی اسے خیال آیا تھا کہ وہاں انکرا بینڈی ماباؤں کا کھیل کھیلا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک وہ کھیل تو

ارجمند کی موجودگی کا محتاج تھا۔ جمیل کو ایسی باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ فی الحال وہ تو ماں کی گٹھڑی میں سے روپے چرانے اور دوستوں کو پیڑے کھلانے کے دلچسپ مشغلے میں کھویا ہوا تھا۔

لیکن ایک روز جمیل نے اس سیماب صفت لڑکی کو دیکھ لیا اور دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ یہ نیا کھیل اسے بہت پسند آیا اور وہ دونوں شدت سے اس جوان لڑکی کی طرف دیکھنے لگے جو دوراپنے اور ایلی کے لئے جمیل کے چابارے میں انکر اینڈی ماباوں کا ایک نیا باب کھل گیا۔ انکر اینڈی کے اس باب میں ایک عجیب وغریب خصوصیت تھی نہ تو اس میں ریشمی رومال ہلانا پڑتا تھا اور نہ بانسری بجانے کی ضرورت تھی۔ نہ پریم پتروں کی کتاب کھولنی پڑتی تھی۔ بس وہ صرف کھڑکی کھول کر اس میں بیٹھ جاتے باقی سب کچھ وہ لڑکی خود کیا کرتی تھی۔ جب ایلی اکتا جاتا تو وہ گھر چلا آتا۔

جب وہ گھر کی سیڑھیوں کے قریب پہنچتا تو نذیراں اسے دیکھ کر کسی بہانے اپنا کام چھوڑ کر ان کی ڈیوڑھی میں آجاتی ''کہاں سے آئے ہو؟'' وہ اس کے قریب آکر مسکراتے ہوئے پوچھتی اور اس قدر قریب آجاتی کہ اس کے جسم کی بو ایلی کی ناک پر یورش کر دیتی اور نذیراں کا سانس اس کے منہ سے ٹکراتا ہوا محسوس ہوتا اور نذیراں ٹکٹکی باندھ کر اس کی طرف دیکھتی اور اس کی بانہیں ایلی کی طرف بڑھتیں اور گھبرا کر ایلی پیچھے ہٹ جاتا۔

''کہاں سے آئے ہو؟'' وہ اس کی برف بڑھنے لگتی۔

''یہیں۔ یہیں۔ ذرا باہر گیا تھا۔'' وہ کنی کترا کر سیڑھیوں کی طرف بڑھتا اور پھر بھاگ کر اوپر چڑھ جاتا۔ اسے یوں اوپر چڑھتے ہوئے دیکھ کر دادی اماں پوچھتیں۔

''کیا ہے تمہیں ایلی۔ یوں بھاگ کر کیوں چڑھتے ہو سیڑھیاں جیسے کوئی پیچھا کر رہا ہو۔''

ایلی ڈر کر پیچھے دیکھتا کہیں وہ پیچھے تو نہیں آرہی۔؟

”کیا ہے ان سیڑھیوں میں؟“ وہ پھر پوچھتیں۔

”کچھ نہیں دادی اماں کچھ نہیں۔“

نذیراں کو دیکھ کر اسے کبھی خیال نہ آیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ انگرایندی ماباؤں کا کھیل کھیل سکتا ہے اور ڈسپنسری کے بغیر ہی کامیابی حاصل کر سکتا ہے نہ ایس ریشمی رومال کی ضرورت ہے اور نہ شعروں کی کتاب کی۔ لیکن اس کے ذہن میں کامیابی کی نہ تو آرزو تھی اور نہ یہ شعور تھا کہ کامیابی کا مطلب کیا ہے اسے وہ لڑکیاں بے حد پیاری لگتی تھیں جو دور کسی کھڑکی سے جھانکتیں اور مسکراہٹ بھری نگاہ چھلکا کر کھڑکی بند کر لیتیں۔ اسے وہ لڑکیاں پسند تھیں۔ جن کے چہروں پر اداسی چھائی ہوتی۔ ایسی لڑکیاں جن کی صورت روئی روئی ہوتی جا ہائے اللہ کہہ کر بھاگ جاتیں وہ نہیں جو آگے بڑھ کر اسے گھیر لیتیں اور پوچھتیں کہاں سے آئے ہو۔

مکلاوا

ایک دن جب وہ حسب معمول نذیراں سے خوف زدہ ہو کر سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ ابا نے اسے آواز دی۔ ”ایلی“ وہ گھبرا گیا نہ جانے ابا نے کیوں بلایا تھا کہیں وہ سیڑھیوں کی بات سے واقف تو نہ تھے۔

ایلی ڈرتے ڈرتے قریب گیا ”آج تم شمیم کے ساتھ شام کوٹ جا رہے ہو سمجھتے جاؤ تیاری کر لو۔“ علی احمد نے کہا۔ خوشی سے ایلی کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ ایک نئی جگہ جائے گا۔

شام کوٹ

شام کوٹ کے نام سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ چونکہ صفیہ شام کوٹ کی رہنے والی تھی اگرچہ اسے وہاں جانے کا کبھی موقع نہ ملا تھا۔ اسی روز وہ شام کوٹ کو روانہ ہو گیا۔ شام کوٹ کے نئے محلے میں اپنی نئی ماں کا گھر دیکھ کر اسے بے حد مایوسی ہوئی ایک ڈیوڑھی کے پیچھے ایک چھوٹا سا تنگ و تاریک صحن تھا جس کے پیچھے دو کوٹھڑیاں

تھیں۔ ڈیوڑھی میں ایک بوڑھی عورت چادر باندھے بیٹھی تھی۔ چادر میں وہ کس قدر بھدی لگ رہی تھی۔ اس کا بیٹھنے کا انداز بھی تو عجیب تھا۔ جیسے وہ عورت ہی نہ ہو بلکہ کوئی بے حس گنوار مرد بیٹھا ہو۔

ایلی کو دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھی۔ ''خیر سے بسم اللہ'' اور وہ اس کے منہ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ ''بیٹھ جا۔ سنا علی احمد کا کیا حال ہے۔ آپ کیوں نہیں آیا وہ۔ بہت بننے لگا ہے اب تو پہلے تو یہ بات نہ تھی۔ دو سال میری منتیں کرتا رہا۔ میری دہلیز پر بیٹھا رہا۔ میری بیٹی کشمیر میں پلی ہے ہاں بڑی نازک ہے وہ۔ اسے کوئی دکھ نہ ہو۔ ورنہ وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ میں نے بھی ساری عمر سرکاری نوکری کی ہے۔ عمر بھر استانی کا کام کیا ہے۔ تم آئے ہی تھے نا۔ ہمارے سکول میں یاد ہے نا تمہیں۔''

دفعتاً ایلی کو یاد آیا۔ ہوں! یہ تو وہی استانی تھی۔ جو اس روز پردے کے پیچھے کھڑی علی احمد سے باتیں کر رہی تھی۔ ایلی نے گھن سی محسوس کی۔ کیا سبھی استانیاں اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ کیا ان میں ذرا بھی جھجک نہیں ہوتی۔ کیا وہ مردوں کی طرح چادریں باندھتی ہیں۔

''لڑکے کے ذرا حق تو بھرنا۔'' استانی نے کسی کو آواز دی اور پھر اپنی تقریر جاری کر دی۔ ''میں نے پورے پندرہ سال ملازمت کی ہے اللہ نہ کرے کوئی ضرورت نہ تھی۔ نوکری کرنے کا بس شوق تھا پڑھانے کا شوق۔''

اس کے لہجے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے محکمہ تعلیم کی بجائے پولیس کی نوکری کی ہو۔ علی احمد کی بات کرتے ہوئے اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے اس کما حقہ واقف ہو۔ جیسے علی احمد کے متعلق اسے تکلفات کی ضرورت نہ ہو۔ اس کے باوجود یا شاید اسی لئے اس کی گفتگو میں نفرت کی جھلک تھی۔ بات بات پر وہ اپنے گھرانے کی عظمت کا ذکر چھیڑ دیتی اپنی بڑائی جتاتی اور بالآخر اپنی بیٹی کی نزاکت طبع کی طرف اشارہ کر کے ایلی کو متنبہ کرتی اس کی بیٹی کو احتیاط سے گھر میں رکھیں۔ پھر

اس نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔ "قاسم" اور ایک جوان لڑکا باہر آ گیا۔ "یہ تیرا ماموں ہے۔" وہ بولی۔ ایلی نے ماموں کو سلام کیا لیکن وہ حیران تھا کہ جس قدر استانی کا چہرہ اور انداز نسائیت سے خالی تھا' اس قدر قاسم کا مردانہ پن سے محروم تھا۔

دو ناگ

اس گھر میں سب سے زیادہ قابل قبول شخصیت اس کی نئی امی شمیم کی ہی تھی۔ شمیم میں نہ تو استانی کی سی بیباکی تھی اور نہ قاسم کی سی مجہولیت۔ البتہ ایلی کو ایک تکلیف ضرور تھی۔ جب بھی شمیم اس کے پاس آتی تو اس کے چادر سے دو حنا مالیدہ ہاتھ نکل آتے۔ جن کی سفیدی اور بھی دودھیا۔ ان ہاتھوں کو دیکھ کر ان جانے میں وہ محسوس کرتا جیسے کوئی جرم ہو' گناہ کر رہا ہو۔ شمیم محبت جتانے کے لئے اپنے حنا مالیدہ ہاتھ اس کی طرف بڑھاتی اور ایلی انہیں اپنی جانب بڑھتا ہوا دیکھ کر گھبرا کر سہم جاتا اور دور ہٹنے کی شدید کوشش کرتا مگر بالآخر وہ دو حنائی ناگ اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتے۔ حنا کے بو سے اس کے ذہن میں ایک طوفان سا اٹھتا۔ گرد و پیش دھندلا جاتے اور پھر ____ شرم سے اس کا سر جھک جاتا وہ اپنی نگاہ میں ننگا ہو جاتا۔ ننگا اور شرمسار۔

اس طرح اس کی زندگی میں ہاتھوں کی اہمیت بڑھتی گئی۔ ماں کی اہمیت بڑھتی گئی اور اس کے ذہن میں حنائی رنگ کا جنسی زندگی سے تعلق استوار ہوتا گیا۔ ان کے گھر میں جو عورت آتی تھی۔ اسے ہ براہ راست یا باپ سے تعلق ہوتا تھا اگر وہ ان کے بند کمرے میں جا پہنچتی تو بھی اور اگر وہ اس کے زد سے بچنے کی کوشش کرتی تو بھی۔ بہر صورت ہر عورت جو اس مکان میں آتی تھی اسے علی احمد سے تعلق ہوتا اثباتی یا منفی تعلق۔

لیکن اس زمانے میں اسے اثبات نفی کا شعور نہ تھا۔ اس کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہو جاتا کہ بند کمرے کے طلسم کو توڑ کر ٹین کے سیاہی کے چنگل میں پھنسی ہوئی عورت کو

نجات دلائے لیکن اس خیال کے ساتھ ہی خواہ مخواہ چند ایک خیالی تصاویر اس کے ذہن میں اتر آتیں اور وہ لاحول پڑھنے سے مخلصی پانے والی حسین ماں جسے چھوڑ کر وہ بھاگ رہا ہوتا اپنی گود سے حنائی ہاتھ نکال کر اشارے کرتی۔ "ایلی۔ ایلی ٹھہرو مجھے ساتھ لے جاؤ۔ ایلی" ____ اور حنائی ہاتھ اس کی طرف بڑھتے چلے آتے۔

شمیم کے حنائی ہاتھوں سے ڈر کر وہ قاسم کے پاس جا بیٹھتا گرچہ اسے قاسم قطعی طور پر پسند نہ تھا۔ پھر بھی اسے وہاں سکون و اطمینان تو میسر ہو جاتا تھا نہ جانے قاسم میں کیا تھا۔ اس کے جسم پر بال نہ تھے اور یہ بات ایلی کو ناگوار تھی۔ اس کا صاف سنہرا جسم دیکھنے سے وہ کتراتا تھا لیکن قاسم قمیض پہنے بغیر بیٹھا رہتا۔ اب وہ قاسم کو قمیض پہننے پر کیسے مجبور کر سکتا تھا پھر اس کی ماں استانی بھی تو بدن کو ڈھانپنے کے متعلق محتاط نہ تھی اس کی قمیض کے بٹن اکثر کھلے رہتے تھے۔ جس میں لٹا ہوا پامال جسم کسی بند کمرے اور ٹین کے سپاہی کی غمازی کرتا تھا۔

بڑھیا کے جسم کی طرف دیکھ کر اسے کراہیت محسوس ہوتی۔ اس کے حنا مالیدہ ہاتھوں کو دیکھ اسے غصہ آتا۔ اسے حنا سے ہاتھ رنگنے کا کیا حق تھا۔ اسے ان ٹوٹکوں کو لٹکانے کا کیا حق تھا۔ شدید نفرت سے گھبرا کر وہ اندر کمرے میں جا گھستا جہاں وہ لڑکی شاد چپ چاپ بیٹھی کام میں مشغول ہوتی۔ شاد عجیب نام تھا اس کا لیکن اس کا رنگ زرد کیوں رہتا تھا۔ حالانکہ چلنے پھرنے اور کام کرنے میں وہ بے انتہا تیز تھی۔ کس پھرتی سے کام کرتی تھی وہ ____ سارے گھر میں صرف شاد ہی ایسی لڑکی تھی۔ جسے دیکھ کر اسے گھبراہٹ نہ ہوتی تھی۔ اس کی کئی ایک وجوہات تھیں۔ ایک تو وہ پتلے دبلے جسم کی لڑکی تھی۔ دوسرے اس کا رنگ سفید نہ تھا اور تیسرے اس کے ہاتھ حنا مالیدہ نہ تھے۔ حنا مالیدہ ہاتھ اس کے لیے صرف اس صورت میں پریشان کن ہوا کرتے تھے جب ان کا رنگ گورا ہو اور دیکھنے میں وہ گدگدے محسوس ہوں۔

چند دن شام کوٹ رہنے کے بعد وہ مکلاوا لے کر واپس علی پور پہنچ گیا اور چند ہی

دنوں کے بعد علی احمد اپنے حنائی ناگ لے کر واپس نوکری پر چلے گئے اور ایلی علی پور میں اکیلا رہ گیا۔

اس بات پر اسے بے حد مسرت ہوئی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ آزاد ہے۔ اسے علی احمد نے بند کمرے، ٹین کے سپاہی اور حنائی ناگوں سے نجات مل گئی ہے اور وہ مجرم نہیں ہے اس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔

لیکن اس کے باوجود محلے میں کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور ہو جاتا، جس سے اس کے دل میں ان ہاتھوں کی یاد تازہ ہو جاتی۔ اس کے دل میں پھر لذت اور گناہ کا احساس ابھرتا۔

چوزے اور گدھ

حنائی ہاتھوں کے سحر سے بچنے کے لئے وہ گھر سے باہر نکلتا اور گھومتا پھرتا۔ ارجمند، جمیل یا سعیدہ کے گھر پہنچ جاتا سعیدہ ایلی کی خالہ زاد بہن تھی۔ حسن دین محکمہ ڈاک میں ملازم تھے اور اکثر علی پور سے باہر رہا کرتے تھے۔ لیکن اگر علی پور میں ہوتے تو بھی ایسے محسوس ہوتا۔ جیسے وہ باہر ہوں۔ ان کی موجودگی اور غیر موجودگی میں چنداں فرق نہ تھا۔ اول تو وہ بات کرنے کے قائل ہی نہ تھے اور کرنے کی کوشش بھی کرتے تو وہ مکمل نہ ہو سکتی بلکہ ادھوری رہ جاتی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی وہ ایک نظر سعیدہ کی طرف ڈالتے اور پھر مسکرا دیتے۔ یہی ان کی سب سے بڑی بات ہوتی جسے صرف سعیدہ سمجھتی تھی۔ اس مسکراہٹ میں ان کا احساس کمتری ادھوری کوشش اور سعیدہ سے قلبی تعلق سبھی کچھ واضح ہو جاتا پھر وہ اپنی حاضری کے باوجود گویا مکان سے ناپید ہو جاتے اور سعیدہ اس مسکراہٹ سے اخذ شدہ احساس برتری میں پھولے نہ سماتی۔

سعیدہ کے مکان میں ہر وقت بھیڑ لگی رہتی تھی۔ اسے بھیڑ رکھنے سے بے حد دلچسپی تھی۔ وہ اپنی کھڑکی سے آتے جاتے کو آواز دیتی۔ "رفیق کہاں جا رہا ہے تو۔

""فرحت تو آج آئی نہیں ادھر" زبیدہ لو تم کہاں جا رہی ہو ________ بازی نہیں لگے گی کیا" "آؤ نا ایلی آج تو پارٹی کا بندوبست ہونا چاہئے۔"

سعیدہ، زبیدہ اور آصفہ تینوں سگی بہنیں تھیں۔ زبیدہ رحم علی سے بیاہی جا چکی تھی اور آصفہ مولانا عبداللہ سے ویسے تو تینوں بہنیں مزاج کی رنگین واقع ہوئی تھیں۔ مگر سعیدہ میں بہت زیادہ مجلسی عنصر تھا۔ اس کا گھر بھی محلے کے مرکزی مقام پر تھا۔ وہ ادھر ادھر سے لوگوں کو بلا کر اپنے گھر میں اکٹھا کر لیا کرتی اور پھر وہاں تاش کی بازی شروع ہو جاتی۔ چور سپاہی یا بھابی دیور کا کھیل چلتا۔ چور سے باقاعدہ ایک اکنی بطور جرمانہ وصول کی جاتی اور پھر یہ اکنیاں اکٹھی کر کے کچھ منگایا جاتا یا پکایا جاتا اور بالآخر سب لوگ مل کر کھاتے پیتے۔ اس شغل کے دوران سعیدہ کا گھر قہقہوں سے گونجتا۔ ایک دوسرے سے مذاق کئے جاتے۔ فقرے کسے جاتے۔

ویسے سعیدہ کے گھر میں تو روز ہی ہنگامہ رہتا تھا۔ لیکن کبھی کبھار خصوصی طور پر مولود شریف کا اہتمام کیا کرتی تھی۔ فرش پر سفید چادریں بچھائی جاتیں۔ گلاب چھڑکا جاتا۔ کھانے کو الائچیں اور پان مہیا کئے جاتے۔ شام کو عورتیں اکٹھی ہو کر نعتیں پڑھتیں اور مرد دور کسی جگہ بیٹھ کر سنتے یا قریب ہی کسی مقام پر چھپ کر دیکھتے۔ گانے کے علاوہ سعیدہ کو ناچنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ اکثر وہ چند ایک قریبی بہنوں اور بھائیوں کو بلا کر گانے کی محفل جما لیتی اور پھر سر پر طلے دار ٹوپی پہن کر ڈھولک کے ساتھ ناچتی اور اپنی حنائی ہاتھوں کو عجیب انداز سے لہراتی اور ایلی محسوس کرتا جیسے وہ کوئی جادوگرنی ہو اور حنائی ہاتھ کوئی جیتا جاگتا طلسم ہوں اس وقت اس کی نگاہ میں گردوپیش دھندلانے لگتے اور وہ چپکے سے وہاں اٹھ کر اپنے گھر دادی اماں کے پاس پناہ لینے کے لئے آ جاتا۔

دادی اماں اسے تھپک کر سلاتی "کچھ بھی تو نہیں ایلی۔ کچھ بھی نہیں سو جا اب" لیکن دادی اماں کی تسلیوں کے باوجود یا شاید ان تسلیوں کی وجہ سے وہ محسوس کرتا

کہ کچھ ہے۔ نہ جانے کہاں کچھ نہ کچھ ہے ضرور ہے جو اسے پریشان کر رہا ہے۔ اس کے دل کے نچلے پردوں میں لہریں لے رہا ہے۔ طوفان بپا کر رہا ہے۔ لیکن دادی اسے تھپکے جاتی۔ ''سو جا کچھ بھی تو نہیں۔ سو جا۔'' اور بالاخر وہ سو جاتا اور پھر نہ جانے کیا ہوتا۔ اس کے سامنے حنائی ناگ لپکتے اور ایک بھاری بھر کم جسم ناچتا ناچتا اس کی طرف بڑھتا اور پھر دھڑام سے اس کی چھاتی پر آگرتا اور اس کا دم رک جاتا اور وہ چیخ مار کر جاگ اٹھتا۔ دادی اماں اٹھ بیٹھتیں۔ ''کیا ہے تجھے ایلی۔ ڈر گیا ہے کیا۔ نہ جانے سارا دن کہاں کھیلتا ہے۔ کس کس مقام پر بیٹھتا ہے تو۔ تجھے جو کہا ہے میں نے کسی سخت مقام پر نہ جایا کر۔ رات کو تو ڈرنا ہی ہوا اس وجہ سے اب سو جا۔'' دادی اماں کو کیا معلوم تھا کہ وہ عمر کے کیسے سخت مقام پر آ پہنچا ہے۔

صبح سویرے ایلی پھر باہر نکل جاتا اور محلے کی زندگی کی گہما گہمی میں کھو جاتا بوڑھی عورتیں اس کی طرف اپنے جھلی دار پنجے بڑھاتیں۔ ''ایلی ہے جیتا رہ بیٹے۔ خدا عمر دراز کرے۔ تیری ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رہے میں کہتی ہوں۔'' وہ رازدارانہ طور پر ایلی جھک جاتیں۔ ''اللہ رکھے جائیداد کا وارث تو ہی ہے۔ تو ہی گھر کا مالک ہے اور یہ جو آتی جاتی ہیں۔ کلموہنیاں یہ سب چڑیلیں ہیں۔ سب دفعان ہو جائیں گی۔ انشا اللہ تو ہی گھر کا مالک بنے گا۔ کھیلنے جا رہا ہے۔ تو جا بچے جا۔ دو گھڑی کھیلنا اچھا ہی ہوتا۔'' عورتوں سے بچ کر وہ محلے کے کسی بوڑھے کے ہتے چڑھ جاتا۔

''میاں ایلی کہاں ہیں وہ تیرے ابا آج کل۔ نیا بیاہ کرنے کی تو نہیں سوچ رہا۔ وہ دماغ پھر گیا ہے اس کا لیکن بھئی ایک خوبی ضرور ہے۔ اس میں محلے میں کبھی ایسی بات نہیں کی۔ خیر اپنے اعمال کا ہر کوئی خود ذمہ دار ہوتا ہے۔ لیکن یاد رکھ۔ اپنے ابا کے نقش قدم پر نہ چلنا۔ سمجھے۔ بڑا اچھا لڑکا ہے۔ لیکن اب محلے کے لڑکوں کے ساتھ مل کر تو بھی بگڑتا جا رہا ہے۔ اچھا جا کھیل جا۔''

ارجمند ایلی کو دیکھ کر ریشمیں رومال لہراتا ''ارے یار بس تم تو سوئے ہی رہتے ہو۔

ابھی ابھی کیپ اور کپ سکول جا رہی تھیں۔ کیا بتاؤں آج کیا ٹھاٹھ تھے۔ غضب ہو گیا۔ سرخ قمیض جیسے خون سے رنگی ہو۔" دفعتاً پاؤں کی آہٹ سن کر وہ چونکتا۔" آ خا" وہ بات کاٹ کر کہتا" ارے وہ دیکھو تو میاں پہلوان بھی آ گئے وہ دیکھو کنوئیں کے پاس۔"

"وہ دیکھا سلام کا جواب دیا جا رہا ہے۔ کیا سمجھے یہ ماتھے سے مکھی نہیں اڑائی جا رہی۔ اس وقت مکھی کہاں۔ کیوں ایلی ہے نا اور ذرا ہکورا ڈ کورا تو دیکھو جب تک اس کلاک پر ماس نہیں چڑھے گا۔ یہ ٹن ٹن ہی کرتی رہے گی۔" اور پھر وہ ننھے چوزوں کی طرح سر جوڑ کر کیپ کپ کی باتیں کرنے میں دیر تک مصروف رہتے۔

ارجمند سے ملنے کے بعد وہ رفیق اور جلیل کے یہاں چلا جاتا۔ رفیق تو زیادہ وقت سودا خریدنے میں مصروف رہتا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ صبح سویرے اٹھ کر چچی پھوپھا اور خالہ کے گھر جا کر پوچھتا۔" خالہ جی کوئی چیز منگوانی ہو تو بتا دیجئے۔" "چچی بازار سے کچھ منگوانا ہے کیا۔" "پھوپھا جی میں بازار جا رہا ہوں۔ دیر تک وہ بازار جانے کا ڈھنڈورہ پیٹتا رہتا ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے گلابی پھوار اڑتی رہتی اور نگاہیں چوری چوری گردو پیش کا جائزہ لیتی رہتیں پھر وہ سوسے اکٹھے کر کے اپنا ریشمی رومال جیب میں ڈال اور غزلوں کی کاپی تھا کر بازار چلا جاتا جب سوادا سلف سے فارغ ہوتا تو وہ جلیل کی طرف جا پہنچتا اور پھر وہ تنگ گلی کی لڑکی اپنے گھر کی دہلیز اور گلی میں جھاڑو دیتی اور چلا چلا کر باتیں کرتی رفیق کی آنکھوں میں بوندا باندی ہوتی اور جلیل وحشت بھر نظروں سے اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتا اور لڑکی مسکرائے جاتی اور ایلی محسوس کرتا جیسے وہ کوئی دلچسپ سازش کر رہے ہوں۔

پھر یوسف آ نکلتا یوسف کے آنے پر نقشہ ہی بدل جاتا کیونکہ یوسف لڑکیوں کے وجود سے بے نیاز تھا وہ ان مسکاتے ہوئے جھانتے ہوئے لجاتے ہوئے چٹے سفید چہروں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔ اس کے آتے ہی تمسخرانہ حرکات کا

طوفان اُمڈ آتا۔ جلیل اور رفیق اسے بناتے اور وہ جان بوجھ کر بنتا جیسے کسی کارٹون میں جان پڑ گئی ہو۔ ایلی محسوس کرتا۔ جیسے یوسف کو بنانے سے جلیل کا مقصد صرف اس لڑکی کو محظوظ کرنا ہوتا تھا جو نہ جانے کیوں گلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جھاڑو دینے پر تلی رہتی تھی۔

دوپہر کے وقت جلیل اور ایلی محلے میں لوٹ آتے۔ اس وقت محلے کی بوڑھی عورتیں چوگان میں بیٹھ کر کوئی نہ کوئی کام کیا کرتی تھیں۔ کوئی ازار بند بنتی۔ کوئی تاگے کے گولے بناتی۔ چوگان سے گزرتے ہوئے رفیق کی گردن جھک جاتی۔ اس کی آنکھوں کی بوندا باندی ختم ہو جاتی۔ اس کے ہونٹوں کا گیت ختم ہو جاتا اور اس کے چہرے پاس جا بیٹھتا صفدر کی گردن تو ہمیشہ اکڑی رہتی تھی۔ اس کی اانکھوں میں ہروقت عجیب سی سرخی پھیلی رہتی اس کے بازو عجیب انداز سے لٹکتے رہتے اور ہونٹوں پر تبسم گیت کا سماں طاری رہتا۔ وہ مضطربانہ طور پر ادھر ادھر ٹہلتا ادھر ادھر دیکھتا اور پھر تھیٹر کے گیت کا کوئی بول ان جانے میں اس کے منہ سے نکل جاتا ''حافظ خدا تمہارا۔'' اس وقت ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ کسی سے رخصت ہو رہا ہو۔ اس پر ایلی کی نگاہوں تلے ایک پارسی حسینہ آ کھڑی ہوتی اور اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ وہ صفدر سے پوچھے کہ وہ پارسی لڑکی کیا ہوئی اور وہ گیت کیا پارسی لڑکی گایا کرتی تھی اور صفدر کی آنکھیں سرخ کیوں رہا کرتی تھیں اور اس کے بازو لہرایا کیوں کرتے تھے مگر ایلی کو صفدر سے بات کرنے کی جرات نہ ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ صفدر محلے کے بڑے لڑکوں میں سے تھا اور چھوٹے لڑکے بڑے لڑکوں سے ایسی باتیں نہیں کیا کرتے تھے۔ اگرچہ صفدر کے انداز میں وہ معزز پن نہ تھا جو عام طور پر بڑے لڑکوں میں پایا جاتا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس صفدر میں بے باکی تھی۔ خلوص تھا پھر بھی ایلی کو یہ باتیں پوچھنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔

صفدر کی ایسی بے باکی کی وجہ سے محلّہ والیاں اسے بہت برا سمجھتی تھیں اور روادی

اماں تو صفدر کا نام سنتے غصے سے چلانے لگتی۔ "بدمعاش کہیں کا شرابی۔ دفع کراسے۔ نام نہ لے۔ مردود کہیں کا۔" اور صفدر بھی دادی اماں کے نام سے چڑتا تھا۔ "مردود بڑھیا۔ کھڑکی میں گدھ کی برح بیٹھی رہتی ہے مرتی بھی نہیں۔" اور منچھل پوٹاش کا پٹاخہ بناتے وقت اس کی آنکھوں میں یوں مسرت لہراتی جیسے بڑھیا کو وہ اس پٹاخے تلے تڑپتے ہوئے دیکھ رہا ہو اور دیوار پر پٹاخہ یوں مارتا کہ ایسا محسوس کرتا۔ جیسے دیوار کی بجائے بڑھیا کے سینے پر پھینک رہا ہے۔

آصفی محلے کی زندگی محلے تنگ و تاریک گلیوں' کوٹھڑیوں اور تا نک چند اینٹوں کی رینگتی ہوئی اونچی دیواروں سے گھرے ہوئے احاطے میں مخصوص انداز سے دھڑکتی تھی۔

محلے کی بوڑھیاں صبح سویرے ہی بیدار ہو جاتیں اور کھڑکیوں میں چوکیوں پر گدھوں کی طرح آ بیٹھتیں۔ جوان لڑکیاں کوٹھڑیوں کی گھٹی گھٹی فضا میں تاریک دالانوں میں برتن مانجھ آٹا گوندھنے اور سر کا پلو سنبھالنے میں شدت سے مصروف رہتیں۔ اس تاریک اور گھٹی گھٹی فضا کی وجہ سے ان کے رنگ زرد تھے۔ چہروں پر مردنی چھائی ہوئی تھی اور انداز سے بے حسی ٹپکتی تھی۔ اگر کبھی کبھار ان کے چہرے پر جوانی کی چمک لہراتی بھی تو وہ کونے کی طرف منہ موڑ کر اپنا آپ سنبھال لیتیں اور پھر آٹا گوندھنے میں یا برتن مانجھنے میں مصروف ہو جاتیں۔

آصفی محلے میں صرف چند ایک مخصوص قسم کی آوازیں گونجا کرتی تھیں۔ محلے کی بوڑھیوں کی آوازیں ان کے چرخوں کی گھمر گھمر' تاریک دالانوں میں برتنوں کی کھنک' چوگان میں بچوں کا دبا دبا شور محلے کی مسجد سے تکبیریں مردوں کی کھنکھاریں اور دبے پاؤں چلنے کی آوازیں۔ بند ہوتے ہوئے نانک چندی دروازوں کی چراؤں تھک چمگادڑوں کی چیخیں جو شام کو چوگان پر منڈلایا کرتیں اور پھر ضعیفوں کے خراٹے۔

ان جملہ آوازوں میں صرف ایک آواز ایسی تھی جو محلے کی نفسیت سے مختلف تھی۔ وہ بالا کا گراموفون تھا۔ جو کبھی کبھار بالا کے آسیب زدہ کمرے میں گانے کی کوشش کیا کرتا تھا اگرچہ اس ماحول میں اس کی آواز گھٹ کر رہ جایا کرتی تھی۔

جب پہلی مرتبہ بالا کے گراموفون پر جانکی بائی الہ آبادی کے گیت کی آواز محلے میں سنائی دی تو محلے کی گدھیں جھپٹ کر کھڑکیوں میں آگئیں۔

"میں پوچھتی ہوں یہ کون چلا رہا ہے۔"

"نہ جانے کہاں سے آواز آرہی ہے۔"

"اے ہے یہ تو عورت ہے۔"

"لو چاچی وہ تو بالا نے لگایا ہے کوئی رکاٹ۔ اے ہے محلے میں باجے بجانا۔"

"توبہ ماں آج تک تو یہ سننے میں آئی نہیں تھی۔"

"میں کہتی ہوں اس لڑکے کا دماغ چل گیا ہے۔"

"لڑکے کا کیوں بہن۔ قصور تو داڑھی والے کا ہے۔ جس نے اسے باجا خرید کے دیا۔"

اس روز محلے کی گھدیں دیر تک سر اٹھا کر پر پھڑ پھڑاتی رہیں۔ لیکن بالا سے کچھ کہنا ممکن بھی ہوتا؟ بڑی سے بڑی جھاڑ جھپٹ سن کر بالا ہنس دینے کا عادی تھا۔

"ہی ہی ہی ہی۔ چاچی سنا تم نے یہ توؤں والا باجا ہے۔ ہی ہی ہی۔ اچھا ہے نا۔ پورے دو سو میں لیا ہے اور یہ ریکارڈ جانکی بائی الہ آباد والی کا ہے۔ بڑا اچھا گاتی ہے۔ ماں جی ہی ہی۔" سنو تو ابھی اپنا نام بولے گی میں ہوں جانکی بائی الہ آباد والی۔ ہاں۔"

بالا کی بات پر بوڑھیوں کے ہونٹوں پر ہنسی آجاتی۔ "اے چھوڑو چاچی۔ اس لڑکے پر تو آسیب کا سایہ ہے ساری رات جنوں کی محفل لگی رہتی ہے اس کے تخت پر۔"

"ہاں ماں اس کے بس کی بات بھی ہو۔ انگلیاں تو سونگھو اس کی پلاؤ کی خوشبو آتی

ہے ہاں۔"

بالا کی جگہ اگر اور گراموفون خریدتا تو شاید اسے بجانے کی کبھی اجازت نہ ملتی۔ لیکن بالا کون روکتا۔ آسیب زدہ بالا کو محلے میں خصوصی درجہ حاصل تھا۔

بیاہ

بالا کے گراموفون کے ولاوہ کبھی کبھار بیاہ شادی کے موقعوں پر محلے کی فضا میں تبدیل واقع ہوتی' لیکن اس میں بھی آوازوں کی نوعیت نہ بدلتی تھی۔ ڈھولک تت وبجتی تھی اور ڈھولک کی ضرب میں جوان لڑکی کی مضطرب انگلیوں کی تڑپ بھی گونجتی لیکن گانے زیادہ تر بوڑھیاں ہی گاتیں اور ان کی دھنیں اس قسم کی ہوتیں۔ وہ گانے معلوم ہی نہ ہوتے تھے۔ انہیں سن کر محسوس ہوتا جیسے بہت سی چمگادڑیں بھیانک آواز میں چیخ رہی ہوں۔ جیسے کسی کی موت پر کوئی بین کر رہا ہو۔ دھیمی آواز میں لمبے سر گونجتے اور محلے کی فضا کو اور بھی تاریک کر دیتے۔

اگر کوئی نوجوان لڑکی کوئی گیت گانے کی کوشش کرتی تو اس کی آواز اس قدر بیگانی سنائی دیتی تھی کہ وہ جلد ہی شرما کر یا گھبرا کر اس ناکام کوشش کو چھوڑ دیتی اور بوڑھیاں اپنی عظمت کو از سر نو محسوس کر کے پھر سے لمبی اداس سروں میں رونے لگتیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود شادی کے موقع پر کچھ نہ کچھ تبدیل ضرور وقوع پذیر ہوتی۔ تا نک چندی دیواروں کی سیاہی گھل کر صاف ہو جاتی۔ کھڑکیوں میں سرخ دوپٹے لہراتے اور علی پور کا بینڈ باجا کچی حویلی میں نغمے بجاتا۔ اس رو محلے کے لڑکے بوڑھی گدھوں کے منحوس سائے کو اپنے سروں پر محسوس نہ کرتے۔ گیس کی روشنی میں لڑکوں کے رشمیں رومال لہراتے۔ سیاہ بودے چمکتے۔ جیبوں سے پریم سندیس۔ کتابیں باہر نکل آتیں لڑکوں کی نگاہیں کھڑکیوں کے اردگرد ناکام منڈلاتیں لیکن یہ سب باتیں بیکار تھیں۔ کیونکہ محلے کی لڑکیوں کی مجال نہ تھی کہ وہ کھڑکیوں یا دروازون میں آ کھڑی ہوں۔

لڑکے کچھ دینے کچھ لینے کچھ کہنے کے بہانے بیاہ والے گھر میں جا داخل ہوتے۔ تاریک ڈیوڑھیوں میں چھپ کر انتظار کرتے بھیڑ میں راستہ بنانے کے بہانے اندھیرے میں چٹکیاں بھرنے کی کوشش کرتے۔ اس افراتفری میں چوڑیاں کھنکتیں۔ مہندی والے ہاتھ کپڑوں میں لپٹ جاتے۔ جسم سمٹتے "ہائے میں مرگئی۔" کی نحیف آوازیں سنائی دیتیں۔ لیکن ان معمولی مگر دلچسپ باتوں کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا۔

بیاہ شادی کے موقع پر ایلی کے لئے گھر جانا مشکل ہو جاتا تھا۔ جب وہ اپنی اندھیری ڈیوڑھی میں پہنچتا تو ایک دھندلی سی شکل ڈیوڑھی کے کسی کونے سے نکل آتی۔ گھبرا کر وہ رک جاتا اور دھندلی شکل گھوم کر اس کا راستہ روک لیتی۔

"کون ہے؟" وہ چلاتا۔

بھدی سی ہنسی سنائی دیتی۔ "ڈر گئے۔" نذیراں کی آواز آتی اور وہ مڑ کر ڈیوڑھی سے باہر نکل جاتا اور ارجمند کو ڈھونڈ نکالتا۔

"ہیلو ایلی ہے۔" ارجمند چلاتا "سراسر بے معنی ہے۔ ایلی۔ برات والے گھر جانا بے معنی ہے۔ بیکار ہے میں نے چٹکی بھری تو ظالم کہنے لگی۔ کہوں چاچی سے۔ ہاتھ جوڑ کر جان چھڑائی پھر مسکرانے سے بھی باز نہیں آتیں۔ اگر واقع مکے سے حج کر کے آئی ہیں یہ لڑکیاں تو پھر دیکھ کر مسکراتی کیوں ہیں اور مسکراہٹ بھی خالص ڈسپنسری والی اور چٹکی بھرو تو چاچی سے کہہ گی۔ لاحول ولاقوۃ۔ چل کپ اور کیپ کی طرف چلیں۔ محلے سے بات نبتی ہے۔ آج بانسری پر ایک دھن سیکھ کر آیا ہوں۔ واہ کیا دھن ہے۔ بس سمجھ لو کچا دھاگا ہے جس سے سرکار بندھی آئے گی۔ آؤ سناؤں تمہیں۔"

نہ جانے کیوں ایلی نے نذیراں کی بات کبھی ارجمند سے نہ کی تھی۔ بلکہ وہ ڈرتا تھا کہ ارجمند کو نذیراں کی بات کا پتہ نہ چل جائے۔ تا کہ وہ رنگین انگر اینڈی ماباؤں کا کھیل حقیقت کا روپ نہ دھارے ایلی کو ہلتی ہوئی چقوں سے دلچسپی تھی۔ مسکراتے

ہوئی آنکھوں سے دلچسپی تھی۔ معنی خیز انداز سے حرکت کرتے ہاتھوں کو دیکھنے کا شوق تھا۔ لیکن عورت یا لڑکیوں کا قرب اس کے لئے سوہان روح تھا۔ اسے ڈر تھا کہ نذیراں کی بات سن کر ارجمند کی توجہ اس طرف منعطف ہو گئی تو وہ رنگینی ختم ہو جائے گی۔ اور نہ جانے کیا شروع ہو جائے۔ اس کے ذہن میں قرب کا مفہوم تاریکی تھا۔ پر اسرار خوفناک تاریکی۔

ایلی کے گھر میں تیاریاں ہونے لگیں۔ جانے کیا ہونے والا تھا۔ بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ لیکن کچھ ہونے والا ضرور تھا۔ اسی لئے تو علی احمد چھٹی لے کر علی پور آ گئے تھے۔ اور دادی اماں کو پاس بٹھا کر اس سے پوچھ پوچھ کر نہ جانے رجسٹر میں کیا لکھ رہے تھے اور ہاجرہ کوٹھری میں کھڑی رو رہی تھی۔ نہ جانے اسے کیا ہوا تھا۔ وہ یوں رونے کی عادی نہ تھی۔

علی احمد نے تو کبھی دادی اماں سے بات نہ کی تھی۔ ماں بیٹے اس مکان میں اجنبیوں کی طرح زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ دادی اماں سارا دن سیدہ کے قریب اکڑوں بیٹھی رہا کرتی تھی اور علی احمد اندر بیٹھ کر حقہ پیا کرتے تھے اور رجسٹروں میں لکھنے میں مصروف رہتے تھے دونوں کی آپس میں کبھی بات نہ ہوتی۔ ایلی اکثر حیران ہوا کرتا کہ یہ کیسے ماں بیٹے ہیں ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کرتے۔ اگر کوئی دادی اماں سے علی احمد کی شکایت کرتا تو وہ اطمینان سے جواب دیتیں۔ ”علی احمد کی تو عادت ہی ایسی ہے۔“ اور پھر مسکرا دیتیں جیسے اظہار ناراضگی کے باوجود انہیں علی احمد کی وہ بات پسند ہو اور علی احمد کبھی دادی اماں کو بلاتے بھی تو پوچھتے۔ ”بھئی وہ فلاں کام کرنا ہے کیا کیا رسمیں ادا کرنی ہوں گی۔“ اس کے سوا انہوں نے کبھی دادی اماں کو نہ بلایا تھا۔

اندر دادی اماں کپڑوں اور زیور کی بات کر رہی تھی نہ جانے کس کے کپڑوں اور زیور کی بات ہو رہی تھی۔ لیکن اماں ان کی بات سن سن کر رو کیوں رہی تھی۔ کپڑے

اور زیور کی بات پر رونے کا کیا مطلب۔ پھر اتفاق سے سعیدہ آ گئی اماں پھوٹ پڑیں۔

''لو لڑکی کی قسمت ہی پھوٹ گئی میں تو جانتی ہی تھی وہ اپنے رشتہ داروں کے گھر میری بچی پھینک دے گا۔ سو وہی ہوا۔ میری بچی کو فیروز کے بیٹے اجمل کے پلے باندھ رہے ہیں۔ ہائے میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔

اجمل ایلی کو پھوپھی کا لڑکا تھا وہی اجمل جو رہتک میں چند ایک ماہ کے لئے ان کے ہاں ٹھہرا تھا۔ جسے علی احمد نے بال بنانے اور بن ٹھن کر رہنے پر مار کر نکال دیا تھا۔ ایلی کو جبھی سے اجمل سے ہمدردی تھی۔ اس کی شکل وصورت بھی ایلی بہت بھاتی تھی اور پھر اس کا لڑکوں سے میل جول اور باہمی ربط بھی ایلی کو بے حد پسند تھا اور اب تو وہ بہت بڑا ہو چکا تھا اور وہ ایک سال ایران میں نوکری کرنے بعد لوٹا تھا۔ نہ جانے اماں کو اجمل کیوں ناپسند تھا نہ جانے اماں روتی کیوں تھیں۔ آخر اجمل میں کیا برائی تھی۔ اماں کا مسلسل روئے جانا ایلی کے لئے باعث حیرانی تھا! اماں بھی تو عجیب باتیں کیا کرتی تھیں۔ ایک طرف تو اس بات پر اس قدر نا خوش تھی اور دوسری طرف انتظامات میں مشغول تھی۔ جیسے بہت دلچسپی لے رہی ہو۔ فرحت کے کپڑے سیتی دولہا کی چیزیں بھی تیار کرتی جاتی۔ علی احمد کے احکامات بھی دوڑ دوڑ کر سنتی اور ساتھ ساتھ آنسو بھی چھلکائے جاتی۔ عجیب عادت تھی اماں کی پھر ہر آتی جاتی سے شکایت بھی کرتی جاتی کہ فرحت کا بیاہ زبردستی کیا جا رہا ہے۔

ادھر فرحت کو بھی احساس نہ تھا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے۔ فرحت کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی اس نے آٹھویں جماعت تک مدرسے میں تعلیم پائی تھی پھر علی احمد نے دفعتاً اعلان کر دیا تھا کہ اسے سکول جانے کی اجازت نہیں بچیوں کے لئے اتنی ہی تعلیم کافی ہے۔ اس پر فرحت پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی اور ہاجرہ نے اس کے ساتھ مل کر آنسو بہائے تھے۔

مگر علی احمد کا حکم اٹل تھا ان دونوں کے آنسو کام نہ آئے اور فرحت کی تعلیم کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ آٹھ سال سکول میں پڑھنے کے باوجود فرح ابھی بچی ہی تو تھی وہ اکثر محلے کے چوگان میں جا کر ککلی کلیر دی ناچتی رہتی۔ ساتھ ساتھ کچھ گنگناتی اور محلے کے بزرگ اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے۔ "فرحتو گھومنی۔" اور بوڑھیاں مسکرا کر کہتیں "فرحت تو فرحتو ہی رہی۔" ایلی نے کبھی محسوس نہ کیا تھا کہ فرحت بڑی ہو گئی ہے اسے بھی وہ فرحت ہی دکھائی دیتی تھی۔ اس میں عورت کا نام ونشان تک نہ تھا۔

اپنے بیاہ کی بات سن کر فرحت نے چوگان میں جانا بند کر دیا۔ اب وہ خالہ کے گھر بھی نہ جاتی تھی۔ لیکن اس تبدیلی کے باوجود اس میں وہ پیدا نہ ہوئی تھی جو جوان لڑکیوں میں ہوتی ہے۔

پھر وہ دن آ پہنچا جب ان کے گھر کے سامنے باجے بجنے لگے اور گھر میں مہمان آ جمع ہوئے اور ہاجرہ کام کاج میں اس قدر مصروف ہو گئی کہ آنسو بہانا بھی بھول گئی اور محلے کے لڑکوں نے بہانے بہانے ان کے گھر آنا شروع کر دیا اور برتن بجنے لگے۔ حنائی ہاتھ ریشمی دوپٹوں میں سے باہر نکلنے اور چھپنے لگے اور گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور بالآخر فرحت کو ڈولی میں بٹھا دیا گیا اور ایلی اور ہاجرہ دونوں ڈولی کے ساتھ ایک نئے گھر میں چلے گئے۔ یہ نیا گھر اجمل کا گھر تھا۔ چونکہ اجمل کی ماں مدت سے فوت ہو چکی تھی۔ اور بہنیں سب اپنے اپنے گھر اور بچوں والی تھیں اس لئے فرحت کی خدمت کرنے کے لئے خود ہاجرہ کو اجمل کے ہاں جانا پڑا۔

جمل کا گھر ایلی کے گھر کے پاس ہی تھا۔ چوگان کے شمال کی طرف ایک چھتی گلی، جسے گلیارہ کہتے تھے سے گزر کر ایک اندھیری ڈیوڑی کو پار کر کے اس نئے گھر کی سیڑھیاں آتی تھیں لیکن اس اندھیری ڈیوڑھی کو پار کرنا آسان نہ تھا۔ کیوں کہ دوپہر کی کڑکتی دھوپ میں بھی اس ڈیوڑھی میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ اس گھر کے ایک طرف ایلی کے ماموں حشمت علی رہتے تھے اور دوسری طرف اس کی خالہ کا

کنبہ آباد تھا۔ یہ تینوں گھر دراصل ایک ہی بڑی حویلی کے حصے تھے جسے کسی زمانے میں آصفی بزرگوں نے تعمیر کیا تھا۔ اگر چوبارے سے دیکھا جائے تو یہ نیا گھر علی احمد کے مکان سے ملحق تھا۔ درمیان میں صرف ایک چھت پڑتی تھی۔ اس لئے ایلی عام طور پر ملحقہ کوٹھے سے گزر کر دیوا پھاند کر نئے گھر چلا جایا کرتا تھا تاکہ اسے اندھیری ڈیوڑھی سے گزرنا نہ پڑے۔

اجمل کے والد کسی زمانے میں انکم ٹیکس کے دفتر میں افسر تھے اب بھی ان کے بشرے اور انداز سے تحکمانہ جاہ وجلال کے آثار ہویدا تھے ان کے چہرے پر حکومت اور صحت کی سرخی جھلکتی تھی۔ اگرچہ انہیں عہدہ چھوڑے کئی سال گزر چکے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ انہیں ایک طوائف جانکی سے محبت تھی۔ جس کے عشق میں انہوں نے سبھی کچھ کھو دیا تھا اور نوکری سے فارغ ہو کر جانکی کے یہاں جا مقیم ہوئے تھے۔ اجمل کی والدہ بھی عرصہ دراز سے لقمہ اجل ہو چکی تھیں۔ اجمل کی تین بہنیں بقید حیات تھیں۔ سیدہ' رابعہ اور انور' سیدہ نہ جانے کس سے بیاہی ہوئی تھی۔ مگر دادی کے پاس رہتی تھی۔ رابعہ ایلی کے خالہ زاد بھائی پرویز کی بیوی تھی اور انور کی شادی ہمدانی سے ہو چکی تھی جو کسی دور دراز مقام پر کسی مدرسے میں اتالیق تھے۔ ان حالت میں اجمل کا گھر ویران پڑا تھا۔ اس کے بیاہ اس کے والد آئے۔ بہنیں بھی اکٹھی ہوئیں لیکن جلد ہی وہ سب اپنے اپنے گھر لوٹ گئے اور اجمل کے گھر میں صرف فرحت ہاجرہ اور ایلی رہ گئے تھے۔ اسی لئے ایلی نے محسوس نہ کیا کہ وہ گھر بیگانہ ہے۔ اکثر وہ والدہ کے ساتھ وہیں رہتا۔ رابعہ سے باتیں کرتا رہتا یا پڑوس میں رفیق کے گھر چلا جاتا اور یا دوسری طرف پرویز کے والد محسن علی کے پاس جا بیٹھتا۔

''آؤ ایلی آؤ'' محسن اسے دیکھ کر چلاتے۔ ''کہو علی احمد کیسے ہیں۔ کوئی نئی شادی کرنے کی تو نہیں سوچ رہے۔'' اور وہ ہنسنے لگتے۔

ایلی کو محسن علی بے حد پسند تھے ان کی باتوں سے سچائی اور خلوص ٹپکتا تھا۔ بزرگ

ہونے کے باوجود ان میں تصنع نام کو نہ تھا۔ محسن علی کے مکان سے ملحق دلان میں پہلی مرتبہ اس کی ملاقات شریف سے ہوئی تھی۔

شریف

شریف ایک پتلا دبلا کمزور اور اداس شخص تھا۔ وہ چپ چاپ چارپائی پر بیٹھ کر حقہ پینے کا عادی تھا۔ دیوار سے لگائے کمبل اوڑھے وہ حقہ پینے میں مصروف رہتا۔ اس کی آنکھیں نہ جانے کہاں لگی رہتی تھیں جیسے کہیں لگی ہوں اور وہ خلا کو حسرت بھیر نگاہوں سے گھورتا رہتا۔ کچھ دیر کے بعد ایک موہوم سی آہ بھر کر ایک نگاہ غلط انداز سے گردوپیش کی طرف دیکھتا اور پھر اپنے بیابانے خیال میں لوٹ جاتا۔ اس کا سر دیوار پر ٹک جاتا اور نگاہیں اسی طرح خلا کو گھورنے لگتیں۔

''آؤ ایلی۔'' شریف نے اسے سرسری طور پر بلایا۔ ''بیٹھ جاؤ۔'' ایک نظر اس نے ایلی کی طرف دیکھا اس کی نگاہ میں عجیب سی شمک تھی جو آن کی آن میں لہرا کر غائب ہو جاتی تھی۔ اس ایک ہی چمک میں سب کچھ تھا۔ خلوص' محبت' سادگی۔ ناکامی' وہ چمک کبھی کبھی عیاں ہوتی تھی جیسے ابر آلود رات کو کبھی کبھار چاند ایک ساعت کے لئے مسکرا کر منہ چھپالیتا ہے۔

وہ ایک چمک نہ جانے ایلی سے کیا کہہ گئی۔ جیسے ہمیشہ کے لئے محبت کا پیان کر گئی۔ ایلی بیٹھ گیا۔ شریف بیگانہ ہونے کے باوجود بیگانہ محسوس نہ ہوتا تھا۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا اسے جیسے وہ شریف سے مدتوں سے واقف ہو۔ جیسے وہ دونوں پرانے دوست ہوں۔

''ایلی۔'' شریف نے آہ بھری'' کیا وہ ڈائن ابھی تک جیتی ہے بتا۔'' اس کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔

''ڈائن'' ایلی نے حیرانی سے دہرایا'' ہاں وہ بڑھیا۔ تمہاری دادی۔'' شریف نے کہا۔ ایلی کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔

"کیا وہ ڈائن کبھی نہ مرے گی۔ کیا وہ اسی طرح دوسروں کی زندگی تباہ کرتی رہے گی۔"

شریف کے چہرے سے حسرت و بربادی ٹپکتی تھی۔ ایلی کے دل میں شریف کے لئے جذبہ ہمدردی ابھر آیا۔ اس نے ان جانے میں محسوس کیا کہ شریف مظلوم تھا۔ اس پر ظلم توڑے گئے تھے۔

نہ جانے لوگ دادی اماں کو ڈائن کیوں کہا کرتے تھے نہ جانے صفدر اس کے سینے میں پٹاخے کیوں پھینکا کرتا تھا اور محلے کے تمام لڑکے اس سے خائف کیوں تھے۔ یہ تو ایک حقیقت تھی کہ وہ بچوں کا شور سن کر کھڑکی میں آ بیٹھتی اور انہیں جھاڑ جھپاڑ کیا کرتی تھی۔ لیکن صرف اس بات پر اسے ڈائن کہنا تو روا نہ تھا وہ اس کے کردار کے دوسرے پہلو سے کیوں واقف نہ تھے۔ انہیں اس کی بناوٹی تیوری کے نیچے دبی دبی مسکراہٹ کیوں نہ دکھائی دیتی تھی۔ ایلی کے کے لئے وہ بوڑھی ڈائن گھر کے پھیلے ہوئے صحرا میں واحد نخلستان تھی۔ محبت کا چھوٹا سا ڈھکا چھپا چشمہ جو شور مچا کر اپنے وجود کے اعلان کرنے کا عادی نہ تھا بلکہ چپ چاپ بے آواز بہے جاتا تھا۔

"نہیں۔ نہیں۔ وہ نہیں مرے گی۔" شریف نے یاس بھری نگاہ ایلی پر ڈالی۔ "ابھی اسے نہ جانے کن کن کے درمیان دیوار بننا ہے۔" شریف کی باتوں سے ظاہر تھا جیسے شریف کی زندگی تباہ کرنے میں صرف دادی اماں کا ہاتھ ہو مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ شریف کی زندگی کس اعتبار سے برباد ہو چکی تھی اس نے صرف یہ محسوس کیا کہ شریف اس چینی کی پیالی کی مانند تھا جس میں بال آ چکا ہو۔

پہلی ہی نشست میں ایلی شریف کا دوست بن گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ شریف کا رازدان ہے اگرچہ اسے شریف کے راز کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا۔

شریف سعیدہ کا دیور تھا اور جب کبھی علی پور آتا تو وہ سعیدہ کے یہاں ٹھہرتا کھیل و تفریح کی اس محفل میں جو اکثر سعیدہ کے یہاں لگتی تھی۔ شریف کی موجودگی عجیب سی

لگتی جیسے طربیہ راگ میں بے برجستہ سر لگا ہو۔ ایک بات بہرطور واضح تھی کہ شریف عشق کا مارا ہوا تھا۔ ایلی کو عشق کے مفہوم سے پورے طور پر واقفیت نہ تھی۔

عشق بھی عجیب چیز ہے۔ ایلی سوچتا جو شریف کی آنکھوں سے حزن و ملال بن کر جھلکتا ہے۔ صفدر کی آنکھوں سے رنگ کے چھینٹے بن کر اڑاتا ہے۔ اور ارجمند کی آنکھوں میں شرارت بن کر کوندتا ہے آخر یہ چیز کیا ہے۔؟

پھر احاطے کی بند کھڑکی سے دادی اماں کی آواز گونجتی۔ ''اے ہے آج تم نے یہ کیا محفل لگا رکھی ہے۔'' اور شریف سرد آہ بھر کر کہتا ''وہ گدھ بولی۔ چلا رہی ہے۔ اسے زندگی بھری آوازیں اچھی نہیں لگتیں اسے ویرانہ پسند ہے۔'' اس پر ہاجرہ خود کھڑکی کھول کر کہتی ''سعیدہ نے آج مولود شریف کروایا ہے۔'' یہ سن کر دادی اماں بڑبڑاتی ہوئی چلی جاتی۔ پھر سب کے اصرار پر سعیدہ ٹوپی پہن لیتی اور گانے لگتی۔ مدینے میں مورے سیاں بالا ہے رہے۔ نہ جانے اس تم نے یہ بول کہاں سے سن رکھے تھے۔

ایلی کو اس کا گانا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھ کر بغور سننے میں منہمک رہتا مگر بار بار اس کی توجہ شریف کی طرف منعطف ہو جاتی جو چارپائی پر بیٹھا حقہ تھامے بار بار آہیں بھرتا کروٹیں بدلتا اور محروم نگاہوں سے چھت کی طرف دیکھے جاتا۔

بکھری ہوئی کہانی

نئے گھر میں آنے سے ایلی کا دائرہ ملاقات وسیع ہو گیا تھا اس لحاظ سے وہ نیا گھر اس کے لئے باعث فرحت ثابت ہوا تھا۔ وہاں اسے بہت سے لوگوں سے ملنے کے مواقع میسر آتے رہتے تھے۔ سعیدہ اور شریف سے تو وہ روز ہی ملتا تھا۔ اسے شریف کے متعلق عجیب و غریب تفصیلات کا علم ہوتا جا رہا تھا۔ اکھڑے اکھڑے واقعات بکھری بکھری تفصیلات۔ محلے کی عورتیں بھی تو شریف کے متعلق دبی دبی آواز میں باتیں کیا کرتی تھیں۔ اگرچہ شریف میں وہ خصوصی دلچسپی نہیں لیتی تھیں۔ پھر بھی کبھی کبھار کوئی نہ کوئی بات منہ سے نکل ہی جاتی۔ سانپ تو گزر چکا تھا لیکن لکیر

ابھی باقی تھی اور محلّہ والیوں کو سانپ کی نسبت لکیر سے زیادہ دلچسپی تھی۔ جب ایلی کسی کے منہ سے شریف کے متعلق کوئی بات سنتا تو اس کے کان کھڑے ہو جاتے اور وہ اس بات کو احتیاط سے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا کرتا اور پھر جب وہ رات کے وقت بستر پر لیٹتا تو سنی ہوئی باتوں کے ٹکڑے جوڑنے میں مصروف ہو جاتا۔

سعیدہ آہ بھر کر بولی "شریف نے تو جان بوجھ کر اپنی زندگی تباہ کر رکھی ہے۔ جوانی کو روگ لگا رکھا ہے۔ ایسا بھی کیا کہ کوئی اپنا آپ تباہ کرے۔ لو خالہ بھلا اس بڑھیا سے توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ ہماری تکلیف کا احساس کرے وہ تو بلکہ ہماری بربادی میں خوش ہے۔ اسے تو موقع ہاتھ آیا تھا اور اب کان پکڑوا کر میاں رانجھا بنا بیٹھا ہے۔ ہر وقت اپنی ہیر کے خیال میں غرق رہتا ہے اور کھیڑے ہیر کو کب سے لے بھی گئے بات ختم ہو چکی۔ لیکن اس نے اپنی زندگی تباہ کر رکھی ہے۔ اسے کون سمجھائے۔"

رابعہ بولی "ویسے نام کا شریف ہے لیکن کرتوت دیکھو۔ خواہ مخواہ اس بھولی بھالی لڑکی کو بھر ما لیا۔ اس بیچاری موصوم کو کیا پتہ تھا کہ یہ چال صرف اسے بدنام کرنے کے لئے چلی جا رہی ہے۔ بیچاری کو کیا پتہ تھا کہ اس کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگانے کے لئے یہ کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ توبہ ہے ہم تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ وہ تو دادی اماں نے بچا لیا ورنہ جانے کیا ہوتا۔"

چچی کہنے لگی۔ "بہن آہستہ بات کر۔ یہاں تو عشق لگا ہوا ہے۔ اس شریفے کو دیکھا ہے نے یہ تو پاگل ہو رہا ہے اس کے عشق میں۔ اس لڑکی نے پاگل کر دیا ہے سامنے کھڑی ہو ہو کے۔ دیوانی ہو رہی تھی وہ تو نہ کسی کی شرم نہ لحاظ اور اب اب یہ لڑکا کسی کو گھر بسائے گا کیا اونھوں توبہ ہے۔ بہن دیکھ لو اپنی بیوی کو رلا رلا کے مار دیا۔ بیچاری کی خبر تک نہ پوچھی۔ اب اسے کون دے گا اپنی لڑکی۔ اسے تو انوری کی دھن لگی ہے۔ سارا دن آہیں بھرتا رہتا ہے اور آنکھیں موند کر پڑا رہتا ہے اسے تو انوری کھا گئی اے ہے۔ کیسا جوان نکلا تھا۔ پر اب تو دیکھا ہی ہے نا تو نے۔"

دادی اماں نے ایلی کو پاس بٹھالیا "اے ہے ایلی اب تو ادھر آتا ہی نہیں ایسا ہی جی لگ گیا ہے تیرا اس گھر میں۔ اللہ رکھے یہ تیرا اپنا گھر ہے۔ لوگ اپنے ہی گھر میں رہتے اچھے لگتے ہیں۔ ایلی تو ادھر نہ جایا کر۔ شریف کی بری صحبت میں نہ بیٹھا کر سنا تو نے۔ چھوڑ اس کلموہے کو۔ مرتا بھی نہیں۔ وہ تو ہمارا دشمن ہے۔ دشمن نے ہماری عزت کو تباہ کر کے رکھ دیا"۔

شریف نے آہ بھر کر کہا "لاہور جاؤ گے ایلی۔" اس نے چھت کی طرف دیکھ کر ایک لمبی آہ بھری۔ "اس شہر میں رہو گے تم۔ جہاں وہ رہتی ہے۔ آہ۔ اس کے قریب رہو گے۔ اس سے ملنے جایا کرو گے کتنے خوش نصیب ہو تو۔ انہوں نے اسے زبردستی ہمدانی سے بیاہ دیا۔ زبردستی اسے ڈولی میں ڈال دیا۔ روتی چیختی چلاتی ہوئی کو ڈولی میں ڈال دیا ایلی ان ڈائنوں نے اسے جیتے جی مار دیا۔ لیکن پھر بھی وہ میری ہے اس کی منور روشنی میرے لئے ہی مخصوص ہے۔ کتنی وفا ہے اس میں، کتنی پاکیزگی ہے۔ تم وہاں رہو گے جہاں وہ رہتی ہے۔ کتنے خوش نصیب ہو تم۔" اس نے لمبی آہ بھری اور آنکھیں موند لیں۔

محلے میں شریف کی داستان کے ٹکڑے جا بجا بکھرے تھے اور ایلی انہیں جوڑنے میں مصروف تھا۔ نہ جانے انوری کون تھا۔ جس سے شریف کو عشق تھا نہ جانے وہ حسینہ کون تھی۔ جس نے خاندانی کے ننگ و ناموس کو تباہ کر دیا تھا۔ بہر حال اسیشریف سے ہمدردی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ شریف اسے اپنا قصہ سنائے مگر شریف کے سامنے اس خواہش کا اظہار کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ بہر حال شریف کی آنکھوں کی چمک اور اس کا دکھی انداز ززا سے بے حد پیارے معلوم ہوتے تھے۔

ظاہر تھا کہ شریف اپنے گزشتہ ناکام عشق کی محرومی میں ابھی تک ڈوبا ہوا تھا اس نے شادی بھی کی تھی مگر اس کی بیوی شریف کے گھر کے ویرانے میں رہ کر تپ دق کا شکار ہو کر مر گئی تھی یہ کوائف تو ایلی کو معلوم تھے۔ مگر ان جزئیات سے کیا ہوتا ہے اسے

توکل سے دلچسپی تھی۔

یر وقت حقے کی نلی منہ میں دبائے شریف دیوار سے ٹیک لگائے چھت کو گھورتا رہتا اور ساتھ ساتھ موہوم آہیں بھرتا اس کی آنکھیں ایک عجیب وغریب خمار سے چھلکتیں اور اس کے منہ سے رال گرتی رہتی۔ "آؤ ایلی بیٹھ جاؤ۔" وہ ایلی کی طرف دیکھ کر اسی محروم انداز سے کہتا اور پھر ایلی کی موجودگی سے بے نیاز ہو کر اسی طرح دیوار سے ٹیک لگا کر چھت کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے میں کھو جاتا۔ ایلی بیٹھے بیٹھے کسی نامعلوم جذبہ کی شدت سے بھیگ جاتا۔ وہ محسوس کرتا جیسے وہ کمرہ شریف کے خلوص سے بھرا ہوا ہو۔ جیسے کمرے کی دیواریں احساس احترام سے کھڑی ہو گئی ہوں۔ جیسے کھڑکیاں منہ کھولے حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی ہوں۔

شریف کی آمد سے ایلی کو انگر اینڈ کی ماباؤں سے خاص دلچسپی نہ رہی تھی وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ زندگی کی سب سے بڑی عظمت عشق ہے۔ پاکیزہ عشق۔ محروم عشق اور چلتی لڑکیوں کو دیکھنا تو بچوں کا کھیل ہے۔ اگرچہ اسے معلوم نہ تھا کہ عشق کا مطلب کیا ہے۔ مرد عورت سے کیاں محبت کرتا ہے مگر نہ جانے کیسے اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ عشق سے بڑھ کر اور کوئی چیز قابل حصول نہیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کس سے عشق کرے۔ کیسے عشق کرے لیکن ان دنوں اس کی سب سے بڑی تمنا یہی تھی کہ وہ کسی سے عشق شروع کر دے اور پھر ناکام ہو کر شریف کی سی جاذبیت پیدا کر لے اور دیوار سے ٹیک لگا کر چھت کو گھورنے میں زندگی صرف کر دے۔ اسے شریف کی زندگی کا یہ پہلو بے حد پیارا لگتا تھا لیکن اس سے ہٹ کر شریف کی باقی ماندہ شخصیت سے اسے گھن آتی تھی۔ مثلاً شریف کا ڈھیلا ڈھالا پن۔ اس کی چال ڈھال اسے قطعی پسند نہ تھے اور اس کے منہ سے رال سی ٹپکتی دیکھ کر تو وہ کراہت سے منہ موڑ لیتا تھا۔ اس کے لئے شریف کی تین خصوصیات بے حد پیاری تھیں۔ شریف کی محبت بھری نگاہیں، غمناک نگاہیں جن میں ایک مٹھاس اور محرومیت بھرا نشہ رواں

دواں رہتا تھا۔شریف کے بے پناہ خلوص اور شریف کی دوست نوازی ـــــــــ

حاجی شریف کی رخصت ختم ہو گئی اور وہ واپس اپنی نوکری پر چلا گیا۔شریف کے جانے کے بعد ایلی کئی ایک دن اکھڑا اکھڑا رہا۔ارجمند کے اسرار کے باوجود کیپ اور کپ کی طرف متوجہ نہ ہوا نہ ہی اس نے انگرا یندی ماباؤں کے کھیل میں حصہ لیا۔ اسے صرف ایک دھن لگی تھی کہ وہ کسی سے باقاعدہ عشق کرے کسی سے عہد و پیان کرے اور پھر اسے نبھانے کے لئے زندگی وقف کر دے۔لیکن کوئی بھی تو نہ تھی جو اس سے عہد و پیان کرنے پا مائل نظر آتی ہو کوئی اسے خاطر میں نہ لاتی تھی۔بڑی عورتیں اسے قابل التفات نہ سمجھتی تھیں اور چھوٹی لڑکیوں میں اسے خود کوئی دلچسپی نہ تھی۔

بہر حال کچھ دیر کے بعد ہی شریف کا وہ اثر معدوم ہو گیا اور ایلی پھر سے ارجمند کے ساتھ کھیل میں حصہ لینے لگا۔لیکن یہ شمولیت محض ایک فریب تھا ایک دکھاوا تھا دراصل ایلی کی عشق کرنے کی خواہش سمٹ کر اس کے دل کی گہرائیوں میں بیٹھ گئی تھی۔

میٹریکولیشن

پھر دسویں کے امتحانات قریب آ گئے اور ایلی کی توجہ اس طرف مبذول ہو گئی اور وہ پھر بام آباد کیلئے عازم سفر ہو گئے۔بام آباد پہنچ کر آہستہ آہستہ شریف اس کے ذہن سے خارج ہو گیا۔با آباد میں اب وہ اکیلے نہ تھے۔ان کے ساتھ شمیم تھی۔اس کے حنا مالیدہ ہاتھ۔فیروزی چادر اور چٹے سفید چوڑے چہرے سے سارا گھر بھرا ہوا تھا کبھی کبھار اس کے حنا مالیدہ ہاتھوں کو دیکھ کر ایلی محسوس کرتا جیسے صفیہ پھر سے جی اٹھی ہو۔اس خیال پر وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔شمیم کے خوابیدہ چہرے کو دیکھ کر۔اس کی نیم مردہ آنکھوں کو دیکھ کر جن میں عجیب سی بے ربطی تھی' ایلی مایوس ہو جاتا "نہیں یہ صفیہ تو نہیں۔اس میں وہ بات ہی نہیں۔" اس احساس کو شدت سے محسوس کر کے ایلی کی

نگاہ میں شمیم کے ہاتھوں کا رنگ اڑ جاتا اور اسے محسوس ہوتا جیسے وہ ہاتھ سفید نہیں بلکہ پیلے ہیں اور وہ پیلا پن رنگ کی وجہ سے نہیں بلکہ بے جان ہونے کی وجہ سے ہے۔
اس کے بعد اس کیلئے گھر میں رہنا مشکل ہو جاتا اور وہ باہر گھنشام اور ایشور لال کی طرف نکل جاتا اور پڑھنے کے بہانے ان دونوں کو دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتا رہتا اور یہ محسوس کرنے کی کوشش کرتا کہ اسے ان سے عشق ہے عشق پیارا۔ دن وہ ایشور لال یا گھنشام کے پاس گزارتا اور پھر شام کو کتابیں اٹھا کر گھر کی طرف چل پڑتا۔
گھر کے قریب پہنچتے ہی وہ رک جاتا۔ کہیں علی احمد نہ دیکھ لیں کہیں وہ نہ پوچھ لیں کہ تم نے آج کیا پڑھا علی احمد کا ڈر اس کے دل پر بوجھ بن جاتا حالانکہ گھر میں علی احمد نے اسے کبھی کچھ نہ کہا تھا۔ کبھی چلم بھرنے کیلئے اسے بلاتے یا بازار سے سودا لانا ہوتو اسے آواز دیتے اور یا کبھی مہرباں ہوتے تو دونوں انگلیوں میں گوشت کا ٹکڑا یا کوئی اور کھانے کی چیز پکڑ کر چلاتے "ایلی یہ لے۔ ایلی۔" اس کے علاوہ کبھی ایلی کی بلی نہ ہوئی تھی اور نہ ہی انہوں نے محسوس کیا تھا کہ وہاں کے قریب چند ایک گز کے فاصلے پر ایک لڑکا ایلی بھی رہتا تھا۔
شمیم کے آنے کے بعد چند ایک دن کے لئے تو علی احمد کے کمرے میں شمیم شمیم کی آوازیں گونجتی رہیں اور شمیم کی آواز مدھم سرگوشیاں کرتی رہی۔ پھر وہ سرگوشیاں معدوم ہوتی گئیں اور بالآخر ایلی کو اس کمرے سے سسکیاں سنائی دینے لگیں اور شمیم کا انداز محرومیت کا غماز ہوتا گیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑتی گئی اور علی احمد کی کھنکھار میں درشتی کا انداز واضح ہوتا گیا۔ جلد ہی کور پھر سے آموجود ہوئی اور بند کمرے کے پیچھے اس کے دانت چمکنے لگے۔ "بابو جی کے مزاج ٹھیک ہونے والے ہیں۔ وہ پنکھے کی رسی گھما کر کہتی اور شمیم باورچی خانے میں حیران نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتی جیسے کہیں کھوگئی ہو۔ جیسے اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ کیا ہو رہا ہے۔" اس پر دوسرے کمرے میں ہاجرہ کے ساتھ بیٹھی ہوئی رفیقاں مسکراتی اور اپنا بدن سیکڑ کر

ہاجرہ سے کہتی ''ہائے اب کیا ہو گا۔'' اور ایلی غصے سے کھولتا اور اس کا جی چاہتا کہ چلا چلا کر کہے ''اب میں دسویں جماعت میں ہوں۔ اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔ اب میں دیکھوں گا کہ یہاں کون آتی ہے۔''

''ایلی کور کے لئے پانی لاؤ۔ ایلی'' علی احمد کی کھنکھار سن کر اس پر سکتے کا عالم چھا جاتا۔ جسم پر سوئیاں سی چلنے لگتیں اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ______ ''آیا جی۔'' اس وقت وہ یہ حقیقت بھول جاتا کہ وہ دسویں میں ہے اور گھر میں عورتوں کا آنا جانا برداشت نہیں کر سکتا اور وہ بوتل اٹھا کر باہر نکل جاتا۔

کنوئیں کے پاس پہنچ کر اس کے حواس درست ہوتے۔ دھند لکا دور ہو جاتا اور شمیم حنا مالیدہ ہاتھ فضا میں لٹکتے دکھائی دیتے اور اس کی آنکھوں کا فرق اس قدر نمایاں ہو جاتا کہ وہ چونک پڑتا اور محسوس کرتا۔ جیسے وہ ایلی کی مدد مانگ رہی ہو۔ جیسے وہ ایلی کی پناہ لے رہی ہو۔ اس خیال پر وہ کنوئیں پر بوتل رکھ کر سیدھا کھڑا ہو جاتا۔ ''میں دسویں جماعت میں ہوں۔ میں اب بچہ نہیں دیکھوں گا اس گھر کون کون ناپاک کرتا ہے۔'' پاؤں کی ٹھوکر سے وہ بوتل کو گرا دیتا جو کنوئیں کی مندیر پر لڑھک لڑھک کر نیچے جا گرتی ''مجھے دسیوں پاس کرنا ہے۔ مجھے ضرور دسویں پاس کرنا چاہئے۔ ورنہ یہ گھر کبھی پاک صاف نہ ہو سکے گا۔ مجھے دسویں پاس کرنا ہی ہو گا۔''

اگر ایلی کو گھر کی ناپاکی کا خیال نہ ہوتا اگر شمیم کے حنا مالید ہاتھ اس کے سامنے فضا میں محرومیت سے نہ لٹکتے اگر کور کے سفید دانتوں سے اسے شدید نفرت نہ ہوتی تو شاید ایلی کبھی دسویں پاس کرنے میں کامیاب نہ ہوتا۔ سکول میں وہ ایک نالائق لڑکا تھا نہ تو اسے پڑھنے کا شوق تھا نہ وہ ذہین تھا جماعت کے لڑکے اس کی باتوں پر ہنسا کرتے تھے اور استاد اس کی نالائقی پر قہقہے لگایا کرتے تھے۔

جوں جوں امتحان قریب آتا گیا' شمیم کی نگاہیں اور بھی محروم ہوتی گئیں۔ کور کے دانت اور بھی چمکیلے ہوتے گئے۔ علی احمد کی کھنکھار میں اور بھی درشتی پیدا ہوتی گئی اور

ایلی کا عزم اور بھی تقویت حاصل کرتا گیا۔ اب وہ رات کو چپکے سے کتاب لے کر بیٹھ جاتا اور چور چورے اسے یاد کرتا رہتا۔ علی احمد کی الماری میں بہت سی کتابیں تھیں۔ گرائمر، یوسج، پریپوزیشنز، ہر چیز پر علیحدہ کتاب تھی اور وہ باری باری انہیں الماری میں سے نکالتا اور چوری چوری پڑھتا۔

اس کے باوجود وہ امتحا کا نتیجہ سن کر حیران رہ گیا اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ پاس ہو چکا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اس نے پرچے بھی تو اچھے نہ کیے تھے لیکن زیادہ تعجب کن بات یہ تھی کہ دسویں جماعت پاس کرنے کے باوجود وہ وہی ایلی تھا۔ جیسے پہلے تھا۔ اس میں ذرا بھی تو فرق نہ آیا تھا کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ علی احمد کی کھنکھار سن کر اس کا حلق ویسے ہی سوکھ جاتا تھا اور جسم پر ویسے ہی چیونٹیاں رینگنے لگتی تھیں اور جی ہاں کہہ کر وہ اسی طرح بوتل اٹھا کر کنوئیں کی طرف چل پڑتا تھا۔ اس کی آنکھوں تلے شمیم کے حنا مالیدہ ہاتھ اسی برح بے بسی سے لٹکتے تھے۔ اس کے سوا وہ کیا کر سکتا تھا کہ کور کی بوتل کو ٹھوکر مار کر گرا دے اور کور کی بوتل میں تھوک دے۔

دسویں پاس کرنے کے بعد وہ علی پور آ گیا اور پھر دادی اماں کے پاس رہنے لگا۔ دادی اماں کے پاس رہنے میں کس قدر آرام تھا۔ اسے نماز پڑھتے اور تسبیح کے دانے پھیرتے دیکھ کر اس کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ دادی اماں کا گھر کس قدر پاکیزہ تھا۔

دادی اماں کے گھر کی پاکیزگی پر مسرور ہونے کے باوجود وہ ارجمند سے انگرا یندی ماباؤں میں مصروف ہو جاتا اور جب وہ کنوئیں کے پاس جا کر ریشمی رومال ہلاتے اور بانسری بجاتے تو کیپ کی کھڑکی کی چق میں ہلکی سی لرزش پیدا ہو جاتی۔ ایک آنکھ ابھرتی مگر ایلی کو نہ جانے کیوں کیپ سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ اس کے ذہن میں تو حنائی ہاتھ رقصاں تھے۔ اگرچہ حنا کا رنگ دیکھ کر اور اس کی بو محسوس کر کے اس کی طبیعت مالش کرنے لگتی تھی اور جسم کا بند بند لرز جاتا تھا۔ پھر نہ جانے کیوں اس کے

ون میں حنائی ہاتھ لڑکتے تھے۔ اس کی جانب بڑھتے ۔ وہ گھبرا کر سمٹتا اور پھر ایک جھرجھری اسے جھجھوڑتی ایک ہوائی سی چل جاتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہےکیوں۔ اس کا دل چور چوری خواہش کرتا کہ کہ وہ ہاتھ اسے تھپک تھپک تھپک کر سلا دیں اور ایک بھرا ہوا جسم اس پر جھک جائے۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ کیپ کی بجائے کوئی بڑے سے جسم اور گدے جیسے گول گول رنگین ہاتھوں والی اس چق کے پیچھے کھڑی ہو اور وہ محسوس کرے کہ ایلی اس کی طرف دیکھ رہا ہے لیکن بھرے جسم والیاں تو اسے خاطر ہی میں نہ لاتی تھیں نہ جانے کیا سوچتی رہتی تھیں وہ ایلی۔ چوری چوری ان کی طرف دیکھتا اور پھر گھبرا کر ان کے ہاتھوں کی طرف دیکھتا اور بالآخر ان کے پاؤں کو گھورتا لیکن انہیں احساس ہی نہ ہوتا کہ کوئی دیکھ رہا ہے کن نظروں سے دیکھ رہا ہے انہیں کام کاج سے اتنی فرصت ہی نہ ہوتی کہ ایلی کی نگاہوں یا اس کی موجودگی کو محسوس کریں۔ ایلی چاہتا تھا کہ وہ اس کی موجودگی کو محسوس کریں۔ ایلی چاہتا تھا کہ وہ اس کی نگاہوں کو محسوس کر کے لے جائیں۔ اپنا آپ سمیٹیں۔

ہاکی سٹک

اسے چپ دیکھ کر دادی اماں چلائی۔ "ایلی کیا ہے تجھے یوں گم سم بیٹھ رہتا ہے تو نہ جانے کیا ہو گیا ہے تجھے یا تو سارا دن اللہ مارے لڑکوں کے ساتھ لگا رہتا ہے یا گھر میں آ کر یوں گم سم بیٹھ رہتا ہے۔" ایلی یہ سن کر دادی اماں سے لپٹ جاتا۔ انہیں دیکھ کر سر گھٹنوں میں دے کر مسکراتی اور دادی اماں چیختی۔ "ات ہے اب تجھ سے لڑائی کون لڑے توبہ ____ کتنا بڑا ہو گیا ہے تو ____ ابھی کل اتنا سا تھا اور آج دیکھو ____ شرم تو نہیں آتی۔ تجھے بوڑھی جان کی ہڈیاں توڑتے ہوئے۔ جا ____ کھیل جا کے اس سے تو کھیلنا ہی اچھا۔"

دادی اماں کو چھوڑ کر وہ سیدھا رضا کی دوکان پر جا پہنچا۔ اب رضا اس کا دوست

بن چکا تھا۔ رضا کی دوکان محلے کے اونچے بازار میں تھی میلے سے دروازوں کے پاس دھندلی دیواروں کے درمیان کئی ایک گتے کے ڈبے رکھے ہوئے تھے جب میں مختلف اشیاء پڑی تھیں۔ ایک میں ربڑ کے گیند تھے ایک میں بچوں کے چوسنے کی مٹھائی۔ ایک میں لڑکیوں کے بالوں کے لئے پنیں اور کلپ تھے۔ دو ایک گتوں پر چمکدار بٹن لگے ہوئے تھے ایک گتے پر لوہے کی چیونٹیاں چمٹی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں مٹی اور ربڑ کے چند کھلونے رکھے ہوئے تھے۔ ان ڈبوں کے پاس رضا بوریئے پر بیٹھا رہتا تھا۔ جس کے قریب ہی اس کا پکڑ کر چلنے والا سونٹا پڑا ہوتا تھا اور سونٹے کے پاس اس کا مضحکہ خیز جوتا۔ اس جوتے کو دیکھ کر خواہ مخواہ ہنسی آجاتی کیونکہ اس کا ایک پاؤں تو عام جوتے کے سائز کا تھا اور دوسرا ٹیڑھا اور بچگانہ۔ رضا کی ٹانگوں کو دیکھ کر ایک ساعت کے لئے ہر نوارد چونکتا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے اپنی ٹانگ کے پاس اس نے لکڑی کی ایک مڑی ہوئی کھونٹی ڈال رکھی ہو۔ لوگوں کو اپنی ٹانگ کی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر وہ چلاتا۔ "میری طرف دیکھئے بابو جی۔ میری برف۔ یہ کھونٹی بکاؤ نہیں۔" اور پھر منہ پکا کر لیتا یا ہنس کر کہتا "پسند ہے یہ تو ایک تم کو بھی دلا دوں۔" رضا اپنی لنگڑی ٹانگ پر شرمندگی محسوس کرنے کے بجائے فخر محسوس کرتا تھا "یار" وہ دوستوں کے درمیان کھونٹے کے سہارے کھڑا ہو کر لنگڑی ٹانگ کو گھما کر کہتا "اللہ میاں نے مجھے تو ایک ہاکی دے رکھی ہے کیا سمجھا ہے تم نے اسے کسی سے لڑتے وقت رضا کو اپنے حریف کو پچھاڑتے ہوئے دیکھ کر ایسا محسوس کرتا جیسے لنگڑا ہونا خصوصی نعمت ہو۔ رضا یوں حریف سے چمٹ جاتا۔ جیسے جزیرے کا بڈھا پیر تسمہ پا ہو اور پھر اس مڑی ہوئی کھونٹی سے واقعی یوں کام لیتا گویا وہ ہاکی سٹک ہو۔

لیکن رضا طبعاً لڑنے سے گریز کرتا تھا ہر بات کو مذاق میں اڑا دینے کی قابلیت گویا اس نے ورثے میں پائی تھی اور پھر اس کی باتیں سن سن کر محلے کے لڑکے ہنس

ہنس کر پاگل ہو جایا کرتے تھے۔

ایلی رضا کے پاس جاتا تو وہ اٹھ بیٹھتا " آؤ ایلی آؤ۔ میاں بیٹھو" وہ دکان کے اندر ایک بوریاں بچھا دیتا۔ "تاش کھیلیں۔ سیر کرو گے تو چلتے ہیں دکان بند کر کے چلتے ہیں۔ چلو۔"

"نہیں۔ نہیں۔" ایلی چلاتا "میں تو ویسے ہی آیا تھا بیٹھنے کے لئے۔"

"اچھا تو ٹھیک ہے۔" اور وہ دونوں بیٹھ جاتے انہیں پاس بیٹھ کر باتیں کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ چپ چاپ دونوں بیٹھے رہتے اور رضا حسب معمولی ساتھ والے حکیم تمباکو فروش اور بیڑی فروش پر پھبتیاں کستا رہتا اور ایلی ہنستا رہتا۔ پھر جمیل ادھر نکلتا۔

"اے بھائی جمیل۔ جمیل۔ کہاں جا رہے ہو۔" رضا چلاتا۔ "کچھ مٹھائی فنڈ ہے نا آج چلو ہم بھی چلتے ہیں۔ ایلی بھی بیٹھا ہے۔ میاں اندر دکان میں ہے۔"

مٹھائی فنڈ کا نام سن کر جمیل غصے سے گھونسہ گھماتا۔ "لنگڑے دوسری ٹانگ کی خیریت نہیں چاہیے۔" جمیل اندر داخل ہوتا۔

پھر وہ تاش کی بازی شروع کر دیتے اور دیر تک تاش کھیلتے رہتے۔ حتیٰ کہ کوئی آ کر ایلی کو خبردار کر دیتا کہ دادی اماں کھڑکی میں بیٹھی ہر آتے جاتے سے اس کے متعلق پوچھ رہی ہے اور محلے کے تمام لڑکوں کو گالیاں دے رہی ہے۔ پھر ایلی چپ چاپ اٹھ کر گھر کی طرف چل پڑتا۔

راستے میں کنوئیں کے قریب یا لالٹین کے پاس ارجمند اسے دیکھ کر چلاتا۔

"ارے یار غضب ہو گیا۔ ایلی آج تو وہ ہمارے گھر آ گئی۔ ظالم نے نیلا سوٹ پہن رکھا تھا۔ نیلا سوٹ اور سفید رنگ۔ توبہ ہے۔"

"میں ذرا گھر جا رہا ہوں۔" ایلی جواب دیتا۔

"پاگل ہو۔" ارجمند چلاتا " آج ____ اور گھر وہی بات ہوئی آج ہی گھر میں

بوریا نہ ہوا۔ بھئی آج خاص دن ہے۔ آج نہیں جا سکتے تم تمہیں پتہ نہیں اس کی سہیلی آئی ہوئی ہے۔ وہ دیکھو وہ ______ سبحان اللہ کیا سہیلی ہے۔ کمبخت۔ اندر کا اکھاڑا بنا ہوا ہے۔ یہ گھر آج آیا۔ وہ دیکھو۔ چاند سا مکھڑا نکل آیا۔ ذرا چق اٹھا کہ میری جان۔ منہ دھوئے بغیر کیا پھبن ہے "جلم کریں توری اکھیاں۔"

نہ جانے کیوں ایلیجمیں محسوس کرنے لگا تھا کہ ارجمند محض گڑیوں کا کھیل کھیل رہا ہے۔ بے جان گڑیاں جو لجاتیں جھنپتیں ظاہر ہوتیں اور چھپ جاتیں اور پھر کھلکھلا کر ہنستیں اور چلا چلا کر باتیں کرتیں۔ اس وقت ایلی کی نگاہوں تلے دو بھرے بھرے بازو لٹکتے۔ مخروطی بانہوں کی جاذبیت فضا پر چھا جاتی۔ اور بھرے بھرے جسم میں خاموش بجلیاں سی رواں دواں ہوتیں۔

یوں محلے میں صبح سے شام ہو جاتی اور رات کو بستر پر پڑے پڑے وہ سوچتا۔ کس سے عشق کروں۔ کس سے۔

شہزاد

لاہور

ایلی کو علی پور میں رہتے ہوئے ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ علی احمد آ گئے اور آتے ہی بولے ''ایلی کالج میں داخل ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ کل ہم جا رہے ہیں۔'' ایلی کے جسم میں ایک ہوائی سی چھوٹ گئی۔ لاہور وہ لاہور جہاں وہ اپنے ماموں قیوم کے ساتھ گیا تھا وہاں پیسہ اخبار محلے میں جہاں قیوم رہتا تھا۔

شام کے وقت جب قیوم اسے ٹانگے میں بٹھا کر سیر کو لے گیا تھا۔ سفید گھوڑی والا تانگہ جس کا کوچوان بوڑھا ہونے کے باوجود اس قدر زندہ دل تھا ''موتی بیٹی۔ آج بابو جی کو سیل کرانا ہے ____ چل بیٹی دولہن کی چال چلو۔ چل۔'' اور موتی یوں چلنے لگی تھی جیسے اس کی ٹانگوں تلے چھوٹے چھوٹے پہیے لگے ہوئے ہوں۔ گردن کے بال لہرا رہے تھے۔ نیچے سڑک پانی کے دھارے کی طرح بہہ رہی تھی اور یہ دھارا چوڑا ہوتا جا رہا تھا اور چوڑا۔ اور چوڑا۔ سڑک دونوں کناروں پر سرسبز درخت اور اونچی عمارتیں ناچ رہی تھیں۔

پھر مکانات اور عمارتیں کم ہوتے گئے۔ ان کی جگہ دونوں طرف گھاس کے سبز قطعے پھیل گئے جن میں سے رنگ رنگ کے پھول سر اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگے۔ سرسبز درخت جھوم رہے تھے خاکستری ٹیلے لڑھک رہے تھے۔ سڑک بھورے فیتے کی طرح چل رہی تھی۔ سبز خمیدہ کھمبوں پر بتیاں یوں ٹمٹما رہی تھیں جیسے جگنوں چمک رہے ہوں ____ وہ لاہور!

لاہور کا نام سنتے ہی وہ اٹھ بھاگا۔ ''دادی اماں میری قمیص کہاں ہے دادی اماں میرا جوتا ____ '' دادی اماں پوچھ رہی تھیں۔ ''لڑکے میٹھی روٹیاں پکا دوں تجھے۔ ساتھ لے جانا اسے ہے گاڑی میں بھوک لگے گی تو کیا کرے گا۔''

چند ایک گھنٹوں میں ایلی کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ اس کے پاس تھا ہی کیا کہ سنبھا

لنے میں دیر لگتی۔ دو قمیص چار ایک پاجامے ایک پرانا کوٹ اور ایک گھسا ہوا جوتا۔

لاہور پہنچ کر علی احمد نے اسے تانگے پر بٹھایا وہ تانگہ انہیں گندے اور بھیڑ سے بھرے بازاروں میں سے گھماتا ہوا بھاٹی دروازے لے گیا۔ یہ کیسا لاہور تھا۔ کیا یہ وہی لاہور تھا۔ جہاں موتی نے اسے سیر کرائی تھی۔ یہ لاہور اس لاہور سے کس قدر مختلف تھا۔

ایلی کی سمجھ میں نہ آیا پھر بھی اسے تسلی تھی کہ وہ لاہور آ گیا ہے اب اسے گھر میں دبک کر رہنے کی کوفت سے نجات مل جائے گی۔ اب اس سے کوئی نہ کہے گا ''ایلی حقہ بھر دو'' اب اسے کنوئیں سے بوتل میں پانی بھرنا نہیں پڑے گا اور علی احمد کا کمرہ دور ہو گا۔ بہت دور ____ اب کوئی آ ساحن میں بیٹھ کر تنکے سے زمین پر لکھنے میں مصروف دکھائی نہ دے گا اور نیم وا دروازے سے رضامندی بھرے سفید دانت نہ چمکیں گے۔ اب اسے ہر چیز خریدنے کے لئے علی احمد کے سامنے ہاتھ پھیلانے نہ پڑیں گے۔ جب وہ علی احمد سے پیسے مانگتا تھا تو ____ توبہ ہے وہ ایک جملہ کتنا دو بھر ہو جاتا تھا اور ____ اور جب کچھ کہہ چکتا تو علی احمد کے جواب دینے سے پہلے دنیا پر سناٹا چھایا رہتا۔ زندگی گویا جم کو برف کی سل بن جاتی اور پھر جب علی احمد اچھا کہتے تو گویا ''کن'' کی آواز آتی اور وہ انجماد اور تعطل ختم ہو جاتا اور چاروں طرف زندگی از سرنو بیدار ہو جاتی۔ لیکن علی احمد اچھا کہتے تھے۔ اب اس کی اپنی جیب میں پیسے ہوں گے اور وہ مونگ پھلی خرید سکے گا اور گڑ کی ریوڑیاں ____ کتنی کڑاکے دار ہوتی ہیں گڑ کی ریوڑیاں۔ عیش خالص عیش۔ اتنی آزادی۔ اتنی آزادی سے مل جائے گی کیا۔ وہ حیران تھا۔

گلیاں ہی گلیاں

رات علی احمد اور ایلی نے ایک عزیز کے یہاں بسر کی اور صبح سویرے ایلی کو ساتھ لے کر علی احمد کالج کی طرف چل پڑے ____ ''ہائیں یہ ابا کدھر جا رہے تھے۔

''ایلی سوچنے لگا۔ یہ تو گلیاں ہیں۔ تنگ وتاریک گلیاں ______ کیا کالج گلیوں میں ہوتے ہیں اور گلیاں فضول گھومے جا رہی تھیں۔ لیکن وہاں کالج تو نہ تھا کوئی۔ وہاں تو عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ کھڑکیوں سے لٹکتی ہوئی عورتیں۔ منڈیروں سے جھانکتی ہوئی عورتیں۔ چوکیوں پر بیٹھی ہوئی عورتیں۔ بال بناتی ہوئی ______ دانتوں پر دنداسہ ملتی ہوئی دوپٹے سنبھالتی ہوئی۔ لجاتی ہوئی۔ گھورتی ہوئی چیختی ہوئی۔ چلاتی ہوئی عورتیں ______ اور وہ گلیاں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں ایک ختم ہوتی تو دوسری شروع ہو جاتی۔ ایک مڑ جاتی تو دوسری کھل جاتی۔ گلیاں ہی گلیاں۔ تنگ کھلی۔ بودار گلیاں۔ جہاں علی احمد کے سوا مرد گردن جھکائے گزرتے تھے اور مٹیاریں سینہ ابھار کر چل رہی تھیں ______ وہ تھک گیا مگر گلیاں چلے جا رہی تھیں اور ان میں علی احمد سر اٹھائے منڈیروں کی طرف دیکھتے ہوئے شاہانہ انداز سے یوں چل رہے تھے جیسے باغ میں ٹہل رہے۔ دفعتاً گلیاں ختم ہو گئیں۔ چوڑی سڑک آ گئی۔ ''وہ تمہارا کالج ہے۔ ایلی'' علی احمد نے سامنے والی سرخ عمارت کی طرف اشارہ کیا'' اور دیکھا یہ'' وہ گلیوں کی طرف اشارہ کر کے بولے ''یہ لاہور ہے لاہور۔ خوب جگہ ہے لاہور۔'' ہو ہنسنے لگے۔

ماں کا لال

علی احمد دو دن وہاں ٹھہرے۔ ایلی دعائیں مانگتا رہا کہ وہ جلد رخصت ہوں اور اسے آزادی حاصل ہو لیکن جب سب کام مکمل ہو گیا۔ فیسیں ادا کر دی گئیں۔ کتابیں مہیا کر دی گئیں بورڈنگ میں 17 نمبر کے کمرے میں اس کی چارپائی رکھوا دی گئی اور علی احمد رخصت ہونے لگے تو نہ جانے کیوں وہ گھبرا گیا۔

بورڈنگ میں لڑکے ہی لڑکے بھرے پڑے تھے۔ بڑے بڑے لڑکے۔ اونچے لمبے بھرے بھرے جسم کے مرد نما لڑکے عجیب سے چہروں والے لڑکے بڑی رعونت سے گھورنے کے عادی تھے۔ جو ڈانٹ کر یوں بات کرتے جیسے تھانے دار ہوں۔

”اے لڑکا۔ ادھر آؤ۔“ اور ”اے تم کون ہو۔ کون ہو تم۔“ وہ ہر وقت مونچھیں موڑتے۔ اپنے تہہ بند جھاڑتے رہتے۔ کیونکہ پاجاموں کی جگہ انہوں نے بڑی بڑی چادریں لپیٹ رکھی تھیں۔ جن کے تلے طلائی جوتے تھے۔ جن کی نوکیں نکلی رہتی تھیں۔ ان لڑکوں کے ساتھ عمر رسیدہ نوکر تھے جو انہیں حقہ پلانے کے علاوہ مٹھی چاپی میں مصروف رہتے۔ ایلی انہیں دیکھ کر ڈر گیا اور پھر سہم کر سترہ نمبر کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔

”اے تو کون ہے؟“ ایک لمبا تڑنگا لڑکا کمرے میں آ گھسا ”کون ہے تو؟“

”جی۔ جی۔ جی۔“ ایلی گھبرا گیا۔

”جی جی کیا۔ سیدھی بات کرو۔“

وہ چلا گیا و ایلی اٹھ بیٹھا اس کے ارد گرد دیواریں گھوم رہی تھیں۔ ہوسٹل میں ہر طرف اونچے لمبے جاٹ قسم کے لڑکے مذاق اڑا رہے تھے۔ ”ٹھہرا و لونڈے۔ کہاں جا رہا ہے تو مار رہے تھے۔ منہ چڑا رہے تھے۔“ ایلی بھاگنے لگا۔ ایک بھدی سی آواز پیچھے سے چلا رہی تھیں۔ ”ٹھہرا و لونڈے۔“

ارے یہ لڑکیاں کہاں سے آ گئیں۔“ ایک لڑکا ایلی کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے زبردستی ایلی کی ٹھوڑی پکڑی لی اور اس کے منہ کو چاروں طرف گھما کر بولا ”یہ دیکھو ماں کا لال۔ ابھی ماں کا دودھ پینا نہیں چھوڑا اور آئے ہیں یہاں کالج میں داخل ہونے کے لئے۔ ماں کے پیٹ ہی سے دسویں کر کے آتے ہیں۔“

خوف سے ایلی کی حرکت قلب بند ہوئی جا رہی تھی۔ اس کی کنپٹیاں تھرک رہی تھیں ”جا اپنی ماں کی گود میں جا کر بیٹھ۔“ اس نے دھمکی دے کر کہا ”دوڑ امی کی گود میں جا کر بیٹھ۔“ پھر ایلی کو کچھ معلوم نہیں۔ وہ بھاگ رہا تھا۔ سڑکوں پر بھاگ رہا تھا۔ بھیڑ کو چیرتا ہوا جا رہا تھا۔ لوگ اس کی طرف منہ اٹھا کر دیکھ رہے تھے وہ زیر لب ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہیت تھے۔ ”ماں کی پیٹ سے دسویں پاس کر کے آتے

ہیں۔“ ”یہ دیکھو مائی کا لال۔ ہاہاہا۔“

سارا لاہور اس کے راز سے واقف تھا۔ سبھی اس پر ہنس رہے تھے ”پکڑ لو۔ پکڑ لو۔“ وہ پھر بھاگ اٹھتا۔ لڑکیاں نفرت سے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتیں۔ عورتیں ہاتھ چلا چلا کر باتیں کرتیں۔ تانگے والے اس کا مضحکہ اڑا رہے تھے۔ ”ہٹ بابو۔“ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ بھاگ کر دادی اماں کے پاس جا پہنچے اور وہ اسے تھپک تھپک کر سلا دے۔ ”کیا ہے تجھے ایلی۔ سو جا۔ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔“ اور پھر مطمئن ہو کر وہ رضا کی دکان میں جا بیٹھے۔ ”آؤ بابو ایلی بیٹھ جاؤ“ اور وہ پر وقار انداز سے بیٹھ جائے یا ارجمند کے پاس جا کھڑا ہو۔ ”ایلی وہ دیکھو بین بجی اور ناگ مست ہوا ہے نا“ وہاں اس کی اہمیت تھی وہاں لوگ اسے ماں کا لال نہیں سمجھتے تھے وہاں اس کی باتیں ایک حیثیت رکھتی تھیں۔

بازو میں جگہ جگہ چھابڑی والے مونگ پھلی، ریوڑیاں اور چنے بیچ رہے تھے لیکن اسے کچھ بھی تو دکھائی نہ دے رہا تھا۔ چاروں طرف بھیانک دھند لکا چھایا ہوا تھا اونچے اونچے کھمبے سروں پر ٹمٹماتی ہوئی نالیاں اٹھائے ناچ رہے تھے۔

نہ جانے کب تک وہ بازاروں میں آوارہ گھومتا رہا لیکن آخر کار اسے واپس ہوسٹل میں آنا ہی پڑا۔ واپس آنے کو اس کا جی تو نہ چاہتا تھا۔ اس گنوار خانے کی نسبت سٹیشن کے پلیٹ فارم پر بیٹھ کر وقت کاٹنا کہیں بہتر تھا۔ لیکن سٹیشن بھی تو ایک اجنبی مقام تھا جہاں پولیس کے سپاہی ہر بیٹھے لیٹے ہوئے مسافر کو شک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اسے کسی عزیز کے گھر کا راستہ بھی معلوم نہ تھا۔

ڈرتے ڈرتے وہ بورڈنگ میں جا داخل ہوا وہاں برآمدوں میں گراؤنڈ میں جگہ جگہ چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ حقے گڑگڑا رہے تھے۔ سفید چادریں جھاڑی جا رہی تھیں۔ ”او نذیرے۔ او فتے۔“ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

چپ چاپ وہ کمرہ نمبر سترہ میں جا پہنچا۔ ہائیں وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ نہ اس کا

ٹرنک۔ نہ سوٹ کیس۔ نہ بستر نہ چارپائی کمرے کے دروازے کے قریب برآمدے میں ایک جاٹ کو بیٹھا دیکھ کر وہ اس کی جانب بڑھا۔

''جی۔ جی۔'' اس کا دل دھڑک رہا تھا ''یہاں اس کمرے میں یعنی کمرہ نمبر سترہ میں یہ والا میرا سامان بستر۔''

جاٹ نے بے پروائی سے اس کی طرف دیکھا اور کھانس کر بولو ''معلوم نہیں۔''

دو مونچھوں والے جوان سامنے کوٹھے پر چارپائیوں پر پڑے تھے۔ وہ ان کے قریب چلا گیا۔ لیکن ان سے بات کرنا کچھ آسان نہ تھا۔

''کیوں بھئی۔ کیا دیکھتا ہے۔'' ایک نے چلا کر کہا۔

''کچھ نہیں جی۔ کچھ نہیں۔'' ایلی نے کہا۔

''ہوں۔ کون ہے۔ یہاں کیوں گھوم رہا ہے۔''

''جی میں سترہ نمبر میں فرسٹ ائیر میں۔ میں۔ میں۔'' اس کی گھبراہٹ بڑھتی جارہی تھی۔ ''جی میرا بستر چارپائی۔ ٹرنک سب غائب ہیں۔''

''ہائیں۔ کیا مطلب کیا ہم چور ہیں۔'' ایک نے مونچھ مروڑتے ہوئے پوچھا۔

''جی۔ جی۔ نہیں۔'' ایلی نے جھٹ انہیں یقین دلانے کی کوشش کی ''یہ تو اپنے ہوسٹل کا نہیں ہے۔'' ایک نے اسے کھنکھار کر کہا ''ادھر آبے'' ''چوری کرنے آیا ہے تو۔''

''جی جی نہیں۔ میں تو۔''

''بھاگ جا یہاں سے ورنہ پولیس کو بلائیں گے۔ دوڑ۔''

ایلی پھر بھاگ رہا تھا۔ نہ جانے کہاں کس طرح۔ لوگ اسے مشتبہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پولیس مین کے سامنے پہنچ کر وہ گھبرا جاتا اور آنکھ بچا کر نکل جانے کی کوشش کرتا۔ نہ جانے کیوں وہ اپنے آپ کو چور سمجھنے لگا تھا۔ آوارہ۔ چور پلیٹ فارم پر وہ ایک بنچ پر پڑ گیا۔ اسے مسافر خانے کے بنچ پر پڑے دیکھ کر پولیس والا آدھمکا۔

”ہے۔کون ہے۔تو۔کہاں جائے گا؟“

”جی جی۔“ وہ اٹھ بیٹھا۔

”کہیں بھی نہیں۔“ وہ بولا

”تو یہاں کیوں پڑا ہے؟“

”میں۔میں۔“ وہ گھبرا گیا اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے۔نہ جانے اسے کیا کہنا چاہئے تھا۔وہ اٹھ بیٹھا۔

”بھاگ یہاں سے۔“ حوالدار نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

ایک بار پھر وہ ویران لاہور کی سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔جہاں خوفناک شکلوں والے کتے بھونک رہے تھے۔ہر قدم پر وہ ٹھٹھک جاتا۔رک جاتا۔نہ جانے کہاں سے کوئی آ نکلے گا۔کتا بھونکے گا یا کوئی حوالدار مونچھ مروڑ کر اسے گھورے گا۔توبہ کس قدر ویران شہر تھا وہ کتنی چوڑی سڑکیں تھیں وہاں اور وہ کھمبوں پر ٹنگی ہوئی بتیاں یوں ٹمٹماری تھیں۔جیسے کسی ڈائن کے آنکھوں کی پتلیاں ہوں۔

پھر دفعتاً اسے خیال آیا آخر پولیس والا یہی پوچھتا تھا نا کہ کہاں جائے گا۔ٹکٹ کہاں ہے تیرا ــــــ اس خیال پر وہ پھر سٹیشن کی طرف مڑ گیا۔بکنگ آفس سے اس نے ٹکٹ خریدا اور ویٹنگ روم کی طرف چل پڑا۔

پھر جو اسے ہوش آیا تو وہ گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی علی پور کی طرف فراٹے بھرتی ہوئی جارہی تھی۔

پناہ گاہ

علی پور پہنچ کر وہ اپنی تمام گزشتہ تکالیف کو بھول گیا۔اس نے محسوس کیا جیسے ویرانی ختم ہو گئی ہو اور وہ پھر اسے ایک حیثیت سے مالک ہو گیا ہو۔

”ایلی۔ایلی۔ایلی۔“ چاروں طرف سے آوازیں آرہی تھیں۔

”ایلی۔“ دادی اماں چلا رہی تھی۔”تیرا دل لگ گیا تھا وہاں لاہور میں۔تو بہ اتنی

دور تن تنہا جانا۔ نہ بھئی میں تو نہیں چاہتی تو وہاں اکیلا جائے۔“

”ایلی۔“ ارجمند چلا رہا تھا۔ ”تم آ گئے۔ اچھا ہوا تم آ گئے تم چلے جاتے ہو تو سب گڑبڑ ہو جاتا ہے۔ اسسٹنٹ نہ ہو تو بیچارہ ہیڈ کیا کرے۔ بڑی چیز ہوتی ہے اسسٹنٹ۔ ہاں تم نہیں جانتے دفتروں میں اس کی کیا حیثیت ہوتی ہے اور پھر یہاں انکرا اینڈی آفس ہے۔“

”آ گئے بابو۔“ رضا نے اپنی لنگڑی ٹانگ کو گھماتے ہوئے کہا ”آؤ بیٹھو۔ اب تو کالج والے بن گئے۔ بابو بن گئے تم۔“

”ایلی۔“ جمیل اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ ”آؤ اونچی گلی میں آؤ وہاں آج لالہ نے تازہ گلاب جامن بنائے ہیں۔ آؤ۔“

”تو آ گیا ایلی۔“ سعیدہ نے اپنا خوشبودار دوپٹہ سر پر لیتے ہوئے کہا ”آ جا“ آج رات کو چور سپاہی کی بازی لگے گی۔ آئے گا نا تو ____“

”ہاں۔ ہاں۔“ ایلی نے کہا ”ضرور آؤں گا۔“

”ایلی ____ اب تو کالج کے ٹھاٹھ ہیں نا۔“ حکیم صاحب اسے دیکھ کر طنزاً مسکرائے۔

چودھری یہ سن کر بولا ”کیا فرق ہے حکیم صاحب۔ یہ تو جیسے پہلے تھا ویسے ہی اب بھی ہے۔ وہی رضا کی دوکان۔ وہی تاش کی گڈی۔“

چچا عظمت رک گئے ”کیا کہا چودھری۔ تاش کی گڈی۔ تاش کھیلنے کے علاوہ ان لندوروں کو آتا ہی کیا ہے۔ اللہ آپ کا بھلا کرے۔“ رضا ہنسا ”یہی میں کہہ رہا تھا۔ چچا عظمت۔“ تو چچا عظمت نے رضا کی طرف انگلی سے یوں شست باندھی جیسے اسے گولی کا نشانہ بنا رہے ہوں تمہیں نے تو لچ پنے کا اڈہ بنا رکھا ہے۔ یہ دکان تو محض ایک بہانہ ہے۔“

”ہاں۔“ رضا ہنسا ”چچا جی یہی بتا رہا تھا میں انہیں۔ لیکن ان احمقوں کی سمجھ میں

آئے بھی بات، بالکل بھس بھرے ہیں یہ سب اور اور یہ ایلی ____"

علی پور آجانے سے ایلی کی ایک حیثیت پیدا ہو جاتی تھی۔ اگرچہ محلے کے بزرگ اور بوڑھیاں اکثر نیچے جھاڑ کر پیچھے پڑے رہتے پھر بھی عیل پور تھا اور لاہور۔ لاحول ولاقوۃ وہ تو ایک ویرانہ تھا۔ کھوئے سے کھوا چھلنے کے باوجود ویرانہ۔

لاہور کا خیال آتے ہی ایلی گھبرا جاتا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ چھوٹ جاتا۔ لیکن وہ دل ہی دل میں جانتا تھا کہ اسے لاہور جانا ہی ہوگا۔ علی پور میں رہنا ممکن نہ تھا۔ پھر بھی جتنے دن وہ علی پور رہ سکتا تھا۔ غنیمت تھا۔

"اے ہے تیری چھٹی ابھی ختم نہیں ہوئی کیا۔" دادی اماں اسے چوتھے روز گھورنے لگی۔ "اب تو واپس بھی جائے گا یا یہیں آوارہ گردی کرتا رہے گا۔ میں تیرے ابا کو کیا جواب دوں گی۔"

"لیکن میں وہاں بورڈنگ میں جا کر بھوکوں مروں۔" ایلی کو سوجھی "لو وہاں تو بلکہ کھانے کو میوے ملتے ہیں تیرے ابا کہہ رہے تھے اس روز تو بھی پاس ہی تھا۔" دادی اماں نے جواب دیا۔

"ہونہہ میوے۔ وہاں تو روٹی بھی نہیں ملتی۔ بڑے لڑکے سب کچھ کھا جاتے ہیں۔ فرسٹ ائیر والوں کو کون پوچھتا ہے۔"

پہلے تو دادی اماں نے ایلی کی بات کا اعتبار نہ کیا لیکن جب اس نے دیکھا کہ لاہور کے نام پر ایلی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں تو اسے یقین آ گیا۔

"نہ بھئی میں تو ایلی کو بورڈنگ میں نہ بھیجوں گی۔ اے ہے اپنا فیروز جو رہتا ہے۔ وہاں لاہور میں پھر لڑکا بورڈنگ میں بھوکوں کیوں مرے۔ نہیں بھئی میرا ایلی وہاں نہ رہے گا کبھی بھی۔ اپنا گھر نہ ہو تو بھلا مجبوری ہوئی۔ لیکن فیروز کے ہوتے ہوئے لڑکے کو بھوکوں مارنا۔"

قہقہہ اور نعرہ

فیروکی جوانی دیر سے ڈھل چکی تھی۔ لیکن اس کے رخساروں پر سرخی جھلک ابھی تک نمایاں تھی۔ جسم بھرا ہوا تھا۔ چہرہ پر وقار ہونے کے باوجود نہ جانے کیوں بے جان سا محسوس ہوتا تھا۔ شانے چوڑے تھے چال ایستادہ تھی اور جسم تومند اور مضبوط تھا۔ لیکن اس کے باوجود فیروز کو دیکھ کر محسوس ہوتا جیسے اس کی عظمت ماضی سے تعلق رکھتی ہو۔ جیسے وہ گزشتہ جاہ وحشمت اور عیش وعشرت کی ایک داستان ہو۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور وقار دونوں خصوصیات بہ یک وقت موجود تھیں۔ لیکن ان میں ایک بے نام سی بے حسی کی جھلک تھی۔ مبہم سی اکتاہٹ اور محرومی۔

فیروز کی زندگی اس ویرانی اور محرومی کے باوجود متوازن تھی۔ جسے پابندی اوقات سے خصوصی تعلق تھا۔ وہ صبح سویرے جاگ اٹھتا۔ ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے کے بعد کپڑے پہن کر چہل قدمی کے لئے باہر نکل جاتا۔ واپسی پر چائے پینے کے بعد تھوڑا سا مطالعہ کرنا اور پھر کھانا کھا کر کپڑے اتار کر آرام کرتا حتیٰ کہ چائے کا وقت ہو جاتا اور چائے پینے کے بعد وہ پھر کپڑے پہن کر باہر سیر کو چلا جاتا اور واپسی پر کھانا کھا کے لیٹ جاتا۔

فیروز کو باتیں کرنے سے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ اس کی خاموشی کسی دلخراش المیہ کی شاہد تھی۔ فیروز کے کمرے کے قریب ہی ایک کوٹھڑی میں اس کی ہمشیرہ صابہر رہتی تھی۔ وہ ہر وقت چارپائی پر بیٹھی تسبیح پڑھتی رہتی تھی۔ اس کے سر پر ایک خاکستری رنگ کی چادر پڑی رہتی۔ جس میں اس کا سرخ وسپید چہرہ یوں دکھتا۔ جیسے کسی نے اندھیری کوٹھری میں کوئلے دہکا رکھے ہوں۔ اس کے سیاہ لمبے بال عام طور پر کھلے لٹکے رہتے۔ ''بیٹھ جاؤ'' وہ نووارد کی طرف مسکرا کر دیکھتی اور بڑے اخلاق سے اس سے باتیں کرتی اور پھر دفعتاً اس کا قہقہہ گونجتا ایک بے پروا بے نیاز۔ پروقار قہقہہ۔ وہ ہر تکلیف اور پریشانی پر قہقہہ مار کر ہنستی اور نووارد محسوس کرتا جیسے وہ دنیاوی تفکرات پر خندہ زن ہو۔ صابرہ کا چہرہ بڑا پروقار اور بارعب تھا۔ اس کا انداز بے حد پر اثر تھا۔

اس کوٹھڑی کے ارد گرد کئی ایک کوٹھڑیوں میں صابرہ کی بیٹیاں رہتی تھیں۔ سب چھوٹی لڑکی فیضہ کی شادی کسی سید سے ہونے والی تھی جو کسی گاؤں میں زمیندار تھا۔ سرور کا خاوند ایک معمولی دوکاندار تھا جس کی دوکان لوہے کے کباڑ خانے پر مشتمل تھی وہ روز حسرت زدہ امید سے خاوند کا انتظار کرتی کہ کب دوکان سے چار پیسے کما کر لائے اور وہ ہانڈی روٹی کا انتظام کرے۔ سرور دن بھر کپڑے دھوتی بچوں کو پیٹتی اور خاوند کو زیر لب برا بھلا کہتی رہتی۔ بچے چپ چاپ حیران نگاہوں سے کبھی ماں اور کبھی سیڑھیوں کی طرف دیکھتے۔

ایک کوٹھڑی میں خاوند اجلے کپڑے پہنے کوئی کتاب پڑھتی رہتی یا سرور کے بچوں کی طرف دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتی۔ فیضہ کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ اس گھر کی فرد نہ ہو۔ اس کے انداز میں نہ تو مایوسی تھی اور نہ بے نیازی اس ویرانے میں فیضہ ایک سرسبز خطے کی طرح تھی۔ اس کے ہاتھ حنا کے رنگ سے چمکتے تھے۔ اس کے ہونٹ مسکراہٹ سے کھلے رہتے اور لبوں پر کسی نا کسی ڈھولک گیت کی دھن ناچتی۔ جب وہ ڈھولک کے ساتھ گاتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے بہار آ گئی ہو۔

اوپر والی منزل میں انور اور اس کی بیٹی مینا رہتے تھے۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں انور چولہے کے سامنے بیٹھی دیوار کی طرف تکتی رہتی۔ جیسے دیوار کے پار دور بہت دور نہ جانے کیا دیکھ رہی ہو۔ اس کی لٹ جھٹک کر منہ پر آ گرتی ________ آنکھوں میں ان بہے آنسو چھلکتے اور وہ بار بار آہ بھرتی اور ننھی مینا گڑیا تھامے کبھی ماں کی طرف دیکھتی اور کبھی دیوار کی طرف۔ یہ وہ مکان تھا جہاں لاہور میں ایلی کو قیام کرنا تھا۔

فیروز ایلی کا پھوپھا تھا۔ پھوپھی مر چکی تھی اور اب فیروز تنہائی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ابتدائی زندگی میں وہ محکمہ پولیس میں اچھے عہدے پر فائز تھا پھر شاید وہ مسلسل حکومت سے اکتا گیا اور اس کے دل میں محکومیت کی آرزو چٹکیاں لینے لگی یا شاید یہ

سب راگ رنگ اور رقص کا اعجاز ہو۔ مسلسل عیش وطرب انسان کے دل میں نسائی آرزوئیں پیدا کر دیتا ہے۔ بہر حال اسے ایک رقاصہ سے محبت ہو گئی اور ایک روز شراب کے نشے میں خود کشی کی عملی مگر ناکام کوشش کی وجہ سے وہ ملازمت سے بر طرف کر دیا گیا اور بالآخر ظہور اس رقاصہ کے چوبارے پر جا بیٹھا۔ بائی نے کئی ایک سال اس کی خدمت کی۔ پھر بائی کی اچانک موت پر وہ اپنی ہمشیرہ کے گھر آنے پر مجبور ہو گیا تھا اور اب وہ سب اکٹھے ایک مکان میں رہتے تھے۔ فیروز خاموشی سے میز پر بیٹھا رہتا یا چارپائی پر لیٹ کر ماضی کی یاد میں کھو جاتا۔ ملحقہ کمرے میں سابرہ بیٹھی تسبیح کے دانے گنتی رہتی اور کبھی کبھار ایک بے نیاز اور پر جلال قہقہہ لگاتی۔ ساتھ ایک نعرہ بھی ''داتا'' اس قہقہے میں بے نیازی اور زندگی تھی اس نعرے میں جذبہ اور جوش تھا۔ وقار سے بھرپور زندگی احترام سے بھرپور جذبہ۔

اوپر والی منزل میں انور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیوار کی طرف دیکھتی اور پھر آہ بھر کر کہتی ''ایلی تم نہیں جانتے ساس اور نندوں نے مینا کے ابا کو ہاتھ میں لے رکھا ہے اور میاں آپ بھی تو جانے کس مٹی کے بنے ہیں کہ انہیں کسی بات کا ہوش ہی نہیں راجہ اندر بنے بیٹھے ہیں۔ ہائے ایلی ماں باپ نے مجھے کہاں جھونک دیا۔ میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔'' اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے اور وہ انہیں پلو سے پونچھ کر پھر دیوار کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتی۔ اس پر ننھی مینا اور بھی سہم جاتی اور اسے گڑیا کا کھیل بھول جاتا اور ایلی سوچنے لگتا یا اللہ یہ سب کیا ہے؟ یہ روئی روئی خوبصورت عورت، وہ سپنے دیکھنے والا اسرخ و سپید بزرگ، اور ایک دوسرے سے بے خبر نیاز، بہنیں اور ان کے بلکتے ہوئے بچے ____ وہ حیران ہوتا اور پھر سوچ میں کھو جاتا۔ پھر دفعتاً صابرہ کا قہقہہ گونجتا اور داتا کا نعرہ بلند ہوتا جیسے وہ غربت اور ان مصائب کا جو اس گھر پر مسلط و محیط تھے۔ تمسخر اڑا رہی ہو۔

فیروز کے مکان کے متصل بھنگی رہتے تھے۔ جن کی لڑکیاں گایا کرتی تھیں۔ ان

کے یہاں روز ایک نہ ایک تقریب رہتی ۔ نہ جانے کیوں ۔ ہفتے میں دو چار مرتبہ ڈھولک بجتی اور عورتیں دیر تک گاتیں ۔ جسے سن کر فیروز چہ چاہ بھتر کی طرح چارپائی پر پڑا رہتا اور سابرہ کی تسبیح اور بھی تیزی سے چلتی اور انور کے دوپٹے کا بلو بالکل ہی تر ہو جاتا اور خاور ناک سیکٹر کر کہتی "توبہ ہے کس قدر چیختی ہیں یہ بھنگنیں۔ کیسا واہیات محلّہ ہے یہ۔" اور فیضہ شوق سے شاہ نشین پر جا بیٹھتی اور ان کے گیت سننے میں محو ہو جاتی یا مسحور ہو کر چلانے لگتی "ہائے آپا کیسی اچھی ڈھولک بجاتی ہیں یہ ہائے میں کیا کروں۔"

دھندلکا

صبح سویرے ایلی منہ ہاتھ دھو کر کالج کی طرف چل پڑتا۔ لیکن نہ جانے کیا تھا اسے جوں جوں وہ کالج کے قریب پہنچتا اس کے دل میں ہول اٹھنے لگتے ۔ دبی دبی گھبراہٹ ابھرتی اور اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی۔ کالج کی طرف چلتے ہوئے ہر قدم پر اس کی حیثیت کم تر ہو جاتی۔ حتیٰ کہ کالج میں پہنچ کر وہ ایک ٹھگنے میں بدل جاتا اور پھر چاروں طرف بڑے بڑے گلیور اس کے گرد گھومتے اسے گھورتے اور تمسخر اڑاتے ۔ ایلی کی نگاہیں جھک جاتیں اس کا جی چاہتا کہ کہیں بھاگ جائے دور بہت دور جہاں کوئی نہ ہو۔ جہاں کوئی اس کا تمسخر نہ اڑائے۔ کوئی اسے دھمکی نہ دے جہاں لوگ اس قدر اونچے لمبے اور رہیبت ناک نہ ہوں پھر نہ جانے کیا ہوتا اس کے گرد و پیش ایک دھندلکا سا چھا جاتا اور وہ دھندلکا ان گلیوروں کو ایلی کی نظروں سے چھپا دیتا۔ ان کے تمسخر بھرے قہقہے مدھم پڑ جاتے ۔ پھر وہ دیکھتا کہ وہ بازاروں میں گھوم رہا ہے۔ ان جانے بازاروں میں نئی ۔ سڑکوں پر یہ دیکھ کر اس کے دل کو اطمینان سا ہو جاتا ۔ جیسے اس نے اپنی دنیا اور اپنی زندگی محفوظ کر لی ہو۔ جیسے وہ کسی بہت بڑے خطرے سے نکل آیا ہو۔

اس کے باوجود اس کے دل میں کھٹک سی لگی رہتی کہ وہ کالج میں حاضری نہیں دے

رہا۔ کلاسز اٹنڈ نہیں کر رہا۔ بلکہ آوارہ گردی کر رہا ہے۔ گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے۔
گناہ کا خیال آتے ہی اس کی نگاہوں میں دو حنائی ہاتھ لٹکنے لگتے اور وہ از سر نو مضطرب ہو جاتا۔ اس اضطراب سے مخلصی پانے کے لئے اس نے کئی ایک طریقے ایجاد کر رکھے تھے۔ وہ مونگ پھلی اور ریوڑیاں کھانے میں مصروف ہو جاتا لیکن مونگ پھلی اور ریوڑیاں ایسی چیزیں صرف وقتی مصروفیت بہم پہنچا سکتی تھیں۔ اس نے اس سلسلے میں سگریٹ کو بھی آزمایا تھا۔ مگر سگریٹ بھی مفید ثابت نہ ہوئے تھے الٹا وہ تو گلے میں کھرکھری سی پیدا کرتے تھے۔ جس سے اس کا اضطراب اور بھی بڑھ جاتا تھا ان سب باتوں سے اکتا کر سڑکوں پر بھٹکتے پھرنے سے تھک کر وہ کسی سینما ہال میں چلا جاتا اور چار آنے کا ٹکٹ خرید کر دو ڈھائی گھنٹے تک ایلمو اور پیڈرو بہادر کے کارنامے دیکھنے میں کھو جاتا۔ سینما ہال کا اندھیرا اسے لوگوں کی ٹٹولتی ہوئی جانچتی ہوئی پریشانی کن نگاہوں سے محفوظ کر جاتا۔ سینما ہال کا اندھیرا اسے لوگوں کی ٹٹولتی ہوئی جانچتی ہوئی پریشانی کن نگاہوں سے محفوظ کر لیتا اور پھر اطمینان سے پیڈرو بہادر کا روپ دھار کر وہ بدمعاش کو پیٹتا اور بالآخر حنائی ہاتھوں والی حسینہ کو گھوڑی پر چڑھا کر ہوا ہو جاتا۔
لیکن سینما سے فارغ ہو کر جب وہ گھر پہنچتا تو وہ حنائی ہاتھ شہ نشین کو تھامے ہوتے۔ جھکی جھکی نگاہون سے وہ انہیں دیکھتا اور پھر چپ چاپ نگاہ اٹھائے بغیر چوبارے میں جا پہنچتا جہاں انور چارپائی پر بیٹھی فضا کو گھور رہی ہوتی۔
اسے قریب بیٹھے دیکھ کر وہ چونکتی۔ "ہائے ایلی میری قسمت ہی پھوٹ گئی۔ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ ایلی ____ انہوں نے اس قدر ظلم کیوں کیا مجھ پر۔ میں نے ان کا کیا بگاڑا تھا۔" اور وہ ٹپ ٹپ رونے لگتے۔
پھر صابرہ کے قہقہے کی آواز سنائی دیتی اور وہی نعرہ "______ داتا" اور پھر متصل کوٹھڑیوں سے بھگتوں کی ڈھولک اور گیت کی آوازیں بلند ہوتیں۔ "اگ بال

کے دھوئیں دے بچ روواں لکھواں دکھ سجناں دا۔ ہائے سجناں دا۔"

لاہور کی زندگی عجیب زندگی تھی۔ ایلی محسوس کرتا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو۔ یہ عالم خواب چند روزہ ہو۔

وہ دھندلکا جو اس نے اپنے گرد و پیش بکھیر رکھا تھا۔ اس کے لئے کس قدر اطمینان بخش تھا۔ کیونکہ اس دھندلکے کی وجہ سے وہ لخراش حقائق سے بیگانہ رہ سکتا تھا۔ لوگوں کی نگاہوں سے بچ سکتا تھا۔ لوگوں کو تو ہر آتے جاتے کو نگاہوں سے کری بری عادت تھی۔ ایلی کے لئے سب سے بڑی مشکل لوگوں کی نگاہیں تھیں۔ بازار میں چلتے ہوئے اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اپنی لٹکتی ہوئی باہوں کو کیسے سنبھالے اور اکھڑی اکھڑی گردن کو کیسے قائم رکھے کہ لوگ اس پر تمسخر سے نہ ہنسیں۔

چار ایک لوگوں کے قریب سے گزرنا یا ان کے پاس کھڑا ہونا یا انس سے باتیں کرنا ایلی کے لئے بے حد مشکل تھا۔ بازار کے لوگ تو خیر اکثر بے پروائی اور بے توجہی سے اس کے پاس گزر جاتے لیکن کالج کا ہر لڑکا اس کی طرف دیکھ کر مسکانے لگتا اور لڑکوں کے گرد اس کا مذاق اڑاتے۔

اس زمانے میں کالج کے لڑکے بھی تو عجیب سے تھے۔ لڑکے معلوم ہی نہ ہوتے تھے۔ یوں لگتا جیسے بڑے زمیندار اور رئیس ہوں ____ جو پنچائت کے اجلاس پر آئے ہوئے ہوں۔

جب وہ گاؤں سے لاہور آتے اور پھر سٹیشن سے بورڈنگ تک تانگے میں پہنچتے تو ایک عجیب منظر نظر آتا۔ تانگہ کہ پائدان پر ان کا نوکر غلام علی۔ فتا یا کریما بیٹھا ہوتا جو ایک ہاتھ میں تمباکو کا تھیلا دوسرے میں گھی کا پیپا تھامے ہوتا۔ چودھری سیٹ پر یوں اکڑفوں بیٹھا ہوتا۔ جیسے وہ رئیسی تانگہ ہو۔ ایک ہاتھ سے مونچھ مروڑتا دوسرے سے سر کھجاتا۔ سیٹ پر ایک طرف مربے کا مرتبان ہوتا اور دوسری طرف فرشی حقہ جس کی نے بے حد لمبی اور چمکدار ہوتی تھی۔

ان کے قد اونچے لمبے ہوتے تھے۔ انہوں نے کالے اچکن اور بھاری بھر کم شلواریں پہنی ہوتی تھیں اور ان کے سر کی پگڑی کا طرہ گویا تانگے کی چھت کو اٹھائے ہوتا۔

اس کے برعکس ایلی کا چھوٹا اور پرانا کوٹ جو علی احمد کو الٹا کر بنایا گیا تھا۔ اس کی سستی اور مختصر سی پتلون اور معمولی سا جوتا۔ یہ تمام چیزیں ساف مانگے کی معلوم ہوتی تھیں اور ایلی کا چھوٹا قد اور پندرہ سال کی عمر ______ شاید انہیں باتوں پر کالج کے لڑکے اسے دیکھ کر ہنستے تھے۔ لیکن وہ نہ بھی ہنستے تو بھی ایلی کے لئے کالج جانا مشکل ہوتا کیونکہ اس کے دل پر کمتری کا احساس مسلط اور محیط رہتا تھا۔ جو اس نے اپنی والدہ سے ورثے میں پایا تھا اور جسے علی احمد کے گھر کے ماحول نے پالا پوسا تھا گرچہ یہ احساس کسی وقت دب بھی جاتا۔ لیکن مناسب وقت پر دفعتاً دل کے کونوں سے نکل کر اس پر یورش کر دیتا اس وقت اس کی انا کی ناؤ دولنے لگتی اور پھر وہ گویا صفحہ ہستی سے معدوم ہو جاتا۔ عین اس وقت اس کے گرد وہی دھند لکا چھا جاتا جو اسے لوگوں کی بے رحم نگاہوں سے محفوظ کر لیتا تھا اور اس دھندلکے میں گھومتا گھومتا وہ سینما ہال میں جا پہنچتا اور وہ دھنلی دھندلی تصاویر اسے اپنی آغوش میں پناہ دے دیتیں۔

پیڈرو بہادر

ویسے تو اس زمانے کے لاہور میں بھی خوبصورت عمارات اور سڑکیں تھیں خوشنما دکانیں اور ہوٹل بھی تھے۔ اگرچہ تعداد میں بہت کم تھے۔ لیکن جس لاہور میں ایلی رہتا تھا وہ لاہور عظیم الشان عمارتوں بڑے بڑے ہوٹلوں اور دوکانوں سے سجے ہوئے باغات اور خوبصورت سڑکوں سے قطعی طور پر خالی تھا۔ فیشن ایبل علاقے میں جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس نے کئی ایک مرتبہ بڑی دوکان میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس کا دل دھک دھک کرنے لگا اور پیشانی پسینے سے بھیگ گئی تھی اور وہ چپ چاپ سر جھکائے وہاں سے چلا آیا تھا۔ مال روڈ پر جانا اس کے لئے قطعی

طور پر ناممکن تھا۔ وہاں لوگ اکڑ کر چلتے تھے اور انہیں دیکھ کر ایلی محسوس کرتا جیسے اس کی ڈولتی ہوئی ناؤ کسی عظیم الشان جہاز سے ٹکرانے لگی ہو۔ وہ سہم جاتا۔ پٹڑی پر چڑھ جاتا اور پٹڑی سے اتر کر سڑک کے کونے پر سمٹ کر کھڑا ہو جاتا۔ سینما دیکھنے کے لئے وہ اس ہال میں جاتا جو عام سا ہو اور جہاں عام سے لوگ جاتے ہوں۔ جس کی عمارت عظیم الشان نہ ہو جس میں داخل ہوتے ہوئے وہ گھبراہٹ محسوس نہ کرے۔

اس زمانے میں لاہور میں صرف چار ایک سینما ہال تھے ایک بھاٹی دروازے کے باہر ایک ہیرا منڈی میں اور ایک شاہ عالمی کے باہر اور یہ تینوں ہال معمولی اور گھٹیا قسم کے تھے جہاں آسانی سے جا سکتا تھا۔

میکلوڈ روڈ اس زمانے میں ایک ویران سڑک تھی۔ جس پر ایک بیٹھی سی عمارت میں ایمرسن سینما تھا۔ یہ عمارت اگرچہ چنداں عظیم الشان نہ تھی مگر وہاں جانے والے تماشائی قطعی طور پر مختلف تھے اور سینما کے ماحول سے انگریزیت اور فیشن کی بو آتی تھی۔ وہاں جانا ایلی کے بس کی بات نہ تھی۔ گیا تو وہ کئی ایک بار تھا۔ ایک روپے کا ٹکٹ خریدنے کے لئے ٹکٹ گھر تک پہنچ بھی تھا۔ مگر پھر وہی دھندلکا چھا گیا تھا اور پھر جب وہ دھندلکا چھٹا تھا تو وہ شاہ عالمی گیٹ سینما کے ٹین ہال میں بیٹھا مسٹریز آف مائرہ دیکھتے ہوئے مونگ پھلی کھا رہا تھا۔ ان دنوں فلم خاموش ہوا کرتے تھے۔ ایک فلم مہینوں چلا کرتا تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں سیریل فلم دکھائے جاتے تھے۔ ممکن ہے برٹ انسٹی چیوٹ اور ایمپائر ہال میں ایسے فلم بھی دکھائے جاتے ہوں جو صرف دس بارہ ریلوں میں ختم ہو جاتے ہوں۔ لیکن اس تفصیل کے متعلق ایلی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ بہر حال شہر کے سینما گھر میں بارہ پندرہ ایپی سوڈ دکھائے جاتے تھے۔ جن کے اختتام پر ہیرو کسی بہت بڑی مشکل میں پھنس جاتا تھا اور بدمعاشوں کے نرغے میں ہیروئن اپنی عزت اور جان بچانے کی خاطر ہیرو کی امداد کے لئے دعائیں مانگ مانگ کر اس کا انتظار کرتے کرتے ہار کر مایوس ہو جاتی تھی۔

خاموش فلم دیکھنے میں ایک خوبی ضرور تھی۔ ہر چند ایک منٹ کے بعد چادر پر انگریزی میں مکالمے یا بیانیہ عبارت آجاتی تھی اور ہال کے پچھلے حصے سے گنگناہٹ سی بلند ہوتی یہ مکالمے اور عبارتیں ایلی کے لئے واحد ذریعہ تعلیم تھیں۔ کیونکہ کالج میں لیکچر میں حاضر ہونا یا سبق حاصل کرنا اس کے لئے ممکن نہ رہا تھا نہ ہی اسے یہ معلوم تھا کہ جماعتیں کہاں بیٹھتی ہیں اور کون فروفیسر انہیں پڑھاتے ہیں۔

پہلے دو سال کے دوران میں ایلی کا نام کئی ایک مرتبہ کالج سے خارج ہوا لیکن ہر بار کسی نہ کسی طرح علی احمد کو خبر مل جاتی اور وہ علی پور کے کسی عزیز کو اطلاع دے دیتے اور جلد ہی محلے کا کوئی بزرگ علی پور سے آپہنچتا اور وہ ایک دن لمبے چوڑے لیکچر پلا کر اور ایلی کی فیس ادا کر کے واپس چلا جاتا اور ایلی کا نام ایک بار پھر کالج کے رجسٹر میں درج ہو جاتا۔ ایک مرتبہ تو خود علی احمد اسے داخل کرانے کے لئے آگئے اور انہوں نے ایلی کو لیکچر پلانے کی جگہ ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ وہ باری باری ایلی کے تمام پروفیسروں اور کلرکوں سے ملے اور ایلی کو ان سب سے متعارف کرایا۔ پروفیسر حیران تھے کہ یہ کون لڑکا ہے کیونکہ انہوں نے ایلی کو جماعت میں کبھی نہ دیکھا تھا۔

اس واقعہ سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ایلی کی جھجک کسی حد تک دور ہو گئی۔ وہ دھندلکا اب صرف کالج کے برآمدوں سیڑھیوں اور میدان تک محدود رہ گیا اور کلاس روم کا مطلع کھل گیا اب وہ بھاگ کر برآمدے سے گزرتا اور کلاس روم کی آخری بنچ پر بیٹھ جاتا اور پھر جب جماعت ایک لیکچر سے فارغ ہو کر دوسرے کمرے کی طرف جاتی تو وہ پہلے ہی بھاگ کر کسی کونے میں جا کھڑا ہوتا تا کہ لڑکوں کی نگاہیں اس پر نہ پڑیں۔ لیکن اس کے باوجود حاضری کے رجسٹر سے اس کا نام کٹنا بند نہ ہوا۔

طالب خیریت

خط لکھنے میں علی احمد کو کمال حاصل تھا انہیں ہر اس بات پر دلچسپی تھی جو لکھنے سے متعلق ہو مثلاً گھر میں ان کے لکھنے کے سامان کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ علی احمد میز پر

بیٹھ کر نہیں لکھ سکتے تھے۔ لکھنے کے لئے انہیں فرش پر بیٹھنے کی ضرورت پڑتی۔ ان کی دوات ہمیشہ تھالی میں رکھی ہوتی۔ قلم کی نبیں گھس گھس کر اس قدر موٹی ہو جاتیں کہ دیکھنے والا شناخت نہ کر سکتا تھا کہ تحریر کلک سے لکھی گئی ہے۔ یا ریلیف کے نب سے لیکن علی احمد کو گھسی ہوئی نب سے لکھنے کا شوق تھا وہ ہر نئی نب کو گھس کر یا جانے کیسے موٹا کر لیا کرتے اور پھر اطمینان سے فرش پر بیٹھ کر لکھا کرتے اور اس شغل میں اس قدر کھو جاتے کہ انہیں گردوپیش کا احساس ہی نہ رہتا۔ یہ تو محض اتفاق کی بات تھی کہ لکھنے کے سلسلے میں ان کی توجہ حساب کتاب اور تاریخ پیدائش و وفات اور شادی بیاہ تک محدود رہ گئی تھی۔ ورنہ اگر وہ تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دیتے تو نہ جانے کیا نتائج ظہور میں آتے۔

خط لکھنے کے معاملے میں ان کی قابلیت کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ ایک تو خ میں وہ مناسب القابات اور معقول انداز تحریر کے شدت سے قایل تھے۔ ہر بات کو مناسب جزئیات اور حصوں میں تقسیم کرتے اور پھر با قاعدہ طور پر انہیں نمبر وار تحریر کرتے۔ ایلی اپنے خط میں چلاتا ”جناب والا! آپ نے ابھی تک خرچ نہیں بھیجا میں سخت تکلیف میں ہوں۔ کالج کی فیس ادا کرنا ہے۔ جسم پر کپڑا نہیں۔ جیب میں پائی نہیں۔ از راہ کرم واپسی ڈاک خرچ بھیجئے تاکید مزید ہے' میں سخت تکلیف میں ہوں۔“

بواپسی داک ان کا گرامی نامہ ایک کارڈ پر موصول ہوتا کیونکہ وہ لفافہ لکھنے کے قائل نہ تھے ”برخوردار الیاس تمہارا خط ملا۔ حالات سے آگاہی ہوئی یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ تم خیریت سے ہو اور خوش و خرم ہو۔ یہاں سب خیریت سے ہیں اور ہم سب تمہاری خیریت کی خبر کے طالب ہیں۔ علی احمد۔“

علی احمد کا خط پڑھ کر ایلی کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ غصے میں وہ پھر سے ایک لمبا چوڑا خط لکھتا ”یہاں بالکل خیریت نہیں' حالات بالکل نا مساعد ہیں۔ میں

مرا جا رہا ہوں۔ میری خبر لیجئے۔ اگر آپ نے خرش نہ بھیجا تو نہ جانے کیا ہو جائے گا۔
بوالپسی ڈاک خرچ روانہ کیجیے۔“

بوالپسی ڈاک علی احمد کی طرف سے کارڈ موصول ہوتا۔ برخوردار تمہارا خیریت نامہ ملا۔ اسی طرح ہر دوسرے دن اپنی خیریت کی خبر بھیجتے رہا کرو تا کہ باعث فکر نہ ہو۔

اس زمانے میں ایلی کو علی احمد کی فنکاری کا احساس نہ تھا۔ ان خطوط سے محظوظ ہونے کی بجائے چڑ جاتا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ایلی کو مضحکہ خیز باتوں پر ہنسنا نہیں آتا تھا۔ وہ ایسی باتوں پر اپنا توازن کھو بیٹھتا تھا اس کی شخصیت میں توازن اور وضع داری سرے سے مفقود تھی۔

علی احمد ایلی کو خرش ضرور بھیجا کرتے تھے اس کی ضروریات سے زیادہ بھیجتے مگر از طور پر انہیں تنگ بخشی کی عادت تھی وہ خرش اقساط میں بھیجتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ پہلی قسط کو جیب میں اس امید پر اٹھائے پھرتا کہ دوسری قسط آنے پر فیس ادا کر دے گا۔ لیکن جب دوسری قسط موصول ہوتی تو پہلی خرش ہو چکی ہوتی اور اسے تیسری قسط کا انتظار کرنا پڑتا۔ اس کے علاوہ علی احمد کے خطوط سے جو دھندلکا پیدا ہو جاتا اسے صاف کرنے کے لئے بھی تو کافی خرچ ہو جاتا تھا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اس کی مجالی حالات ہمیشہ بگڑے رہتے اور اس کا سینما دیکھنا' گنڈیریاں چوسنا مونگ پھلی اور ریوڑیاں کھانا اور بھی ضروری ہو جاتا۔

ان مسائل سے اکتا کر وہ انور کے پاس جا بیٹھتا۔ انور بال کھولے آنکھیں بنائے دیوار کی طرف گھورتے ہوئے کہتی "ہائے ایلی کیا ہو گیا۔" ایلی کا دل چاہتا کہ وہ بھی کسی سے عشق کی لو لگا کر بیٹھ جائے اور علی احمد کے خطوط اور کالج کے دھندلکے سے نجات حاصل کر لے لیکن اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ عشق میں انور کی یہ کیفیت دیکھ کر کیسے عشق لگائے اتنی کوششوں کے باوجود وہ کسی سے عشق نہ لگا سکا تھا۔ کسی کے سامنے جا کر تو اس کی نگاہیں جھک جاتی تھیں۔ دل دھک دھک کرنے لگتا تھا اور

زبان بند ہو جاتی تھی۔ پھر عشق کیسے لگتا اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔

پھر اسے خیال آتا کیوں نہ نذیراں سے عشق لگا لوں۔ وہ نذیراں جو علی پور کی اس اندھیری ڈیوڑھی میں اس کا انتظار کیا کرتی تھی اور جب وہ داخل ہوتا تو کھلکھلا کر ہنس پڑتی "تو ڈر گیا۔ میں ہوں۔ ایلی میں ہوں۔" اور پھر ایک خوشبودار جسم اس کی طرف بڑھتا دو سیاہ آنکھیں۔ موٹے ہونٹ اور بھدا ر چہرہ اور وہ گھبرا کر بھاگتا۔

نہ جانے اسے نذیراں سے عشق کیوں نہ ہوتا تھا۔ نذیراں واحد لڑکی تھی جو اسے دیکھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا کرتی تھی۔ باقی لڑکیاں تو اس کے وجود ہی سے منکر تھیں۔ اسے تسلیم بھی کرتیں تو صرف ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتیں۔ مصیبت یہ تھی کہ ایلی ان لڑکیوں سے ڈرلگتا تھا جو اسے دیکھ کر آگے بڑھتی تھیں اور وہ تمام لڑکیاں اسے پیاری لگتی تھیں جو اسے دیکھ کر فوراً منہ موڑ لیا کرتی تھیں۔ عجیب مصیبت تھی۔ اس مسئلہ میں اسے مشورہ دینے والا بھی تو کوئی نہ تھا۔ صرف ایک ارجمند تھا۔ لیکن وہ تو اس معاملہ میں ایلی کی بالکل مدد کر سکتا تھا۔ وہ تو انگرا ئیدی ماباؤں کو ایک کھیل سمجھتا تھا اور لڑکیوں سے یوں کھیلتا تھا۔ جیسے وہ کھلونے ہوں انہیں لبھاتا۔ چھیڑتا ان کا مذاق اڑاتا۔

اس کے برعکس ایلی ان کی عزت کرتا تھا۔ انہیں پاکیزہ سمجھتا تھا اور خاموشی سے ان کی پرستش کرنا چاہتا تھا۔ وہ عشق کو ایک بلند و بالا چیز سمجھتا تھا ایک ایسا تعلق جسے جسم سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ لیکن وہ تعلق کیسے قائم کیا جائے اس کے بارے میں اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔

دو سال کالج میں گزارنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ حاضریوں کی کمی کی وجہ سے اسے امتحان میں نہیں بھیجا جا سکتا۔ یہ خبر سن کر گھبراہٹ تو ضرور ہوئی لیکن صرف اس خیال پر کہ علی احمد کو کیا جواب دے گا' ویسے دل ہی دل میں اس نے خوشی محسوس کی کہ امتحان کی مصیبت سے چھٹکارہ ہوا اور وہ فوراً گاڑی میں سوار ہو کر علی پور روانہ ہو گیا۔

امتحان کے لئے نام نہیں جا سکتا تو پھر لاہور میں رہنے کا فائدہ؟

واپسی

ایلی کے احاطے میں قدم رکھتے ہی محلے والیوں نے شور مچا دیا ـــــــ ''کون آیا ہے؟''

''اے ہے ایلی ہے ماں جی اپنی ہاجرہ کا بیٹا۔''

''اچھا ہاجرہ کا بیٹا آیا ہے اللہ زندگی دراز کرے۔''

''اب تو بہن بابو بن گیا ہے۔''

''بڑا لائق لڑکا ہے یہ ہاں میں تو پہلے سے ہی جانتی تھی۔ اے ہے ادھر تو آ لڑکے شرماتا کس سے ہے۔ تیری خلائیں اور پھوپھیاں بیٹھی ہیں کوئی غیر نہیں۔''

''چاچی بڑا شرمیلا لڑکا ہے۔ بڑا اچھا ہے اور یہ محلے کے چوھرے۔ توبہ طوفان مچا رکھا ہے۔ انہوں نے۔''

''ابھی پیدا ہو ہی نہیں پاتے اور شرارتیں پہلے ہی شروع کر دیتے ہیں۔''

''لیکن ایلی ان لڑکوں سا نہیں''۔ ''اے ہے بہن'' چاچی بولی۔ ''ماں کے گھر کا چراغ اور رہ وہ علی احمد وہ تو بہن اپنی ہی دھن میں لگا ہے۔ بس ہر سال نئی نویلی ملے پرانی تو باسی ہو جاتی ہے نا۔''

نہ جانے محلے میں جب بھی ایلی کی بات شروع ہوتی تو جلد ہی علی احمد اور اس کے شوق کا تذکرہ کیوں چھڑ جاتا اور پھر لوگ مسلسل طور پر علی احمد کی باتیں کرتے رہتے جیسے ایلی کا تذکرہ محض علی احمد کی بات چھیڑنے کیلئے ایک بہانہ ہو یا محض ایک تمہید۔ محلے کی عورتیں جب بھی علی احمد کی بات چھڑتیں تو ایلی ان کی بات اور انداز میں عجیب تضاد محسوس کرتا۔ کہنے کو تو وہ علی احمد کے خلاف شکایات کرتیں اور ان کی بری عادت پر ہاتھ دھرتیں مگر ان کے انداز سے معلوم ہوتا۔ جیسے وہ علی احمد کو سراہ رہی ہوں جیسے ان کی وہ خصوصیت بے حد پیاری ہو اور علی احمد کا تذکرہ شروع کرنے کے بعد وہ

اسے جاری رکھنے پر مجبور ہوں۔ اسے برا بھلا کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں چمک لہراتی ہونٹ مسکراہٹ کی وجہ سے کھل جاتے اور ہلکی سی سرخی نہ جانے کہاں سے ابھر کر رخساروں پر جھلکتی۔ ایلی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیسی نکتہ چینی تھی۔ کہتی کچھ اور کرتیں کچھ اور سمجھاتی کچھ تھیں۔ اثر کچھ اور لیتی تھیں۔

ہاجرہ سے جب وہ ہمدردی جتاتیں تو ایلی کو محسوس ہوتا کہ وہ ہمدردی کے پردے میں درحقیقت اس پر ترس کھا رہی ہیں "ہائے بیچاری ہاجرہ۔" اماں کہتی "لیکن اس کو کیا پروا۔ علی احمد جو چاہے کرے۔ اس کی بلا سے اگاتا پھرے عشق جہاں اس کا جی چاہے۔"

"وہ تو رنگیلا راجہ ہے۔" دوسری مسکراتی۔

اس پر ایلی محسوس کرتا کہ جیسے وہ درپردہ ہاجرہ پر ہنس رہی ہوں اور علی احمد کی اس پیاری خصوصیت پر پھولے نہ سماتی ہوں۔ اس مرتبہ ایلی نے پہلی دفعہ محلے والیوں کی اس دورخی کو شدت سے محسوس کیا۔ ایلی کے احساسات میں عجیب قسم کی گہرائی پیدا ہو رہی تھی۔ روز بروز وہ زود حس ہوتا جا رہا تھا۔ ایسی باتیں اسے چبھنے لگی تھیں۔

پہلی مرتبہ اس نے محسوس کیا کہ محلے والیوں نے ان کا مذاق بنا رکھا ہے۔ انکا ہاجرہ سے سستی ہمدردی جتانا درحقیقت اپنی عظمت کا اظہار کرنے کا ایک ذریعہ تھا وہ ہاجرہ کے لئے کچھ نہ کر سکتی تھیں نہ ہی وہ علی احمد سے شکایت کر سکتیں۔ شکایت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ انہیں تو الٹا ان کی یہ عادت پسند تھی۔ علی احمد کی شخصیت پسند تھی اور اخلاق کے متعلق تو وہ صرف وعظ فرمانا جانتی تھیں۔ یہ سوچ کر اس نے محلے والیوں کی باتوں سے اپنی توجہ ہٹالی۔

شریف کی وہ

اتفاق سے انہیں دنوں رخصت لے کر شریف علی پور آگیا اور وہ پھر سے شریف میں کھو گیا شریف نے ایلی کی طرف دیکھا اور اپنی نیم وا آنکھیں ایلی کے چہرے پر گاڑ

دیں۔ ایلی نے حیرانی سے شریف کی طرف دیکھا۔ اس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ ویسے ہی چپ چاپ اس کے منہ کی طرف تکتا رہا۔ حتیٰ کہ ایلی محسوس کرنے لگا۔ جیسے اس کی نگاہیں چیونٹیوں کی طرح اس کے جسم میں دھنسی جا رہی ہیں۔ اس کی نس نس میں رینگ رہی ہیں۔

شریف کے ہونٹوں پر تبسم چھلکا "گھبرا گئے۔" وہ بولا "ابھی سے گھبرا گئے۔" اور وہ پھر اس طرح ٹکٹکی باندھ کر ایلی کی طرف دیکھنے لگا اور اس کی نگاہوں میں عجیب سی مستی تھی۔

"مجھے جانا ہے۔" ایلی نے گھبرا کر ایک مرتبہ پھر اٹھنے کی کوشش کی۔

"تم نہیں جا سکتے ایلی۔" شریف مسکرایا "تم میری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکتے۔ یہیں بیٹھے رہنا ہوگا۔ میرے روبرو میری نگاہوں کے سامنے اور میں تمہیں دیکھتا رہوں گا۔ حتیٰ کہ میری آنکھیں پانی ہو کر بہہ جائیں۔ تم نے اس کو دیکھا ہے؟ تم اس کے پاس رہے ہو۔ یوں ہی تم اس کے روبرو بیٹھا کرتے ہو گے اور وہ تمہیں دیکھا کرتی ہو گی۔ تم نے اس مکان میں دو سال بسر کیے جس میں وہ رہتی ہے۔ تم اس فضا میں سانس لیا کرتے تھے۔ کتنا خوش قسمت ہوں میں جو تمہیں دیکھ رہا ہوں۔" شریف کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا مگر اس کی آنکھیں اسی طرح ایلی کو گھورے جا رہی تھیں۔ اس کے منہ سے حسب معمول رال بہہ رہی تھی۔ چہرے پر حسرت و یاس کی دبیز تہہ چڑھی ہوئی تھی اور وہ اپنی روئیداد کہے جا رہا تھا۔

"کیا وہاں تن تنہا رہتی ہے۔ اتنی بھیڑ میں تن تنہا رہتی ہے ظالموں نے اسے وہاں قید رکھا ہے۔ انہوں نے اس کے بازو کاٹ دیئے اور تڑپ تڑپ کر وقت گزر رہی ہے۔ اس نے تم سے کچھ کہا تھا میرے بارے میں۔" شریف رک گیا۔

ایلی کو نفی میں سر ہلاتے ہوئے دیکھ کر شریف نے لمبی آہ بھری "وہ کسی سے بات نہیں کرے گی۔ انہوں نے اسے اس قدر ڈرا دیا ہے کہ وہ گھٹ کر مر جائے گی مگر کسی

سے دل کی بات نہ کہے گی اور ـــــ اور ـــــ ’’جوش میں اٹھ بیٹھا ’’یہ سب اس ڈائن کی شرارت ہے۔ جیسے تم دادی اماں کہتے ہو۔ اس خبیث بڑھیا کی۔ وہ ہم دونوں کے درمیان دیوار بن کر حائل ہو گئی۔ اس نے وہ کھڑکیاں کیلوں سے بند کروادیں جو اس طرف کھلتی تھیں۔ وہ روزن اینٹوں سے بھروادیئے تھے۔ جن سے اس کے آواز مجھ تک پہنچ سکتی تھی۔‘‘ شریف بولے جارہا تھا اور ایلی حیران اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہے۔ کیا کرے۔ کس طرح اپنی ہمدردی کا اظہار کرے۔

دفعتاً سعیدہ داخل ہوئی۔ ’’شرم نہیں آتی تجھے۔‘‘ اس نے حنا مالیدہ ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔ ’’اس بچے کو سامنے بٹھا کر روتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ اس بیچارے کو کیا سنا رہا ہے تو اپنا قصہ۔ اسے کیا معلوم کیا ہوتی ہیں یہ باتیں۔ خوامخواہ کا پاکھنڈ مچا رکھا ہے۔ تو تو عورتوں سے بیتا ہو گیا۔ اے ہے مرد ہزاروں جگہ آنکھیں لڑاتے ہیں اور پھر اپنے اپنے دھندے میں لگ جاتے ہیں۔ مگر یہ میاں ہیں کہ مجنوں بنے ہوئے ہیں۔ چاہے دوسرے کو ذرا احساس نہ ہو۔ یہ اپنی جان ہلکان کیئے جائے گا۔ جا ایلی تو اپنے گھر۔‘‘ اس نے حنا مالیدہ ہاتھ سے اس کا منہ سہلاتے ہوئے کہا یہ میاں تو مجنوں بننے کی قسم کھائے ہوئے ہیں۔

اس وقت ایلی کو سعیدہ کے ہاتھ کا لمس ناگوار گزرا۔ اسے شریف کے پاس سے چلے آنے سے دکھ بھی ہوا۔ لیکن اس دکھ میں خوشی کا دبا دبا عنصر بھی تھا۔ کیونکہ شریف کی باتیں سن سن کر اس کے دل میں جذبات کا ایک طوفان اکٹھا ہو چکا تھا۔ جو اسے مضطرب کیئے جارہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کہیں اکیلے میں جا کر رو دے۔ شریف کے دکھ پر نہیں بلکہ اپنے دکھ پر اپنی بدقسمتی پر کہ وہ کسی سے محبت نہ کرسکا۔

ماں کا آنسو

اگلے روز جب وہ شریف کی طرف جانے کو تیار ہوا تو اماں نے اس کا بازو تھام لیا

"ایلی ٹھہر جا مجھے تجھ سے کچھ کہنا ہے۔" ایلی گھبرا گیا۔ کیا اماں بھی شریف کے خلاف ہیں۔ کیا وہ بھی نہیں چاہتیں۔ کہ میں اس سے ملوں۔

"ذرا ٹھہر جا۔" اماں بولی "بیٹھ یہاں ابھی میں بھی چلتی ہوں تیرے ساتھ۔" وہاں بیٹھا سوچتا رہا نہ جانے اماں نے اسے وہاں کیوں بٹھایا تھا نہ جانے وہ اس سے کیا کہنا چاہتی تھیں۔ لیکن وہ ہمیشہ بات کہہ دیا کرتی تھیں۔ یوں تو انہوں نے کبھی نہ کہا تھا۔ ایلی ٹھہر جا مجھے تجھ سے کچھ کہنا ہے۔

کچھ دیر کے بعد اماں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے نیچے لے گئی۔ نچلی منزل میں اس نے ایک کمرے میں جا کر اندر سے کنڈی لگا لی پھر وہ ایلی کی طرف بڑھی۔ ایلی کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ نہ جانے وہ اس سے کیا کہنے والی تھیں۔

"ایلی۔" وہ بولی۔ "میری عزت تیرے ہاتھ میں ہے اگر تو میری بات مان لے تو میں سرخرو ہو جاؤں گی اور اگر تو نے انکار کر دیا تو بس سمجھ لے کہ آئندہ سے تو ماں کا نہیں باپ کا بیٹا ہوگا۔"

ایلی حیران تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اماں کی عزت کیسے بچا سکتا تھا۔ آخر وہ کونسی بات تھی۔ جس پر اماں کی عزت کا دارومدار تھا اور اس کی عزت ہی کیا تھی گھر میں۔ اس کی حیثیت تو نوکروں کی سی تھی۔ پھر عزت کی بات کرنا اور عزت بچانے کا سوال، ایلی کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔

ہاجرہ نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "پھر تم جو چاہے کر لینا ایلی اپنی بات پر قائم رہنا یا بدل جانا لیکن اس وقت ہاں کر دو اگر تم نے ہاں نہ کی تو تمہارے ابا تمہیں اپنے رشتہ داروں کی جھولی میں ڈال دیں گے اور تم مجھ سے دور ہو جاؤ گے۔"

"لیکن اماں یہ سب کیا ہے؟" ایلی نے گھبرا کر پوچھا۔ "کچھ بتاؤ تو مجھے پتہ چلے۔"

"تمہارے بھلے کی کہتی ہوں بیٹا۔" وہ بولی۔ "اگر میں نے ابھی کچھ نہ کیا تو

وہ نہ جانے کیا کر دیں گے۔ تو تو انہیں جانتا ہی ہے۔ وہ اچھے لوگ نہیں تو تو جانتا ہی ہے بیٹا۔" یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔

"لیکن بات کیا ہے اماں۔" وہ گھبرا گیا۔

"تو وعدہ کرے گا تو میں بتاؤں گی۔" اماں نے جواب دیا۔ "بس سمجھ لے کہ تیری بہتری ہی کی بات ہے۔"

"بھلا میں کوئی ایسی بات کر سکتی ہوں جو تیرے لیے اچھی نہ ہو۔ بس تو ایک بار ہاں کہہ دے۔"

"اچھا اماں جو آپ کی مرضی۔" اس نے بات سمجھے بغیر ہی کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لیے کہہ دیا جو اس پر مسلط ہوتی جا رہی تھی۔

"اللہ عمر دراز کرے۔ خوشیاں نصیب کرے۔" ہاجرہ کی باچھیں کھل گئیں۔ "میں جانتی تھی تو میری بات رد نہ کرے گا۔ میں جانتی تھی تو مجھے چھوڑ کر ابا کی طرف نہ جائے گا۔ تو دیکھ لیجو تیرے لیے ایسی اچھی دولہن چنی ہے میں نے جو لاکھوں میں ایک ہے۔ لاکھوں میں۔ محلے میں اس سے بہتر لڑکی نہیں مل سکتی۔ کل تیری منگنی ہو جائے گی اور پھر تیرے ابا کے لیے ناممکن ہو جائے گا کہ وہ تجھے اپنے رشتہ داروں کے باندھ دیں۔"

ایلی حیرانی سے اماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آخر اماں اس بات کو اتنی اہمیت کیوں دے رہی تھیں۔ اتنی سی بات کو اس قدر اہم کیوں سمجھ رہی تھیں۔ اس کے ذہن میں تو ان دنوں اس معاملے کی اہمیت نہ تھی۔ اس کا ذہن ایک سادہ ورق تھا جس پر محبت اور ازدواجی زندگی کا کوئی مبہم نقش بھی مرقوم نہ تھا۔

"لیکن اماں۔" اس نے بصد مشکل کہا۔ "میں مہندی نہیں لگاؤں گا۔ میں انگوٹھی نہیں پہنوں گا۔" اس کے ذہن میں منگنی اور شادی کے متعلق سب سے بڑی مشکل مہندی اور انگوٹھی تھی۔

"تو کچھ بھی نہ کہو۔ جیسے تیرا دل چاہے۔ میں کوئی رسم بھی نہ ہونے دوں گی۔ بس مجھے تو صرف تجھے نامزد کرنا ہے۔ تیرے ابا کے رشتہ داروں سے بچانا ہے اور میرا کوئی مقصد نہیں۔"

چند دنوں کے بعد محلے کے چوگان میں علی پور کا بہترین بینڈ بج رہا تھا۔ ایلی اور کلثوم کے گھروں کے درمیان آنے جانے والیوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ عورتیں مرصع اور ریشمیں کپڑے پہنے ادھر سے ادھر مٹک رہی تھیں۔ لڑکیاں لڑکوں کو دیکھ کر "اوئی اللہ" کہہ کر گھونگھٹ میں چھپ جاتیں۔ بوڑھیوں نے شاید تبسم کو چھپانے کے لیے ہونٹوں پر انگلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ محلے کی چودھرانیاں مٹھائی کے تھال اٹھائے گھر گھر لڈو بانٹ رہی تھیں۔ محلے میں منگنی پر پہلی مرتبہ بتاشوں کی بجائے موتی چور کے لڈو بانٹے جا رہے تھے اور ایلی اس ہنگامے سے دور رضا کی دوکان کے پچھلے حصے میں چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے لوگوں کے روبرو جاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ اس کے باوجود آتے جاتے لوگ رضا کی دوکان پر رک جاتے اور ایلی کی منگنی کی بات چھیڑ دیتے۔

منگنی

"بڑی دھوم سے منگنی کی ہے ہاجرہ نے کیوں نہ ہو بھئی اکلوتا بیٹا ہے ماں کی کوئی اپنی خواہش آج تک پوری نہیں ہوئی تو اسی بہانے سہی۔ مطلب تو خوشی دیکھنا ہے نا بھئی۔"

اس پر رضا نے ہنستے ہوئے چھپے ہوئے ایلی کی طرف دیکھا اور بظاہر بڑی سادگی سے باآواز بلند کہا "اور چچا جی لڑکا بھی تو گدڑی میں لعل ہے۔"

"لیکن وہ چھپا کہاں ہے آج دکھائی نہیں دیتا۔" چچا مسکرائے۔ "تمہاری دوکان کی گدڑی میں تو نہیں چھپا ہوا۔" چچا نے یہ کہتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر پردہ اٹھا دیا اور ایلی کو چھپا دیکھ کر ہنسنے لگے۔ "بھئی واہ ایلی تم یہاں چھپے ہو اور محلے میں تمہاری

منگنی کے چرچے ہیں۔ واہ بھئی واہ عجیب معاملہ ہے باپ شادی کا شوقین ہے اور بیٹا منگنی پر شرم کے مارے چھپا ہوا ہے۔"

ایلی کا دل دھک دھک کرنے لگا اور وہ سمٹ کر پرانے ڈبوں کے انبار کے پیچھے سرک گیا اور چچا ہنستے ہوئے چل پڑے۔

پھر رضا نے شور مچا دیا۔ "سن لیا گدڑی کے لعل اب چھپے ہی رہو گے کیا۔" ایلی کا جی چاہتا تھا کہ رضا کو گالیاں دے لیکن گالی دینا اس کے نزدیک جائز نہ تھا۔ وہ گالی دینے کی جرأت نہ رکھتا تھا "بہت برے ہو تم۔ بہت برے جو راز کھول دیتے ہو۔" وہ غصے میں چلایا۔

رضا قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ "شرمیلو میاں راز تو ہوتے ہیں اس لیے کہ انہیں کھولا جائے اور لڑکیاں ہوتی ہیں اس لیے کہ انہیں پھانسا جائے آج تو تمہیں مونچھوں پر تاؤ دے کر چلنا چاہئے آج تم...... لیکن تمہارے منہ پر مونچھ بھی ہو۔"

پھر کوئی محلے والی آ نکلی ادھر "ہائیں تو یہاں بیٹھا ہے۔" اس نے رضا سے کہا۔ "یہاں بیٹھا ہے تو اور تیرے دوست کی منگنی ہو رہی ہے آج تو تیری پانچوں گھی میں ہونی چاہئیں۔" "فی الحال تو سر ہی کڑھائی میں ہے۔ اماں۔" رضا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "اے ہے۔" ماں مسکراتے ہوئے بولی۔ "بات کرنے سے نہ چوکے گا تو۔ ایک رگ زیادہ ہے نا۔ سچ کہا ہے کسی نے لنگڑے کی ایک رگ زیادہ ہوتی ہے۔"

"ایک نہیں ماں یہاں تو کئی زیادہ ہیں۔" رضا نے جواب دیا اور بڑھیا ہاتھ چلاتی آنکھوں سے گھورتی اور ہونٹوں سے مسکراتی چلی گئی۔

پھر ارجمند آ کر چلانے لگا۔ "ارے لنگڑے کہاں چھپایا ہے اس گدڑی کے لعل کو۔ نہیں بتائے گا سالے تو دوسری بھی لنگڑی کر دوں گا۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ لپٹنے کے لیے لنگڑی لاجواب ہے۔" رضا نے جواب

دیا۔

''یہ لپٹن وپٹن سب نکال دوں گا بتا کہاں ہے۔''

''یہیں کہیں ہو گا شرم سے منہ چھپائے ہوئے۔'' رضا نے اشارہ کیا۔

''یہ لپٹن وپٹن سب نکال دوں گا بتا کہاں ہے۔''

''اے تو یہاں ہے۔'' ارجمند اندر آ کر بولا۔ ''بس ناس کر دیا تو نے یہ لیبل لگا کے ستیاناس ہو گیا۔ اینٹ الجبر کی قسم تمہاری اس حرکت نے سارا انکر اینڈی ختم کر کے رکھ دیا۔ اب نہ پریم ٹونا کام آئے گا نہ پریم سندیس اور نہ پریم پتر سب بدک کر بھاگ جائیں گی تیرے اس لیبل کو دیکھ کر۔ دوست تو ہمیں بھی لے ڈوبا آٹے کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔ چل میں چھپ کے کیوں بیٹھا ہے۔ چل وہ کپ کیپ اور ہکوری ڈکوری جمع ہیں۔ بھئی واہ کیا پھبن ہے چل اب پھنس گئی تو پھڑکن کیسا۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔''

عین اس وقت جمیل آ گیا۔ ''چلو بھائی۔'' وہ چلایا۔ ''کیا یاد کرو گے کہ دوست کی منگنی پر کچھ نہ کھلایا۔ آج جو جی چاہے کھاؤ۔ چلو تنگ گلی کے حلوائی نے تازہ پیڑے بنائے ہیں۔''

''ارجمند کو تو کیپ کپ کی لگی ہے۔ چلو ہم تینوں چلتے ہیں۔'' رضا نے شرارت سے لنگڑی ٹانگ کی ہاکی جھلا کر کہا۔

''اچھا بھئی اگر پنچوں کی یہی مرضی ہے تو آج کے دن ہم بھی پیڑے کھا کر گزارہ کر لیں گے کیا کیا جائے۔'' ارجمند بولا۔

مجبوراً ایلی ان کے ساتھ چل پڑا مگر اسے رہ رہ کے خیال آتا کہ اگر کسی نے اسے مٹھائی کھاتے ہوئے دیکھ لیا تو کیا کہیں گے لوگ کہ اپنی منگنی کی خوشی منا رہا ہے۔

بہانہ بنا کر اس نے جست لگائی تا کہ رستے میں وہ اس کا مذاق نہ اڑائیں۔

ارجمند ہنسا۔ ''بڑی بے صبری ہے بھئی آج۔ بیچارے کو کیا معلوم کہ ابھی تو

صرف سیٹ ریزرو ہوئی ہے۔ریشمیں گٹھڑی تو نصیب سے ملے گی۔"

رضا۔ ارجمند اور جمیل سے کنی کاٹ کر وہ چھپتا چھپاتا سیدھا شریف کے پاس جا پہنچا تا کہ وہاں اطمینان سے بیٹھ سکے۔ شریف اسی طرح منہ میں حقے کی نے لیے چھت کی طرف گھور رہا تھا۔ گھر کے سب افراد کلثوم کے یہاں تقریب منانے کے لیے جا چکے تھے۔ اس لیے مکان سنسان پڑا تھا۔

"آ گئے تم۔" شریف مسکرایا۔ "مجھے معلوم تھا۔ تم آ ؤ گے۔ ان ظالموں نے تمہیں بھی جکڑ دیا۔ تمہاری قسمت پر بھی مہر ثبت کر دی۔" اس نے ایک لمبی آہ بھری۔ "ان کی خوشی اسی میں ہے کہ لوگوں کی تقدیروں سے کھیلیں۔" ایلی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ منگنی کرنے میں تقدیر سے کھیلنے کی کیا بات تھی۔

"نہیں۔ نہیں۔" وہ دبی آواز سے بولا۔ "اماں نے تو مجھے صرف نامزد کیا ہے تا کہ ابا اپنے رشتہ داروں کی جھولی میں نہ ڈال دیں۔"

"وہ یونہی کہا کرتے ہیں۔ ایلی وہ یونہی کہا کرتے ہیں۔ وہ یونہی بھولے نوجوانوں کو دام میں پھنسایا کرتے ہیں اور تم ان کے دام میں پھنس گئے ہو۔"

"نہیں۔ نہیں۔" ایلی چلایا۔ اسے یہ جان کر صدمہ ہوا کہ شریف اسے بچہ سمجھتا ہے۔ ایلی کی خواہش تھی کہ شریف اسے دوست سمجھے اور کھل کر اس سے باتیں کرے۔ اپنی زندگی کے راز بتائے۔ یوں مشورے دے جیسے کہ دوستوں کو دیئے جاتے ہیں۔

"نہیں۔ نہیں۔" وہ بولا۔ "اماں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔"

شریف قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ حقے کی نے اس کے منہ سے نکل کر نیچے گر پڑی۔ "ماں کے آنسو۔" وہ ہنسا قصائی کی چھری تو مفت میں بدنام ہے۔ وہ ذبح کرتی ہے ایلی مگر اس نے کبھی روپ نہیں بدلا۔ اپنے آپ کو کسی اور شکل میں پیش نہیں کیا۔ لیکن

ماؤں کے آنسو۔" اس نے دانت بھینچ کر کہا۔ "وہ اسی طرح ہاتھ جوڑتی ہیں۔ آنسو بہاتی ہیں اور پھر جب شکار پھنس جاتا ہے تو اس پر سواری کرتی ہیں۔ ماں کے آنسو۔" شریف نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔

عین اس وقت سعیدہ آ گئی۔ "ہائیں تو یہاں بیٹھا ہے ایلی۔" وہ چلائی۔ "خدا کے واسطے۔" اس نے شریف کے آگے ہاتھ جوڑے۔ "خدا کے لیے اب ایلی کی زندگی کو تباہ نہ کر۔ اپنی تو برباد کر لی۔ اب اس پر رحم کر۔ تجھے نہیں معلوم خالہ کی تمام امیدیں اور امنگیں ایلی سے وابستہ ہیں۔" سعیدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"میری طرف دیکھ۔" شریف نے ایک دیوانہ وار قہقہہ لگایا۔ کہنے لگا۔ "ماں کی آرزوئیں پوری ہوں۔ بہنوں کی امنگیں پوری ہوں مگر۔" بات ختم کیے بغیر وہ خاموش ہو گیا اور چھت کی طرف گھورنے لگا۔

"تم نے اس کی ماں کے آنسو نہیں دیکھے۔" سعیدہ غصے میں چلائی۔

"تمہارے بھی دیکھ رہا ہوں۔" شریف نے مسکرا کر کہا۔ "کیا فرق پڑتا ہے۔"

"ادھر آ ایلی۔" سعیدہ نے ایلی کا بازو پکڑ کر اسے کھینچ لیا۔ "جا گھر جا۔ ماں تیرا انتظار کر رہی ہے۔ یہاں بیٹھ کر کیا حاصل ہو گا تجھے۔ جا گھر جا۔"

ایلی چپ چاپ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اندھیری ڈیوڑھی میں وہ رکا باہر عورتیں باتیں کر رہی تھیں۔

"اچھا ہی کیا چاچی ہاجرہ نے جو بیٹے کو ابھی جکڑ لیا ورنہ بڑے ہو کر یہ قابو میں آتے ہیں کیا۔"

"توبہ کرلڑکی کوئی زمانہ آیا ہے۔"

"پر میں کہتی ہوں بچی بات بگڑتی ہو تو بگڑ کر ہی رہتی ہے۔ چاہے جو کر لو آخر اس کے ابا کا بیاہ بھی تو چھٹپن میں ہی ہوا تھا۔ ہاجرہ سے۔ اب دیکھ لو اس نے کیا کر دکھایا۔"

"ٹھیک کہتی ہے تو غیب کی بات کون جانے پر میں کہتی ہوں آخر ہے اسی کا بیٹا۔ یہ کیا کم گل کھلائے گا۔"

ایلی سوچ رہا تھا۔ نہ جانے کونسی بات سچی تھی۔ اماں کے آنسو یا شریف کا قہقہہ۔ ڈیوڑھی سے نکل کر وہ چپکے سے دادی اماں کے پاس چلا گیا۔ دادی نے اسے دیکھ کر تیوری چڑھالی۔

"اے ہے کہاں بھٹکتا پھرتا ہے تو۔ ادھر تیری ماں اپنا چاؤ پورا کر رہی ہے۔ آخر وہ تمہارا باپ ہے۔ اس کی رضامندی تو لی ہوتی تیری ماں نے۔ رضامندی نہ سہی اس سے بات ہی کی ہوتی آخر گھر کے مرد سے بات کرنی ہی چاہیے تھی۔ ہاجرہ کی یہ سینہ زوری توبہ کیا زمانہ آیا ہے۔ یہ دیکھ لو علی احمد کی چٹھی۔ میرے خط کے جواب میں کیا لکھا ہے۔ اس نے۔" دادی اماں نے تخت سے چٹھی اٹھا کر اسے دی۔ بولی۔

"وہ تو لکھتا ہے ہمیں معلوم نہیں کہ ایلی کی منگنی ہو رہی ہے۔ کہاں ہو رہی ہے۔ ایلی کی ماں ہی جانتی ہوگی۔" وہ اپنی مرضی کر رہا ہے یہ اپنی مرضی کر رہی ہے اور تو میرے لال تو خواہ مخواہ ان چکی کے پاٹوں میں پسا جا رہا ہے۔ آ بیٹھ یہاں میرے پاس۔ دیکھ تو میں نے تیرے لیے کیا منگوایا ہے۔ غضب خدا کا ادھر علی احمد آنکھیں دکھا رہا ہے ادھر یہ بی بی آنسو چھلکا رہی ہے۔ آ بھی جا اب۔"

یہ پہلا دن تھا جب اس نے محسوس کیا کہ دادی اماں پریشان ہے۔ اس کے ماتھے پر تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ ویسے وہ گھورتی تو وہ روز ہی تھی۔ جب محلے کے لڑکوں پر گرجتی تھی تو وہ سب بھاگ کر چھپ جایا کرتے تھے۔ مگر ایلی کے لیے گویا وہ تیوری محض دکھاوے کی ہوتی تھی۔ تیوری ہونے کے باوجود وہ تیوری تلخی کی حامل نہ ہوتی تھی اور ایلی اسے دیکھ کر ہنس دیا کرتا تھا لیکن اس روز دادی اماں تیوری چڑھانے کے بغیر ہی گھور رہی تھی۔ جیسے اپنے آپ کو گھور رہی ہو۔ اپنی بے بسی پر تلملا رہی ہو۔

باہر بینڈ بج رہا تھا۔ دور کلثوم کے گھر میں لڑکیاں ڈھولک پر گیت گا رہی تھیں۔

"نی متھا تر اچندور گا بو دی کنڈلاں والی او۔"

ایلی کی منسوبہ ثمرہ اس کی خالہ زاد بہن کلثوم کی لڑکی تھی۔ کلثوم کے گھر وہ اکثر جایا کرتا تھا اور دیر تک وہاں بیٹھ کر باتیں کیا کرتا تھا۔ اس دوران کئی بار ثمرہ بھی وہاں آتی یا ادھر ادھر کام میں مصروف رہتی۔ اس کے باوجود اسے ثمرہ کی شکل وصورت کے متعلق کچھ اندازہ نہ تھا۔ منگنی کے روز ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ اس نے ثمرہ کو کبھی دیکھا ہی نہیں۔ اس کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ ثمرہ کو غور سے دیکھے۔ کیسی ہے۔ لیکن کسی کے گھر جا کر لڑکی کو غور سے دیکھنا ایلی کے لیے ممکن نہ تھا۔ اسے نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی اور لڑکیاں بھی تو عجیب ہوتی ہیں پاس جا کر دیکھو تو یوں چنری سنبھال کر بیٹھ جاتی ہیں جیسے بے جان گڑیاں ہوں۔ دور سے کھڑکی میں کھڑے ہو کر دیکھو تو مورنیوں کی طرح دم پھیلا پھیلا کر ناچتی ہیں۔ چڑیوں کی طرح پھدکتی ہیں۔ دور سے دیکھنے میں کس قدر لطف آتا تھا۔ لیکن قریب سے اب تو ثمرہ کو قریب سے دیکھنا بالکل ہی ممکن نہ تھا۔ اب تو اس گھر میں پاؤں دھرنا بھی مشکل تھا۔

ایلی کی نظر میں کلثوم کے گھر کے مناظر یوں چلنے لگے جیسے فلم چلتی ہے۔ دم پھیلا کر ناچتی ہوئی ثمرہ سرخی اور پاؤڈر سے تھپے ہوئے چہرے والی کلثوم جس کے گلے میں پھولوں کے ہار لٹکا کرتے تھے اور مرجھائے ہوئے چہرے والا رحم علی جو کلثوم کا خاوند تھا۔ جسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ مظلوم ہو۔ جیسے وہ کلثوم کا میاں نہیں بلکہ نوکر ہو۔ دفعتاً ایلی کی نگاہوں تلے روغنی چہرے والی ثمرہ گلے میں ہار ڈالے آ کر چوکی پر بیٹھ گئی۔ اس کے اپنے چہرے میں تبدیلی رونما ہوئی۔ گال پچک گئے منہ پر جھریاں پڑ گئیں اور صورت رحم علی کی سی ہو گئی اور وہ ثمرہ کی چوکی کے قریب یوں جا کر کھڑا ہوا جیسے رحم علی ہو۔ ایک مظلوم فرد، نوکر، ایلی چونکا اور گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

"کیا ہے تجھے۔" دادی اماں چلائی۔ "اتنا بے قرار کیوں ہے تو۔ لیٹ جا آرام

سے۔ لیٹ جا۔"

پھر ایلی کی نگاہوں تلے چچا ہنسنے لگے۔ "بڑی دھوم سے منگنی کی ہے ہاجرہ نے۔"

"ستیاناس کر دیا۔ سوا ستیاناس۔" ارجمند چلایا۔ "لیبل لگا کے کیوں مری مٹی خراب کی۔ ساری انکر اینڈی ملیامیٹ ہو گئی۔"

پھر ہاجرہ اس کے روبرو آ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "میری عزت تیرے ہاتھ ہے۔"

"اچھا کیا بچپن میں ہی جکڑ لیا۔" ایک عورت بولی۔

ماں کے آنسو۔ ہاہاہا۔ شریف کا قہقہہ سنائی دیا۔ ماں کے آنسو وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔" دادی اماں نے گویا شریف کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ "کیا ہے تجھے۔" وہ بولی۔

دور لڑکیاں گا رہی تھیں۔ "بیٹھی ہنجواں دے ہار پروواں۔"

تھیلی میں مینڈک

اگلے روز ہاجرہ ایلی کو اکیلے میں لے گئی۔ کہنے لگی۔ "شریف کی باتوں میں نہ آنا ایلی وہ تو خواہ مخواہ تجھے گمراہ کر رہا ہے۔ لو کوئی بات ہے بڑا اپدیشک دیکھ لو۔ شادی کے خلاف پرچار کرتا ہے۔ بھلا خود کیوں اپنی شادی کروا رہا ہے۔ سعیدہ سے منتیں کیوں کرتا ہے۔ کیوں اس کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہے۔"

"ہاتھ جوڑتا ہے؟" ایلی نے حیرانی سے پوچھا۔ "وہ کس لئے؟"

"کہتا ہے میرا بیاہ کر دو۔ میں اپنا گھر بساؤں گا۔ دیکھ لو۔ خود تو اتنا چاؤ ہے دوسرا بیاہ کرے گا اور تمہیں منگنی کے خلاف اکسا رہا ہے۔ توبہ کوئی حد ہوتی ہے زمانہ سازی کی۔"

زمانہ سازی اور شریف۔ ایلی کو یقین نہیں آ رہا تھا "نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔

نہیں ہو سکتا۔" وہ اٹھ بیٹھا "نہیں اماں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ چلایا۔ "پوچھ دیکھ تو اس سے۔" ہاجرہ چمک کر بولی۔ "میں کیا غلط کہہ رہی ہوں۔"

ہاجرہ کے جانے کے بعد وہ سیدھا شریف کے گھر پہنچا اور جاتے ہی بات چھیڑ دی۔ "آپ کی شادی ہو رہی ہے کیا؟" اس نے شریف سے پوچھا۔

شریف کے ہونٹوں پر زہر خند پھیل گیا چھت کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے آہ بھری۔ "شادی" وہ ہنسنے لگا۔ عجیب سی ہنسی تھی وہ اس میں مسرت کی بجائے دھمکی تھی خوفناک دھمکی جیسے وہ شادی کی بجائے انتقام لے رہا ہو۔ اس کے قہقہے میں ایک تسلسل پیدا ہوتا گیا خوفناک تسلسل اور آواز بتدریج بلند ہوتی گئی۔ اس قدر بلند ہو گئی کہ گھر کے سب لوگ بھاگ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ "کیا ہوا۔ کیا ہوا۔ کیا بات ہے۔" مگر شریف کسی کو جواب دیئے بغیر اسی طرح قہقہہ مار کر ہنسے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔ منہ سے رال کے تار نکل رہے تھے۔ چہرا سرخ ہو گیا تھا۔

"اب کیا محلے والوں کو تماشا دکھانا ہے۔" سعیدہ چلائی۔ "یا کوئی نیا کھیل ہے۔"

"اللہ رکھے اگلے ہفتہ برات لے کے جانا ہے۔ بہن شادی کی خوشی ہے ہنس لینے دو۔" رابعہ نے بات ٹالنے کو کہا اور پھر ایلی کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "آ تجھے دکھاؤں کیسے اچھے کپڑے بنوائے ہیں اس کی دلہن کے لیے۔" وہ گھسیٹ کر ایلی کو دوسرے کمرے میں لے گئی۔

"لیکن خالہ۔" اس نے رابعہ اور سعیدہ سے پوچھا۔ "کہاں ہو رہی ہے شریف کی شادی؟"

"بہت دور۔" رابعہ نے کہا۔ "بہت دور جہاں وہ نوکر ہے وہاں نہ جانے کیا نام ہے اس جگہ کا۔"

"مگر بہن۔" سعیدہ نے کہا۔ "ہم تو وہ خرم آباد کے رہنے والے نوکری نور پور

میں کرتے ہیں نا لڑکی کے ابا بہت بڑے افسر ہیں۔ غلام علی نام ہے۔" دوسرے کمرے میں شریف کا قہقہہ ختم ہو چکا تھا اور اب وہ کھانس رہا تھا جیسے تھک کر ہار گیا ہو۔

"دیکھا۔" رابعہ نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ "اکیلے میں سب ٹھیک ہو گیا۔ اب وہ کھانس رہا ہے تم تو بہن اس کی دیوانگی کو اور بھی ہوا دیتی ہو۔"

"لو مجھے کیا معلوم کہ ایسی ہوتی ہیں یہ باتیں۔" سعیدہ بولی۔ "میں ذرا جا کر دیکھوں۔" ایلی نے دبی زبان سے کہا اور پھر چپکے سے شریف کے پاس جا بیٹھا۔ شریف آنکھیں موندے ٹیک لگائے چپ چاپ بیٹھا تھا۔

پھر دفعتاً اس کی نگاہ ایلی پر پڑی۔ ہونٹوں پر تبسم لہرایا۔ "شادی" وہ مدھم آواز میں بولا۔ "اب شادی کیا ہو گی۔ جب شادی کی آرزو تھی۔ تب تو یہ سب میرے راستے میں دیوار بن کر کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ انور اور شریف کی شادی ہو سکتی نہیں ہو سکتی۔ ظالموں نے مجھے قید کر لیا اور اسے شہر سے دور نہ جانے کہاں لے گئے۔ اب کیا ہے۔" اس نے لمبی آہ بھری۔ "یہ سمجھتے ہیں میں شادی کر رہا ہوں۔ ان کو کیا معلوم ایلی۔ ان میں احساس نہیں۔ یہ کیا سمجھیں گے۔" پھر وہ ایلی کے قریب تر ہو گیا اور رازدارانہ انداز میں بولا۔ "نہیں نہیں معلوم ایلی کہ میں صرف اس لیے شادی کر رہا ہوں کہ اس کا دل نہ ٹوٹے۔ اس کی زندگی تباہ نہ ہو۔ جیسے میری زندگی تباہ ہوئی تھی اور وہ کتنی معصوم ہے تم دیکھو گے تو اندازہ ہو گا تمہیں اس بیچاری کو کیا معلوم کہ محبت کسے کہتے ہیں۔" شریف نے جھرجھری لی۔ "نہ جانے اسے کیا نظر آیا ہے مجھ میں۔ نہ جانے اسے کیا خوش فہمی ہے۔ کاش وہ کسی جیتے جاگتے نوجوان کو چنتی۔ مجھ ایسے مردہ شخص میں اب کیا رہ گیا ہے۔ جو تھا وہ لوگوں کے ظلم کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اب کیا دھرا ہے۔ لیکن اسے کون سمجھائے۔ جو ابھی دہلیز پر کھڑی مسکرا رہی ہو اسے کیا معلوم کہ زندگی کیا چیز ہے۔ نہ جانے محبت نے اس پر کیا جادو کر دیا ہے۔

واقعی ہی وہ شہزادی ہے۔اسم با مسمی ہے۔مجھے چھپ چھپ کر دیکھنے کے بعد ایک روز وہ مکان کی دہلیز سے باہر آ گئی۔میرے روبرو اور اس نے ایک مینڈک کے ذریعہ اظہار محبت کر دیا۔''

''مینڈک کے ذریعے محبت۔'' ایلی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں مینڈک کے ذریعہ اظہار محبت۔'' شریف ہنسنے لگا۔''اس نے مینڈک کو ایک تھیلی میں ہی رکھا تھا جب میں سو رہا تھا تو اس نے وہ تھیلی مجھ پر پھینک دی۔میں ڈر کر اٹھ بیٹھا وہ ہنسنے لگی۔'' شریف نے ہنستے ہوئے کہا۔''محبت بھی اظہار کے انوکھے طریقے پیدا کرتی ہے۔انوکھے۔'' وہ رک گیا اور طویل خاموشی کے بعد بولا۔ ''مجھے اس کی محبت کا احترام ہے ایسے تو شاید میں ٹھکرا دیتا۔مگر محبت کو کیسے ٹھکرا سکتا ہوں۔میں نے خود محبت کی ہے۔میں جانتا ہوں کہ محبت کیا ہوتی ہے۔عجیب چیز ہے محبت۔عجیب،تم محبت کرو ایلی۔کسی سے کرو مگر محبت کرو۔'' اس نے ایک طویل آہ بھری اور خاموش ہو گیا۔

آٹھ روز کے بعد وہ سب برات لے کر نور پور جا رہے تھے۔اس انوکھی لڑکی کو دولہن بنا کے لانے کیلئے جس میں اتنی جرأت تھی کہ گھر کی دہلیز سے باہر نکل کر شریف پر مینڈک پھینک سکتی تھی۔وہ لڑکی جسے ایسا انوکھا اظہار محبت سوجھ سکتا تھا۔

محلے میں تو ایک بھی لڑکی ایسی نہ تھی جس میں مذاق کرنے کی صلاحیت ہو یا جس میں جرأت ہو۔انہیں تو دبے پاؤں چلنے۔چھپ چھپ کر جھانکنے اور منہ پر پلو لے کر مسکرانے کے سوا کچھ نہ آتا تھا۔

لڑکے چوگان میں کھڑے ہو کر رشمیں رومال ہلاتے ہلاتے اور بال ٹھیک کرنے کے بہانے سلام کرتے کرتے تھک جاتے مگر وہ یوں بے حس و حرکت کھڑی رہتیں۔جیسے پتھر کی بنی ہوئی ہوں چند ایک جن پر محلے کا اثر زیادہ نہ تھا لڑکوں کو دیکھ کر دوڑتیں بھاگتیں۔ایک دوسری کو پکڑتیں۔پلو جھٹکتیں۔اسے سنبھالتیں سبھی کچھ کرتیں

مگر اظہار محبت کرنا تو کیا انہیں پیغامات محبت کو مناسب طور پر وصول کرنے تک کا شعور نہ تھا۔

جس دن سے شریف نے ایلی کو اپنا راز بتایا تھا اسی دن سے بیٹھے بٹھائے ایلی کی نگاہوں تلے ایک شوخ متبسم حسینہ آ کھڑی ہوتی۔ اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی اور ایلی کا جی چاہتا کہ وہ دہلیز سے باہر نکل آئے اور پھر ہتھیلی میں سلا ہوا مینڈک دھپ سے اس کے سینے پر آ گرے اور وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور فضا میں ایک مدھم مگر رنگین قہقہہ یوں گونجے جیسے گھنٹیاں بج رہی ہوں۔

اس روز برات کے ساتھ نور پور جاتے ہوئے وہ غیر معمولی طور پر خاموش تھا۔ کھڑکی سے باہر ٹیالے ٹیلے دوڑ رہے تھے۔ کبھی کوئی گہرا کھڈ منہ پھاڑے آ نکلتا جس کے تلے دور پانی کی ندی ناچتی۔ پھر وہی ٹیلے اور ان پر یہاں وہاں خشک ٹنڈ منڈ درخت۔ ایلی کی نگاہیں اس گلابی افق میں کھوئی ہوئیں تھیں جو اس کے اندازے کے مطابق ان کی منزل تھا اور وہاں گلابی متبسم چہرہ اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

ڈبے میں بیٹھے ہوئے براتی اپنی باتوں میں مگن تھے۔ ہر چند منٹ کے بعد ایک قہقہہ گونجتا۔ کسی پر آوازہ کسا جاتا اور ایلی چونک کر ادھر دیکھتا۔

ایک طرف محلے کے بزرگ تھے دوسری طرف جوان اور تیسری طرف اس کے اپنے ساتھی۔ ارجمند، رضا اور رفیق۔ ہر گروہ اپنے اپنے مشاغل میں منہمک تھا۔ صرف دو فرد اکیلے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ایک کونے میں شریف تھا جو مسلسل گاڑی کی چھت کو گھورے جا رہا تھا۔ دوسری طرف ایلی تھا۔ جو کھڑکی سے باہر کسی رنگین افق کو دیکھنے میں کھویا ہوا تھا۔ ممکن ہے۔ ریل کی چھت میں شریف بھی وہی رنگین افق دیکھ رہا ہو۔ ان دونوں کو منزل کا خیال لگا ہوا تھا۔ دونوں کے سینوں میں مینڈک کود رہے تھے دونوں کی نگاہوں میں رنگین تبسم جھلملا رہے تھے۔

ہر چند منٹ کے بعد غالباً اپنے تخیل اور محسوسات کی نوعیت سمجھ کر ایلی احساس

ندامت سے گھبرا جاتا۔ اس خیال پر ندامت محسوس کرتا کہ اپنے دوست کی بیوی کو تاک رہا ہے۔ محسوس کرتا کہ وہ مجرم ہے پھر گھبرا کر لاحول پڑھتا اور کسی اور بات کی طرف متوجہ ہونے کی ناکام کوشش کرتا۔ پھر دفعتاً اس کے تخیل میں شہزادی پیچھے ہٹ جاتی اور اس کی چھوٹی بہن آگے بڑھتی۔ شاید اس میں بھی دہلیز پار کرنے کی جرأت ہو۔ شاید اسے بھی مینڈک پھینکنے سے دلچسپی ہو۔ اس خیال پر وہ اطمینان کا سانس لیتا اور پھر سے اپنے رنگین خواب میں کھو جاتا۔

ایلی کے ذہن میں ایک نئی امید کروٹ لے رہی تھی۔ ایک نئی دنیا ابھر رہی تھی۔ دور سامنے ٹیلے کی اوٹ میں مینڈکوں کی جھیل کے کنارے ایک دوشیزہ اسے دیکھ کر مسکراتی اسے اشارے کرتی ایلی کے جسم پر چیونٹیاں رینگتیں سینے میں مینڈک پھدکتے اور دل میں نہ جانے کیا کیا ہوتا۔

شریف بھی بار بار چونکتا جیسے وہ بھی خود کو مجرم سمجھ رہا ہو۔ جب وہ اس رنگین منزل کے خیال میں کھویا ہوا ہوتا تو ایک سوگوار چہرہ اس کے روبرو آ کھڑا ہوتا۔ ستا ہوا منہ کھلے پریشان۔ ہونٹوں پر زہر خند۔ اسے دیکھ کر شریف کو احساس ہوتا کہ وہ انور سے بے وفائی کر رہا ہے۔ انور کی زندگی تباہ کر کے خود رنگین افق آباد کر رہا ہے۔ اس خیال پر وہ گھبرا جاتا۔ پھر اس کی آنکھوں میں حزن و ملال کی گھٹائیں ابھرنے لگتیں دل سے آواز بلند ہوتی نہیں نہیں میرا کیا ہے۔ یہ سب تو اس لیے ہے کہ اس کا دل نہ ٹوٹے۔ اس کی زندگی تباہ نہ ہو۔

براتی دولہا میاں کی حالت کو دیکھ کر مسکراتے۔

”دیکھو بھئی یہ دولہا میاں ہیں یوں اپنی برات لئے جا رہے ہیں۔ جیسے کوئی دار پر چڑھ رہا ہو۔“

علی احمد قہقہہ لگاتے۔ ”جبھی تو علی احمد دار پر چڑھتے چڑھتے نہیں تھکتے۔“

نوجوان چھپ چھپ کر مسکراتے سرگوشیاں کرتے اور پھر ارجمند با آواز بلند

کہتا۔ ”میاں ایلی تم تو یوں بیٹھے ہو جیسے کوئی دار پر چڑھنے والا ہو۔“

”کیوں میاں اسے شوق نہیں کیا۔ بیٹا کس کا ہے۔“

اور سب علی احمد کی طرف دیکھ کر ہنستے اور گاڑی چیختی چلاتی ہوئی دوڑے جاتی۔

بالآخر ایک وسیع و عریض پلیٹ فارم پر گاڑی رک گئی۔ ”لو بھئی نورپور آ گیا۔“ کوئی چلایا ایلی کا دل اچھل کر حلق میں آ پھنسا۔

وہ ایک عجیب سا سٹیشن تھا۔ جیسے ایک وسیع و عریض ریس کورس ہو۔ پلیٹ فارموں کی چوڑائی اور لمبائی عام پلیٹ فارموں سے کئی گنا زیادہ تھی۔ سٹیشن کے احاطے کے چاروں طرف قدآدم فصیل تھی۔ جس میں ایک پھاٹک لگا تھا۔ جس سے ریل اندر داخل ہوتی ایک طرف سرخ رنگ کا ایک اونچا قلعہ بنا ہوا تھا جس کی دیواروں میں بندوق کی نالیوں کے لیے سوراخ چھوڑے ہوئے تھے۔ دوسری جانب سٹیشن کے سٹاف کے رہائشی کوارٹر تھے۔ بیٹھے بیٹھے سے معمولی کوارٹر اور قلعہ کے پیچھے اونچے سیاہ پہاڑ ایستادہ تھے۔

ایلی نے تعجب سے چاروں طرف دیکھا۔ پھر اس کی نگاہیں ان کوارٹروں کی طرف مرکوز ہو گئیں۔ اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کھڑکیوں اور دروازوں کے پیچھے مینڈکوں سے بھری ہوئی تھیلیاں رکھی ہوں۔

باہر سٹیشن کے احاطے میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں سے مینڈک دستیاب ہو سکتے ہوں۔ مینڈک کیا وہاں تو تالاب یا چھپڑ کا نام ونشان تک نہ تھا۔

پھر وہ ایک بہت بڑے کمرے میں کھانا کھا رہے تھے۔ بھنے اور تلے ہوئے مرغ مسلم رکابیوں میں پڑے تھے۔ قسم قسم کے چاول اور گوشت۔ وہ حیرانی سے ان بھرے قابوں کی طرف دیکھ رہا تھا جو گوشت سے لدے ہوئے تھے۔ علی احمد قہقہہ مار کر ہنس رہے تھے۔ محلے والوں کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں اور شہزاد کے والد کی آنکھوں میں پھلجھڑیاں چل رہی تھیں۔

”کیا جوڑی ہے۔“ چچا چلانے لگے۔ ”بھائی غلام علی اور علی احمد کی واہ وا۔“

”وہ کہتے ہیں نا“ کسی نے آوازہ کسا ”ساجن سے ساجن ملے کر کر لمبے ہاتھ۔“

”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر بھائی غلام علی۔“ علی احمد ہنسے اور پھر مسلم مرغ پر پل پڑے۔

پھر ایک نوکرانی آ کر چلانے لگی۔ ”ایلی کو اندر بلایا ہے۔“ ”اندر بلا رہے ہیں ایلی کو۔ ایلی کو اندر بلایا ہے۔“ چاروں طرف سے آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایک بھیانک دف بجنے لگی۔ ایلی کی رگوں میں کوئی ڈھمکی بجانے لگا نگاہوں میں اردگرد کی چیزیں دھندلا گئیں۔

اندر جاتے ہی نہ جانے اسے کیا ہوا اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ حلق آواز سے خالی ہو گیا۔ بازو لٹکنے لگے۔ چاروں طرف سے بھنبھناہٹ سی سنائی دے رہی تھی مگر وہ گردن نہ اٹھا سکتا تھا۔ ”اپنے علی احمد کا ایلی ہے“ محلے والی کی مکروہ آواز سنائی دی۔

”اچھا بھئی جیتا رہے۔“ دو بڑے بڑے ہاتھوں نے اس کے سر کو گرفت میں لے لیا اور پھر وہ بھاگا۔

نہ جانے ایسا کیوں ہوتا تھا۔ کیوں جب وہ منزل پر پہنچتا تو اس کے پاؤں میں چلنے کی سکت نہ رہتی۔ اس کے بازو شل ہو جاتے۔ نگاہیں احساس ندامت سے دھندلا جاتیں۔ ایسا کیوں تھا۔ پھر جب وہ تخلیے میں اپنے تخیل کی دنیا میں واپس پہنچتا تو اندھے کی طرح منزل سے چمٹ جاتا۔ اس کی گرفت میں دیوانگی کا عنصر پیدا ہو جاتا تھا۔

مونگیا گھڑی

پھر وہ نور پور سے واپس آ رہے تھے اور ایلی احساس ناکامی کی وجہ سے خاموش تھا۔ اس کے تخیل کے پر گویا کٹ چکے تھے۔ بازوؤں میں طاقت پرواز نہ رہی تھی۔

اس کے سامنے کوئی افق نہ تھا۔ مٹیالے ٹیلے۔ ٹنڈ منڈ درخت اور پھیلی ہوئی ویرانی۔

پھر ارجمند اسے جھنجھوڑ رہا۔ ”ابے او مردے۔“ وہ چلایا۔ ”تو پہلے ہی فوت ہو گیا بڑا اچھا ہوا۔ ورنہ آج ہماری طرح حرام موت مرتا بچ گیا یار۔ تو ہمیشہ ہی بچ جاتا ہے۔“

ارجمند کی بات سن کر ایلی حیران ہوا۔ ارجمند نے تو کبھی ایسی بات نہ کی تھی۔ اس کے انداز میں کبھی مایوسی نہ دیکھی تھی۔ پھر اسے کیا ہوا۔ وہ یوں سر کو ہاتھ سے تھامے بیٹھا تھا۔ جیسے قطعی طور پر تباہ ہو چکا ہو۔

”بیٹا ہمارا تو کلیان ہو گیا۔“ وہ دبی آواز میں بولا۔

”آخر بات کیا ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”بات“۔ ارجمند ہنسا۔ ”دیکھ لو رفیق کی آنکھوں میں۔ دیکھ لو وہ بات۔ دیکھ لو کیا بیتی ہم پر۔ یار ہم اس لائق تو نہ تھے۔“ ایلی نے رفیق کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گویا بیر بہوٹیاں رینگ رہی تھیں۔

”ہے ہے۔“ ارجمند بولا ”بس سمجھ لو وہ منظر جو کپ نے چھ سال کے بعد چھلک کر دکھانا تھا آج دیکھ لیا ہے میں کیا کروں۔“ اس نے لمبی آہ بھری۔ ”اب تو یہی ہے کہ چوہے کی طرح اس ٹکڑے کو کترتے رہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے جیب سے سوکھے ہوئے کیک کا ایک ٹکڑا نکالا اور اسے کترنے لگا۔ پھر ایلی کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ ”ہے ہے دے تو دوں تجھے بیٹا مگر جو ڈال سے توڑ کر کھانے میں بات ہے وہ کہاں اور پھر اپنے کے یہ ہاتھ بھی دیکھ لے جیسے کوہڑی کے ہوں اور وہ ہاتھ جن سے اس بھکاری کو یہ ٹکڑا ملا ہے۔ ہے ہے۔ اچھا چل تو بھی کرے دیوی کے درشن۔ کیا چیز ہے خدا کی قسم۔ آ تو بھی کیا یاد کرے گا۔“ وہ اسے گھسیٹ کر ڈبے سے باہر لے گیا اور پھر ملحقہ زنانے ڈبے میں اسے زبردستی ٹھونس کر چلانے لگا۔ ”یہ آیا ہے ایلی خالہ سعیدہ کہتا ہے میں خالہ سے ملوں گا۔“

''آ ایلی'' خالہ بڑے تپاک سے بولی۔ ''میں تو کب سے تیرا انتظار کر رہی تھی۔ یہ ایلی ہے۔ میری خالہ ہاجرہ کا بیٹا۔'' اس نے مونگیا گٹھڑی سے کہا جو پاس ہی سیٹ پر دھری تھی۔

مونگیا گٹھڑی میں جنبش ہوئی دو سفید خون میں بھیگے ہوئے ہاتھ ایلی کی طرف لپکے۔ تازہ خون کی بو کا ایک ریلہ آیا۔ ایلی بھاگنے کی سوچ رہا تھا کہ گٹھڑی کے پٹ کھل گئے۔ دو گلابی جھیلیں چھلکیں جن میں سیاہ گلاب ابھر رہے تھے۔ سارے منہ پر مخملی بیر بہوٹیاں رینگ رہی تھیں۔ پھر ایک چھلکا ہوا تبسم۔ ایلی کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ گرد و پیش جھلملا کر معدوم ہو گیا۔

سعیدہ نہ جانے ہاتھ ہلا ہلا کر کیا کہہ رہی تھی۔ باہر پلیٹ فارم پر ارجمند آنکھ بچا کر چھاتی پیٹ رہا تھا۔ رفیق رتھمیں رومال ہلا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بوندا باندی ہو رہی تھی۔ پرے علی احمد حسب دستور کولہوں پر ہاتھ رکھے ڈبے پر نگاہیں گاڑے کھڑے تھے جیسے کوئی چیل پر تول رہی ہو۔ ان کے قریب ہی صفدر انگلیوں میں سگریٹ تھامے چٹکی بجا بجا کر گنگنا رہا تھا۔ ''اے دل ربا میں ہوں فدا۔'' ایلی خاموش کھڑا تھا۔ نہ جانے کب تک ویسے ہی کھڑا رہا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ کب مونگیا گٹھڑے کے پٹ بند ہوئے۔

پھر اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ کھڑکی کے باہر ٹیلے بھاگ رہے تھے۔ یا سرسبز میدان پھیلے ہوئے تھے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ لوگ باتیں کر رہے ہیں یا ہنس رہے ہیں۔ دل میں ایک شور برپا تھا۔ رگوں میں لہریں اٹھ رہی تھیں۔ سینے میں دھنکی بج رہی تھی۔ سامنے ایک لق و دق ویرانہ پھیلا ہوا تھا اور اس ویرانے میں ایک مونگیا گٹھڑی پڑی تھی۔ اور دو خون آلود ہاتھ۔ اور گاڑی ہونکتی ہوئی جا رہی تھی۔

شہزاد

محلے میں شہزاد کی آمد یوں اثر انداز ہوئی جیسے جوہڑ میں پتھر گرتا ہے۔ محلے کے

بند پانی میں چاروں طرف چھینٹے اڑے جیسے سوڈے میں کسی نے نمک کی چٹکی ڈال دی ہو۔ پھر لہریں جو ہڑ کے طول و عرض تک دوڑ گئیں۔

عورتوں نے اسے دیکھا اور ہونٹوں پر انگلیاں رکھ کر خاموش ہو گئیں۔ بوڑھوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ مردوں کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ بوڑھے اسے دیکھ کر چپ چاپ مسجد کی طرف چل پڑے اور وہاں جا کر سبحان اللہ کا ورد کرنے لگے۔

محلے کے بڑوں میں صرف دو رنگیلے آدمی تھے جو عمر میں بڑے ہونے کے باوجود شوقین مزاج تھے اور زندگی میں لہریں پیدا کرنے کے قائل تھے۔ علی احمد اور محمد اعظم، انہیں لاحول پڑھنے، گردن جھکا نے کھانسنے یا مسجد میں جا کر سبحان اللہ کا ورد کرنے سے قطعاً دلچسپی نہ تھی۔ منہ سے گنگنانے کی بجائے سبحان اللہ، ان کی آنکھوں میں منعکس ہو جاتا۔ جھجک کر پیچھے ہٹ جانے کی بجائے وہ آگے بڑھ کر کوئی بات چھیڑ دیتے۔

"لڑکی تو اداس تو نہیں ہو گئی یہاں آ کر۔" محمد اعظم مسکراتے۔ "گھبرا نہیں دل لگ جائے گا۔" اور پھر ان کی نگاہوں سے ظاہر ہوتا کہ دل لگ کر سب ٹھیک ہو گیا ہے۔

صبح سویرے ہی محمد اعظم آ پہنچتے۔ "کیوں شہزاد کچھ پکانے کھانے کا بھی فکر ہے یا نہیں۔ خالی خولی شہزادگی نہیں چلے گی یہاں، بول کیا منگوانا ہے بازار سے۔ ہائیں بینگن کھائے گی۔ آج پھر بینگن اونہوں بینگن نہیں کھایا کرتے گرمی ہو جاتی ہے۔ اچھا شریف کو کھلائے گی بینگن۔ لیکن اس طرح کب تک گزارہ ہو گا۔" اور وہ قہقہہ مار کر ہنستے۔ "اچھا چائے کا پیالہ تو پلا ایک سودا کمیشن ادا کرنے کے بغیر نہیں لایا جاتا سمجھی، ہائیں تو بروک بانڈ پیتی ہے۔ اونہوں لڑکی چائے لپٹن کی۔" اور ان کی متبسم نگاہیں کسی رنگین پیالی سے لپٹ جاتیں اور انداز سے معلوم ہوتا جیسے بینگن کھا کے

آئے ہوں۔

محمد اعظم کا طریق کار گھریلو انداز کا حامل تھا۔ ان کی باتوں میں اپنا لینے کا پہلو واضح ہوتا۔ بات کر کے پہلو بدلتے۔ پہلو بدل کر پھر بات کرتے اور اس دوران میں نگاہوں سے جانچتے۔ اکساتے۔ علی احمد چل کر جانے کے قائل نہ تھے نہ انہیں سودا لا کر دینے کی بات پسند تھی اور نہ ہی وہ چائے کا پیالہ مانگنے کے قائل تھے۔ ان کی باتوں میں اشاریت کا پہلو ہوتا تھا۔ وہ دور کھڑے پہلے تو چیل کی طرح منڈلاتے پھر آواز دیتے۔ باتوں سے رجھاتے اور تمام تر بات زبان کی مدد کے بغیر نگاہوں ہی میں طے کر لیتے اور بالآخر بر سبیل تذکرہ آواز دیتے۔ ''میں نے کہا چاچی۔ ابھی آ جائیں گے چچا۔ مسجد ہی میں گئے ہیں تو کیوں پریشان ہو رہی ہے۔'' اور جب چاچی ہنس کر جھاڑ جھپٹ کرتی تو کہتے میں نے کہا۔ یہ شریف کے گھر کی کھڑکی میں کون کھڑی ہے۔ کوئی اندھی بہری معلوم ہوتی ہے نہ سلام نہ دعا نہ بات نہ چیت۔ اچھا تو تو ہے شہزاد میں سمجھا شاید اندر گیس جلا رکھا ہے۔ تو آئی نہیں کبھی۔ دکھائی ہی نہیں دیتی۔ نہ جانے کن مشاغل میں کھوئی رہتی ہے۔''

علی احمد شہزاد کی آواز سنتے تو شمیم کے چوبارے سے ملحقہ جنگلے میں نکل آتے اور شمیم کو یوں آواز دیتے جیسے شمیم سے بے حد ضروری کام پڑ گیا ہو۔ جب سے شہزاد نے محلے میں قدم رکھا تھا علی احمد کو بار بار شمیم سے کام پڑ رہا تھا۔ گھر کے تمام لوگ ان کے اس ضروری کام کی نوعیت سے واقف تھے۔ ایسے وقت سعیدہ گھٹنوں میں منہ دے کر ہنستی۔ دادی اماں مسکرا کر کہتی۔ ''توبہ اس لڑکے کو تو اپنی سدھ بدھ نہیں رہتی۔'' شمیم چوبارے میں ان کی آوازیں سنتی اور تیوری چڑھا کر اپنے آپ سے کہتی۔ ''میں جانتی ہوں ان کے ضروری کام کو اچھی طرح معلوم ہے مجھے۔ کون نہیں جانتا۔'' شہزاد جنگلے کے سامنے کھڑی ہوتی تو فوراً اسے آواز دیتے۔ ''شہزاد ہے۔'' وہ جنگلے سے چلاتے۔ ''سنا کیا حال ہے۔ نور پور تو نہیں یاد آتا۔ کھلے میدانوں میں

کلیلیں کرنے والیاں جب گھر میں قید ہو جاتی ہیں تو جی گھبراتا ہے نا۔ہی ہی ہی۔ اور وہ اپنی بات پر ہنسنے لگتے اور دیر تک ہنسے جاتے۔

شہزاد کو دیکھ کر صفدر اپنے کھدے ہوئے بازو کو بھول جاتا۔اسے بال جھٹک کر سر ہلانا بھی یاد نہ رہتا اور اپنا محبوب گیت حافظ خدا تمہارا، جو وہ پارسی لڑکی کے ساتھ سٹیج پر گایا کرتا تھا قطعی طور پر بھول جاتا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے میں کھو جاتا۔

محلے کے جوان تو شہزاد کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔اس کی ہر بات نرالی معلوم ہوتی تھی۔اس کا انداز بے حد انوکھا تھا۔چق کی آڑ میں کھڑی ہونے کی بجائے وہ چق کو لپیٹ دیتی اور چھپ کر دیکھنے کی بجائے اطمینان سے کھڑکی کے زریں سہارے پر پاؤں رکھ کے بے تکلفی سے ادھر ادھر دیکھتی۔وہ محلے والیوں کی طرح میلے اور سادہ کپڑے پہننا پسند نہ کرتی تھی۔اس کا دوپٹہ اعلانیہ شانوں پر گرا رہتا۔ جیسے وہ سر کی جگہ شانوں سے متعلقہ لباس ہو۔اس کے بال نیم کھلے رہتے اور آنکھوں کے کونوں میں دور کنپٹیوں تک سرمے کی دھار صاف دکھائی دیتی۔

رفیق اسے دیکھ کر گھبرا جایا کرتا۔اس کی گردن جھک جاتی۔اس کی نگاہیں احاطے کے فرش پر آوارہ ہو جاتیں اگرچہ ان میں ہوائیاں سی چلتی رہتیں۔اور اس کے ہونٹ نہ جانے کیا گنگناتے۔پھر وہ چپکے سے شہزاد کی سیڑھیاں چڑھ جاتا۔''چچی کوئی سودا تو نہیں منگوانا'' اور اس کی آنکھوں سے گلابی شرارے پھوٹتے اور ہونٹوں سے اف اف کی آواز پیدا ہوتی۔جیسے اسے بہت کچھ برداشت کرنا پڑ رہا ہو اور شہزاد بے نیازی سے اس کی طرف دیکھتی اور ''نہیں'' کہہ کر یوں بے پروائی سے کسی کام میں لگ جاتی جیسے پتہ ہی نہ ہو کہ رفیق کو اتنا کچھ برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔

ارجمند انکر اینڈی کا تمام تر سامان لے کر چوگان میں کھڑا ہو جاتا اور بہانے بہانے شہزاد کی کھڑکی کی طرف دیکھتا ریشمیں رومال ہاتھوں میں اچھالتا۔احتیاط

سے بنائے ہوئے بالوں کو ریشمیں رومال سے سنبھالتا اور پھر بانسری ہونٹوں تلے رکھ کر سر اٹھا کر یوں اوپر کی طرف دیکھتا جیسے سپیرے کے ٹوکرے سے سانپ نکلنے والا ہو۔

لیکن نہ جانے شہزاد کس مٹی کی بنی ہوئی تھی کہ اس نے ارجمند کی حرکات کو کبھی در خور اعتنا نہ سمجھا تھا۔ وہ کھڑکی میں آتی ہر راہ چلتی ہوئی محلے والی سے کوئی بات چھیڑ لیتی۔ ہر آتے جاتے سے ہنس ہنس کر بات کرتی مگر اس نے کبھی ارجمند کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ ارجمند کی ساری کی ساری انگر اینڈی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ پھر وہ اکتا کر کچی حویلی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ جہاں کپ اسے دیکھ کر چھلکتی اور کیپ یوں پھدکتی جیسے پارے کو آگ دکھا دی گئی ہو۔ کچی حویلی میں پہنچ کر اس کے انگر اینڈی میں از سر نو تاثر ہو جاتا تھا اور چہرے پر رونق آ جاتی۔

احاطے میں ایلی کے کھڑے ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اول تو اس میں اتنی جرات نہ تھی کہ ارجمند سے سیکھے ہوئے داؤ کو آزما سکے۔ لیکن کبھی ارجمند کے ساتھ کھڑا بھی ہوتا تو کچی حویلی یا باہر کنوئیں کے قریب محلے کے احاطے میں کھڑے ہونا ایلی کے لیے ناممکن تھا اور پھر وہاں شہزاد کے لیے کھڑے ہونا۔

جب سے ایلی نے ریل گاڑی میں اس مونگیا گٹھڑی کے پٹ کھول کر اس کی طرف جھانکا تھا۔ اس پر شہزاد کا اس قدر رعب پڑ گیا تھا کہ اس کی آواز سن کر نگاہیں جھک جاتیں اور وہ وہاں سے بھاگ لیتا۔ شہزاد کے روبرو جانا تو الگ بات تھی۔ شہزاد کے سامنے ایلی کے شانوں پر منوں بوجھ پڑ جاتا۔ نسوں میں گویا خون جم جاتا۔ دل دھک دھک کرتا۔ جی چاہتا کہ دوڑ کر کسی کونے میں جا بیٹھے اور اپنے آپ کو محفوظ کرے۔ شہزاد تو یوں دکھائی دیتی تھی جیسے کسی اور دنیا کی مخلوق ہو۔ جیسے وہ ایک ایسی پاکیزہ ہستی ہو جس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا جرم ہو۔ اس لیے گھر کے کسی کونے میں بیٹھ کر مسکراتی ہوئی شہزاد کی طرف حسرت ناک نگاہوں سے دیکھتا اور اس

کے قریب تر جانے کی آرزو کو دل میں بسا کر گھنٹوں اس کے قدموں میں بیٹھ رہتا۔ اسے یہ بھی تو معلوم نہ تھا کہ آرزو کرنے کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ اسے تو بس شہزاد کے قرب کی آرزو تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سے قریب تر ہو جائے اور اسے دیکھ کر شہزاد کی آنکھوں میں ایسی پھلجھڑیاں چلیں جیسے شریف کو دیکھتے ہوئے چلا کرتی تھیں۔ مگر یہ ناممکن تھا اور ممکن ہوتا بھی تو لیکن کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے دوست کی بیوی کی آرزو کرے۔ کتنی بری بات تھی۔ کتنی ناجائز۔ اس بات کو بھلانے کے لیے اس نے اپنی توجہ دوسری باتوں کی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی۔

چند ایک دنوں کے بعد ارجمند نے بھی محلے کے چوگان میں کھڑا ہونا موقوف کر دیا۔ "نہ بھئی۔" وہ چلانے لگا۔ "اپنے بس کی بات نہیں۔ اپنے تو پر جلتے ہیں اور بھئی ایلی بات یہ ہے کہ پکا پکایا کھانا اپنے نصیب میں نہیں۔ اپنے نصیب میں تو انتظار کرنا لکھا ہے۔ بس چھ سال کی بات ہے۔ صرف چھ سال۔ پھر کپ کو جھلکتے دیکھنا۔ اف غضب ہو جائے گا اور دوست رام تو ہم پہلے ہی کر لیں گے۔ اگر مناسب وقت پر رام نہ کر لیا جائے تو یہ بلا قابو میں نہیں آتیں۔ بس حبابوں کی کٹوریوں میں گلاب آیا تو سمجھ لو کہ دنیا ہی بدل گئی۔ یوں آنکھیں پھیر لیتی ہیں جیسے جانتی ہی نہ ہوں اور وہ شہزاد۔ ارے وہ تو ظالم بے عزتی کر دیتی ہے بالکل بے عزتی۔ اس روز مجھ سے پوچھنے لگی۔ "کس داؤ پر کھڑا ہے تو۔ کچھ کامیابی کی بھی امید ہے یا ایسے ہی ظالم نے مجھے کاٹ کر رکھ دیا اللہ بے اعتنائی کا یہ عالم ہے کہ ہم کسی گنتی میں شمار نہیں اور چھریوں کاٹ کے رکھ دینا۔ بھئی واہ۔ نہ بھئی اپنے بس کی بات نہیں۔ لیکن تم آزادی سے آجا سکتے ہو۔ دوست تم مزے میں ہو۔"

ارجمند اور ایلی دونوں اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لیے کپ اور کیپ میں دلچسپی کا اظہار کرنے لگتے۔ ایلی کہتا "چلو وہاں چلیں تمہارے گھر میں بکوری ڈکوری دیکھیں گے۔" ارجمند مسکرا کر چلاتا۔ "کیوں دوست ابھی سے چوبا گھڑی پر چڑھنے

لگا۔" اور وہ دونوں کھڑکی کی درزوں سے مقابل کے گھر میں جھانکتے۔ سبز جنگلے کا دروازہ کھلتا اور ایلی محسوس کرتا جیسے کسی مونگیا گٹھڑی کے پٹ کھل گئے ہوں۔ اس کے شانوں پر بوجھ پڑ جاتا۔ بند بند میں دھنکی سی بجنے لگتی اور وہ گھبرا کر کھڑکی سے ہٹ جاتا۔

"ارے کیا ہے تجھے۔" ارجمند اسے یوں بے توجہی برتتے ہوئے دیکھ کر کہتا "میں عین موقع پر میدان چھوڑنا مردوں کا کام نہیں۔"

اس پر ایلی لاجواب ہو کر بھاگ آتا اور اپنے چوبارے کے کونے میں بیٹھ کر اپنی کمتری کو شدت سے محسوس کرتا۔ اس کی نگاہوں میں فرار کی رنگین راہیں کھلتیں اور وہ ان میں کھو جاتا۔

سانوری

دولت پور

کچھ روز کے بعد دولت پور سے علی احمد کا خط موصول ہوا۔ جس میں ایلی کو ہدایت کی گئی تھی کہ خط کو دیکھتے ہی وہ فوراً دولت پور آ جائے۔ خط پڑھ کر ایلی چونکا اسے ڈر تھا کہیں ابا اسے دولت پور کے کالج میں داخل ہونے پر مجبور نہ کریں۔ اس کی خواہش تھی کہ اسے پھر سے لاہور کے کسی کالج میں داخل کیا جائے۔ کیونکہ لاہور میں وہ آزادانہ زندگی بسر کر سکتا تھا۔ لیکن جب سے علی احمد کا تبادلہ دولت پور میں ہوا تھا ایلی کو یہ فکر دامن گیر ہو گیا تھا کہ کہیں علی احمد اسے دولت پور کے کالج میں داخل ہونے پر مجبور نہ کریں۔ علی احمد کے کمرے سے ڈرتا تھا۔ اسے کشمیر کے سیبوں پر پلی ہوئی ماں کی حنا مالیدہ ہاتھوں سے وحشت ہوتی تھی۔ سب سے بڑھ کر اسے علی احمد کے کمرے سے نفرت تھی۔ جہاں کوئی نہ کوئی کوریا خانم موجود رہتی تھی۔

لیکن علی پور میں رہ کر اپنی زندگی تباہ کرنا بھی تو اسے گراں ہو رہا تھا۔ ایک ان جانی کشمکش اسے چکی کے پاٹوں کی طرح پیس رہی تھی۔ اس لیے اس نے دولت پور جانا منظور کر لیا۔ کیونکہ علی پور سے مخلصی پانے کا یہی ایک واحد طریقہ تھا اور وہ ماں کے سوٹ کیس میں اپنی چند ایک لودھیانے کی قمیض ڈال کر دولت پور کی طرف چل پڑا۔

دولت پورہ میں علی احمد کے مکان کو دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ وہ ایک پختہ چوبارہ تھا جو ایک جنگلے دو کمروں اور ایک کمرہ نما صحن پر مشتمل تھا۔ ایلی نے محسوس کیا کہ وہ مکان گھر نہیں تھا بلکہ تمام تر علی احمد کا کمرہ تھا۔ گھر تو بام آباد میں تھا۔ جہاں ایک وسیع و عریض صحن تھا۔ جس کے پہلوؤں میں چار کمرے تھے۔ ایک دوسرے سے الگ۔ ایک دوسرے سے دور جہاں علی احمد کے ساتھ رہتے ہوئے بھی ان سے دور رہنا ممکن تھا۔ جہاں ایلی ٹین کے سپاہی کے میدان جنگ کی ہماہمی سے دور رہ سکتا تھا۔

جہاں وہ اپنی انفرادیت کو بحال رکھ سکتا تھا اور پانی کی بوتل بھرنے کے باوجود اپنے ذہن کو اس کمرے کے تاثرات سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔ لیکن دولت پور کا گھر تو سب کا سب ایک کمرہ تھا۔ جسے بہت سے حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ جیسے کبوتروں کے رہنے کے لیے ڈربے بنے ہوتے ہیں۔ اگرچہ دیواروں کے پردے کھڑے تھے۔ اس کے باوجود کسی کمرے کی انفرادی حیثیت نہ تھی۔

دولت پور کا چوبارہ دیکھ کر وہ لرز گیا۔ اسے ٹین کے سپاہی اور ربڑ کی چیخنے والی گڑیا کے ساتھ رہنا پڑے گا۔ نہیں نہیں وہ دولت پور کے کالج میں تعلیم نہیں پائے گا۔ کبھی نہیں۔

صحن میں چولہے کے سامنے شمیم بیٹھی تھی۔ کشمیر کا وہ سیب جو پکنے سے پہلے ہی سڑا جا رہا تھا۔ وہ شمیم۔ اس کے گرد کباڑی کی دوکان کی مانند کھانے پینے کی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ گود کی ننھی بچی کی ناک بہہ رہی تھی۔ قریب ہی بڑی لڑکی حوائج سے فارغ ہونے میں مشغول تھی۔ شمیم روٹیاں پکاتے ہوئے ننھی کی ناک پونچھتی۔ بڑی لڑکی کے جسم کو کپڑے سے صاف کرتی اور پھر انہیں ہاتھوں میں آٹے کا پیڑا اٹھا کر روٹی پکانے میں مصروف ہو جاتی۔ ساتھ والے کمرے میں علی احمد میلی سی دھوتی باندھے ایک بڑے سے رجسٹر میں آلو اور پیاز کا حساب لکھنے میں مصروف تھے۔ بغلی کمرے میں چیزیں گڈمڈ پڑی تھیں۔

ایلی پر ایک گھبراہٹ طاری ہوئی جا رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس مکان سے مخلصی پا لے۔ اس لیے وہ عقبی کھڑکی میں کھڑا ہو کر پچھواڑے کے مکانات کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

سامنے کوٹھے پر کوئی شخص منتظر نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں امید کی کرن واضح تھی۔ اس کے انداز سے بے صبری عیاں تھی۔ چند لمحات کے لیے وہ کوٹھے پر ٹہلتا رہا۔ پردے کے قریب آ کر کھڑا ہو جاتا۔ نگاہیں اس کھڑکی پر

مرکوز ہو جاتیں جس میں ایلی کھڑا تھا۔ چند منٹ ایلی وہاں کھڑا رہا پھر گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا اور شمیم کی طرف متوجہ ہو گیا۔

شمیم کے رہنے سہنے کا انداز دیکھ کر اسے غصہ آنے لگا کیا میٹریکولیٹ ایسی ہوتی ہیں۔ کیا کشمیر میں پلی ہوئی عورتوں کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔ ایلی کی نظروں میں شمیم کی آنکھوں کا فرق زیادہ نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔ شمیم کے چہرے پر حزن و ملال کے آثار واضح تھے۔ رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ "بیچاری۔" وہ سوچنے لگا۔ "اس کی زندگی عام بیویوں سے کس قدر مختلف ہے اسے کیا کیا برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ جب چینی کی گڑیا آ کر بیٹھتی ہو گی اور ٹین کا سپاہی میدان کارزار گرم کرتا ہو گا تو شمیم اس بغلی کمرے کی چارپائی پر بیٹھ کر کیا سوچتی ہو گی۔" اس کے دل میں پہلی مرتبہ شمیم کے لیے ہمدردی پیدا ہوئی لیکن اس جذبہ ہمدردی میں ترس کا عنصر نمایاں تھا۔

سارا دن ایلی پریشان رہتا۔ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے۔ صحن میں شمیم کو روٹی پکاتے ہوئے دیکھ کر اس کی طبیعت مالش کرنے لگتی اور وہ دیوار کی طرف منہ موڑ لیتا۔ کھڑکی سے کور جھانکتی۔ "بابو جی کہاں ہیں۔" دروازے سے استانی تہہ بند جھاڑتی ہوئی داخل ہوتی۔ ادھر سے خانم مسکراتی۔ وہ زیادہ دیر وہاں نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ بالآخر وہ بغلی کمرے کی کھڑکی سے اس بے قرار نوجوان کو دیکھنے میں کھو جاتا جو نہ جانے کس کے لیے دن بھر چھت پر بادیہ پیمائی کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ پھر وہ گھبرا کر گھر سے باہر نکل جاتا اور دولت پور کے بازاروں میں بے مصرف گھومتا۔

دولت پور دوسرے شہروں سے کس قدر مختلف تھا۔ بام آباد کی تو اور بات تھی وہ تو شہر تھا ہی نہیں بلکہ محض ایک نو آبادی تھی۔ جہاں غریب لوگ رہتے تھے۔ لیکن دولت پور تو پرانا شہر تھا۔ پھر اس کے بازاروں میں اس قدر ویرانی کیوں تھی۔ اس کی دوکانوں میں وہ بھڑک نہ تھی جو بڑے شہروں کی دوکانوں میں ہوتی ہے۔

بازاروں میں آتے جاتے لوگ سادہ طبیعت کے تھے۔ ان کے لباس میں

دکھاوے کا عنصر نہ تھا۔ ان کی گفتگو میں ایک عجیب قسم کی معصومیت تھی۔ وہ اپنی غربت کا اظہار کرنے سے گھبراتے نہ تھے۔ ایک پیسے کا سودا لینے کو عار نہ سمجھتے تھے۔ دولت پورا لاہور سے کس قدر مختلف تھا۔

سلفر اور پٹاخہ

دولت پور کی زندگی کا مرکز پنواڑی کی دوکان تھی جو عوام کے جذبات کی عکاسی کرتی تھی۔ ہر دوکان پر چار ایک نوجوان جمع رہتے جو پان کھاتے۔ ایک دوسرے پر فقرے کستے اور پھر سیٹھ گردھاری لال یا مدن لال بھابھڑہ کے تازہ ترین معاشقے پر ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگتے۔ ایلی دور سے ان کی باتیں سنتا اور پھر آگے نکل جاتا اس کے لیے ایسی دوکان پر جانا ممکن نہ تھا۔ جہاں لوگوں کا جمگھٹا لگا ہو۔ پان خریدنے کے لئے وہ ایسی دوکان پر جایا کرتا تھا جہاں کوئی گاہک نہ ہو مگر کبھی کبھار ایسا بھی ہو جاتا کہ سودا خریدنے کے دوران میں گاہک آ جاتے اور مجمع لگ جاتا ایسے مواقع کی اسے دولت پور کی مجلسی زندگی کے متعلق چند ایک باتوں کا علم ہو گیا تھا۔ مثلاً اسے معلوم تھا کہ سیٹھ گردھاری لال کی حیثیت اب وہ نہیں رہی تھی جو کبھی پہلے تھی اور اب اس نے ساجو سے تعلقات پیدا کر رکھے تھے۔ اور ساجو ان کی یہاں آتی جاتی تھی اور دولت پور میں ایسا کون تھا جو ساجو سے واقف نہ ہو۔ کون نہیں جانتا تھا کہ وہ سلفے کی چلم ہے اگرچہ اب چلم میں راکھ رہ گئی ہے۔ لیکن پھر بھی شوقین اسے چوستے تھے اور اس کا دھندا چلتا تھا۔

اسے یہ معلوم نہ تھا کہ سیٹھ گردھاری لال کون ہے اور ساجو کس کا نام ہے اور وہ سلفے کی چلم کیوں ہے۔ وہ تو صرف یہ جانتا تھا کہ ساجو کوئی ہے۔ ہو گی کوئی اور سیٹھ گردھاری لال اسے چوس رہے تھے۔ لیکن اسے اس بات سے کیا تعلق۔

کئی مرتبہ حلوائی بازار کی طرف جاتے ہوئے جب وہ گلی میں سے گزرتا تو اسے خیال آتا کہ شاید یہی مکان ہو سیٹھ گردھاری لال کا۔ شاید یہی شخص جو چلا آ رہا ہے

سیٹھ گردھاری لال ہے۔ کیونکہ دولت پور کے سیٹھوں اور عوام میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ دیکھنے میں ہو ایک سے ہی معلوم ہوتے تھے۔

پھر اسے معلوم ہوا کہ دولت پور میں ایک نیا فتنہ بیدار ہوا ہے۔ جس کی شکل پٹاخہ سی ہے اور جو مست ہاتھی کی طرح چلتی ہے اور شوقین راستے میں کھڑے ہو کر گھنٹوں اس کا انتظار کرتے ہیں۔

اس سلطے کی چلم اور اس نئے فتنے کے باوجود ایلی کو دولت پور میں رہنے سے کوئی دلچسپی پیدا نہ ہوئی اور بالآخر مجبور ہو کر علی احمد سے کہنے لگا۔ "میں یہاں داخل نہیں ہوں گا۔ میں تو لاہور میں پڑھوں گا۔" علی احمد نے ایک ساعت کے لیے اس کی طرف غور سے دیکھا اور پھر بولے۔ "اس وقت اس موضوع پر بات کرنا بیکار ہے اس لیے کہ ہمیں فرصت نہیں ہے کل دفتر آ جانا تو وہاں یہ مسئلہ طے کر لیں گے۔"

داخلہ

دفتر میں علی احمد کی حیثیت افسر کی تھی۔ ان کے لیے ایک علیحدہ کمرہ مخصوص تھا۔ جس میں بیٹھ کر وہ کام کیا کرتے تھے۔ دوسرے دن ایلی اطمینان سے ان کے دفتر جا پہنچا اور بے تکلفی سے اسلام وعلیکم کہہ کر کرسی پر بیٹھ گیا جو علی احمد کے میز کی دوسری جانب رکھی تھی۔

"ہوں۔" علی احمد بولے۔ "تم یہاں داخل ہونے سے انکار کرتے ہو۔"

"جی ہاں۔" ایلی نے جواب دیا۔ "مجھے لاہور داخل کروا دیجئے کیونکہ لاہور میں......"

"ہوں۔" انہوں نے ایلی کی بات کاٹ کر کہا۔ "تم یہاں داخل ہونے سے انکار کرتے ہو۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے بید کی چھڑی اٹھائی جو پاس دیوار کے سہارے کھڑی تھی۔

"تو تم یہاں داخل ہونے سے انکار کرتے ہو۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے زن

سے سوئی اس کے سر پر دے ماری۔

"ارے۔" وہ گھبرا گیا۔ اسے اس سلوک کی توقع نہ تھی۔

"ہوں۔" علی احمد نے کہا۔ "تم یہاں داخل ہونے سے انکار کرتے ہو۔" اور سوٹی کی ایک اور ضرب لگائی۔ ایلی گھبرا گیا۔

"دیکھیے آپ مجھے مجبور نہ کریں۔" وہ بولا۔

"ہوں تم یہاں داخل ہونے سے انکار کرتے ہو۔" انہوں نے ایک اور ضرب لگائی۔ "میں کہتا ہوں آپ مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ۔"

زن سے ایک اور ضرب پڑی۔ نہ جانے اس وقت ایلی کو کیا ہوا وہ یہ بھول گیا کہ وہ ایلی ہے اور علی احمد اس کے والد ہیں۔ اس نے ایک جست لگائی اور اس میز پر چڑھ گیا جو باپ اور بیٹے کے درمیان بچھی ہوئی تھی۔ جھپٹ کر علی احمد کے ہاتھ کی سوٹی پکڑ لی۔ ایک کھولتی ہوئی نگاہ باپ پر ڈالی۔

"تو تم دولت پور کے کالج میں داخل ہونے سے انکار کرتے ہو۔" علی احمد نے وہی فقرہ پھر دہرایا۔ ایلی نے ایک جھٹکا دے کر بید کی سوٹی علی احمد کے ہاتھ سے چھین لی اور اسے توڑ موڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔ چند ساعت کے لیے وہ علی احمد کے روبرو کھڑا رہا۔ جیسے ان کا حریف ہو اور پھر میز سے اتر کر چپکے سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

دو ایک گھنٹے نہ جانے وہ کہاں گھومتا رہا۔ بھاگ جانے کے خوفناک منصوبے بناتا رہا۔ سوچتا رہا کہ کس طرح وہ سمندری جہاز میں داخل ہو کر چھپ جائے گا اور جب جہاز گہرے سمندر میں پہنچ جائے گا تو وہ باہر نکلے گا۔ اور جہاز والے بالآخر اسے رکابیاں دھونے پر ملازم رکھ لیں گے حتیٰ کہ جہاز بصرہ کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہو جائے گا۔ پھر چپکے سے جہاز سے باہر نکل جائے گا۔ جیسے اس کے ایک عزیز نے کیا تھا۔

لیکن یہ دلچسپ تفصیلات سوچنے کے بعد وہ گھر لوٹ آیا۔ اس میں بھاگ جانے کی جرات نہ تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ وہ بھاگ جانے کی تفصیلات بھی نہ سوچے۔ جب وہ گھر واپس پہنچا تو علی احمد اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ''غلام محمد "انہوں نے نوکر کو آواز دی۔ ''ایلی کو ڈاکٹر رام داس کے پاس لے جاؤ۔"

ڈاکٹر سے دوا لگوانے کے بعد وہ چارپائی پر لیٹ کر فیصلہ کرتا رہا کہ دولت پور کے کالج میں داخل نہیں ہوگا چاہے کچھ ہو جائے لیکن تیسرے روز جب علی احمد نے اپنے ہیڈ کلرک کے ساتھ اسے دولت پور گینٹ کالج میں داخل ہونے کے لیے بھیجا تو وہ یوں چپکے سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ جیسے دولت پور کالج میں داخل نہ ہونے کا اس نے فیصلہ ہی نہ کیا ہو۔

چند ایک دن تو ایلی چوبارے کے ان دونوں کمروں میں پریشان حال گھومتا رہا پھر قانع ہو کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ جب شام کے وقت شمیم کھانا پکانے لگتی اور ناظمہ حوائج میں مصروف ہو جاتی اور انجم کی ناک بہتی تو وہ چپکے سے باہر نکل جاتا اور دولت پور کی گلیوں میں گھومتے ہوئے سوچتا کہ یہ مکان سیٹھ گردھاری لال کا تو نہیں اور یہ عورت جو کھڑکی میں کھڑی ہے۔ دولت پور کا نیا فتنہ ہے یا سلطے کی چلم۔

وہ یونہی گھومتا رہتا تاکہ وہ شمیم کو کھانا پکاتے ہوئے نہ دیکھے۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ سوچنے لگتا کہ کس طرح وہ جہاز میں چھپنے میں کامیاب ہو سکے گا۔ اور پھر کس طرح جہاز کا کپتان اسے رکابیاں دھونے پر نوکر رکھنا منظور کرلے گا اور پھر بصرہ کی بندرگاہ میں کس طرح سے چوری چوری جہاز سے اترے گا۔ وہ مسلسل طور پر کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا تاکہ کھانے کے دوران یہ خیال نہ آئے کہ یہ وہی کھانا جسے شمیم نے پکایا ہے۔

جمعہ شاہ

پھر ایک روز علی احمد کے یہاں بالا اور اس کی چچی آگئے۔ آگے آگے بالا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سوٹ کیس تھا اور اس کے پیچھے اس کی چچی دیواروں کا سہارا لیتی

ہوئی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

''سلام کہتا ہوں جی۔'' بالا شمیم سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اپنے پھوپھا جان کہاں گئے ہیں۔ ہوں گے! ہوں گے باہر سیر کو۔ ہائیں ایلی بھائی بھی یہاں ہیں۔ مزاج تو بخیر ہے نا۔ شکر اللہ کا میں تو بالکل خیریت سے ہوں۔ علی پور میں سبھی خیریت سے ہیں ہاں''۔ اس نے یوں کہا جیسے یہ ایک افسوس ناک امر ہو۔ ''سبھی یاد کرتے ہیں آپ کو۔'' وہ اپنے آپ سے باتیں کئے جا رہا تھا جیسا کہ اس کی عادت تھی۔ خود ہی سوال کرتا۔ پھر خود ہی اس کا جواب دینے لگتا۔ اس کی نگاہیں نہ جانے کس طرف دیکھنے میں کھوئی رہتی تھیں۔ جیسے دیواروں کے پار کچھ دیکھ رہا ہو۔ اس کی چچی بالا کی طرف دیکھنے میں کھوئی رہتی جیسے ڈرتی ہو کہ کہیں بالا اس کی نگاہ سے اوجھل ہونے دیا گیا تو وہ پراسرار طریقے سے گم ہو جائے گا۔

جلد ہی شمیم اور ایلی کو معلوم ہو گیا کہ بالا اور اس کی چچی وہاں دو ایک مہینے ٹھہرنے کے لیے آئے تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ شاید علی احمد کے زیر اثر رہنے سے بالا میں دسویں پاس کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اگرچہ علی احمد نے ان کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا تھا مگر ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ انہیں قطعی طور پر خوشی نہیں ہوئی بلکہ ان کے آنے سے کوفت محسوس ہو رہی تھی۔

بالا اپنے جواہرات کے ڈبے کھول کر بیٹھ جاتا۔ ''یہ دیکھو ایلی۔۔۔'' وہ اسے اکساتا۔ ''یہ نیلم جو ہے یہ کوہ سفید کے سوا اور کسی جگہ سے نہیں ملتا ہاں۔ کیونکہ وہی ایک پہاڑ ہے جہاں پریوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ پریوں کو نیلم سے محبت ہوتی ہے۔ ہاں۔ پھر جب چودھویں رات کا چاند چمکتا ہے نا تو اس کا رنگ اور بھی گہرا ہو جاتا ہے اور........''

ایلی کو اب بالا کے قیمتی پتھروں سے وہ دلچسپی نہ تھی جو کسی زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ ایلی اس کی باتیں سن کر مسکراتا اور پھر سوچتا کہ کس طرح بالا کے طلسمی پتھروں

سے مخلصی پائے لیکن اعلانیہ بالا کی بات کاٹ کر چلے جانا یہ اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ بہر حال وہ بالا کی باتیں سنتا جمائیاں لیتا اور نہ سننے کی آرزو کرتا۔

پھر دفعتاً بالا اٹھ بیٹھتا اور آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتا۔ جیسے کوئی اسے بلا رہا ہو۔ ''ابھی آتا ہوں۔ بھئی۔ ابھی آیا میں۔ وہ بلا رہے ہیں نا مجھے۔'' اس کے اشاروں میں رازدارانہ اور پراسرار انداز جھلکتا۔ اس کی مسکراہٹ میں احساس برتری کی جھلک ہوتی۔ جیسے وہ حالات کو بہتر طور پر سمجھتا ہو جیسے وہ فطرت کے راز سے کما حقہ واقف ہو۔ ''ذرا انتظار کرو میں ہو آؤں۔'' وہ ایلی سے کہتا اور پھر چپ چاپ کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھنے لگتا۔ اس کے جانے کے بعد کوٹھے سے زیرلب باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیتیں۔ وہ پھر لوٹ آتا لیکن سیڑھیاں اترتے وقت دفعتاً رکتا جیسے کسی نے پھر بلایا ہو اور نہ جانے کس سے مخاطب ہو کر کہتا۔ ''نہیں نہیں یوں نہیں۔ جیسے میں نے کہا ویسے۔'' اور پھر مسکراتا ہوا نیچے اتر آتا۔ شمیم اور ایلی حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے رہتے۔ اسے آتا دیکھ کر شمیم گھبرا کر اٹھ بیٹھتی اور انجم کو کلیجے سے لگا کر ناظمہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر گویا انہیں محفوظ کر لیتی۔

پھر وہ گھبرا کر پوچھتی۔ ''بالا تم کس سے باتیں کیا کرتے ہو۔''

بالا مسکرا دیتا ہے۔ ''آپ نہیں جانتی پھوپھی۔ آپ انہیں نہیں جانتیں۔ اپنی ہی ہیں وہ۔ بڑے اچھے ہیں بیچارے۔''

بالا جواب دیتا۔ ''کہاں نہیں ہیں۔ ان کے لیے کوئی حد مقرر نہیں وہ ہر جگہ موجود ہیں۔ ہر مکان میں جنگل میں میدان میں۔ لیکن بڑے اچھے ہیں وہ بیچارے بار بار مجھے بلا لیتے ہیں۔ ہی ہی ہی۔'' وہ ہنستا۔

''اس وقت تو اپنے جمعہ شاہ کو نہیں جانتے بڑے زبردست ہیں وہ جو چاہیں کر دیں۔ جو چاہیں جسے چاہیں بلا لیں تو یہ بھئی کس میں ہمت ہے کہ ان کی بات رد کرے۔ لیکن میں ہی ہی ہی ہی۔'' وہ ہنسنے لگتا۔ ''میری اور بات ہے۔ میرا ہمزاد

بڑا زبردست ہے نا۔ اس لیے۔ لیکن تمہیں کیا معلوم پھوپھی میں نے کئی بار کہا ہے انہیں کہ......"

اور بالا اسی طرح ایک قصہ چھیڑ دیتا۔ جس کے دوران میں وہ بار بار مسکراتا اور انہیں یوں سمجھانے کی کوشش کرتا جیسے دونوں بچے ہوں پھر جب رات پڑ جاتی تو وہ کتاب سامنے رکھ کر دیوار کے پار دیکھنے میں مصروف ہو جاتا۔ اس کی نگاہوں میں عجیب قسم کی دیوانگی جھلکتی۔

ایلی کو بالا کی طرف دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ اس لئے وہ کوشش کیا کرتا کہ اس کی طرف نہ دیکھے۔ دوسری جانب بالا کی چچی یوں بیٹھی رہتی جیسے کپڑوں کی گٹھڑی پر کسی ڈائن کا سر کاٹ کر رکھ دیا گیا ہو۔ اس کی نگاہیں بالا پر مرکوز رہتیں اور وہ مسلسل طور پر پیار بھری سیاہ دار نگاہوں سے اسے گھورتی رہتی۔ حتیٰ کہ بالا کی آنکھیں بند ہو جاتیں اور سر کتاب پر جھک جاتا اور ٹانگیں یوں بکھر جاتیں۔ جیسے معاملے سے بنے ہوئے باوے کا اندرونی تاگا لوٹ گیا ہو۔

اس پر دفعتاً کپڑوں کی گٹھڑی میں حرکت پیدا ہوتی اور چچی اٹھ کر بالا کے بکھرے ہوئے اعضا کو سمیٹتی اور بصد مشکل اس لاش کو گھسیٹ کر چارپائی پر ڈال دیتی۔ اس وقت ایلی سوچتا کیا یہ وہی بالا ہے جو فطرت کے تمام رازوں سے کماحقہ واقف ہے۔ کیا یہ بے ہوشی بھی کوئی راز ہے۔ یہ سوچتے سوچتے ایلی اونگھنے لگتا اور پھر چپکے سے اٹھ کر بستر پر لیٹ جاتا اور علی احمد کے قلم کی چراؤں چراؤں کو غور سے سننے میں مصروف ہو جاتا جو ملحقہ کمرے میں حسابات کے رجسٹر پر کرنے میں مصروف رہتے۔ ایلی کو خوف دامن گیر رہتا تھا کہ کہیں علی احمد یہ نہ پوچھ لیں۔ "ایلی تم ابھی سے سو گئے کیا سارا دن آوارہ پھرتے ہو اور سر شام ہی پڑ کر سو جاتے ہو کیا وجہ ہے۔" لیکن علی احمد کو حساب کتاب لکھنے میں اس قدر دلچسپی تھی کہ وہ رجسٹر سامنے رکھ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے تھے۔

آتشیں میزائل

رات کو خواب میں عجیب وغریب اشکال ایلی کے پیچھے دوڑتیں اور وہ ڈر کر بھاگتا۔ خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ دل دھڑکتا۔ مگر وہ دوڑے جاتا۔ پھر بالا نہ جانے کہاں سے اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا اور مسکراتا۔ اس کی مسکراہٹ کو دیکھ کر عجیب قسم کی ہمدردی سی محسوس ہوتی تھی۔ "کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں۔" بالا مسکرا کر کہتا ٹھیک ہو جائے گا۔ بالا کا چٹا سفید ہاتھ ایلی کی طرف بڑھتا اور اسے تھپکنے لگتا۔ ایلی جاگ اٹھتا اور اپنے آپ کو کمرے میں دیکھ کر اطمینان کا سانس لیتا۔ پھر آہستہ آہستہ از سرِ نو اس پر خوف مسلط ہونا شروع ہو جاتا۔ اندھیرے میں اس کا دم گھٹنے لگتا اور وہ آنکھیں بند کرکے پڑ جاتا۔ دفعتاً اسے محسوس ہوتا کہ کوئی چیز اس کے جسم سے چھو رہی ہے۔ آہستہ آہستہ حرکت کر رہی ہے۔

پہلی مرتبہ جب اس نے یہ محسوس کیا تھا تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ صرف بالا کا بازو چارپائی تلے یوں لٹک رہا تھا۔ جیسے قصائی کی دوکان پر بکرے لٹکا کرتے ہیں۔ یہ بات تعجب خیز نہ تھی۔ کیونکہ اکثر بالا کے اعضا چارپائی سے لٹکا کرتے تھے۔ اس نے کئی مرتبہ اس کا بازو اور ٹانگ چارپائی تلے دیکھے تھے اور بالا کی چچی تو اکثر رات کے وقت چلایا کرتی۔ "بالا تیری دوسری ٹانگ کہاں ہے۔ بالا کہاں ہے۔ تیری دوسری ٹانگ۔ پھر وہ اٹھ کر بالا کی دوسری ٹانگ سمیٹتی اور گٹھڑی بن کر بالا کی پائنتی کی طرف پڑ جاتی اور بالا اسی طرح سویا رہتا یا زیرِ لب مسکرا کر آنکھیں یوں بند کر لیتا جیسے نیند میں ہو۔

بالا کے جسم کے متعلق ایلی کے لیے دو تین باتیں عجیب تھیں۔ ایک تو اس کا جسم سفید اور ملائم تھا۔ جیسے عورتوں کا ہوتا ہے۔ دوسرے وہ بالوں سے خالی تھا۔ اس کے ہاتھ اس قدر حساس تھے کہ ایلی کو حیرت ہوتی تھی۔ انگلیاں مخروطی تھیں اور جلد پر یوں گلابی جھال سی چمکتی تھی جیسے نائلون کی باریک جھلی چڑھا رکھی ہو۔

اس روز بالا کا ہاتھ چار پائی سے لٹکتے دیکھ کر ایلی کو تعجب نہ ہوا تھا۔ بلکہ اس نے آنکھیں بند کر کے سو جانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اسے نیند نہ آتی تھی۔ نہ جانے نیند کو کیا ہو گیا تھا۔ کمرے کے اندھیرے سے نجات پانے کے لئے اس نے سیٹھ گردھاری لال کے متعلق سوچنا شروع کر دیا تھا۔ نہ جانے سیٹھ گردھاری لال کیسا ہو گا۔ اس کے سلتے کی چلم سا جو اور وہ پٹاخہ۔ نہ جانے کون تھی۔ وہ...... جو دولت پور میں پٹاخہ سمجھی جاتی تھی۔ کوئی ہو گی۔ پڑی ہوا کرے۔ ایلی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ دفعتاً اس نے پھر وہی لمس محسوس کیا۔ وہی جنبش جیسے کوئی مخملی بیر بہوٹی چل رہی ہو۔ وہ پھر چونکا۔ بیر بہوٹی رک گئی۔ لیکن کچھ دیر کے بعد پھر سے چلنے لگی۔ اگر چہ وہ جنبش چونکا دیتی تھی۔ لیکن اس قدر مدھم تھی۔ وہ لمس اس قدر مخملی تھا کہ ایلی میں عجیب سی لذت بیدار ہو رہی تھی۔ جیسے رنگین جھولنے چپکے سے اس کی رضائی میں گھس گئے ہوں۔ بیر بہوٹی کی ہر جنبش پر وہ بدکتا اور اس کے بدکتے ہی وہ جھولا رک جاتا۔ وہ لمس جامد ہو کر رہ جاتا لیکن اس گھبراہٹ کے باوجود ایلی کا جی چاہتا کہ وہ جنبش پھر رواں ہو جائے وہ بیر بہوٹی پھر چلنے لگے۔ اس لمس کی وجہ جاننے کے لیے اس نے رضائی سے باہر دیکھنے کی خواہش محسوس کی تاکہ اسے معلوم ہو کہ بالا کا بازو کیا وہیں لٹک رہا ہے۔ لیکن عین اس وقت وہ جنبش پھر رواں ہو چکی تھی۔ ایلی نے رضائی سے منہ نکال کر باہر دیکھنے کی خواہش کو دبا لیا کہ ہلنے کی وجہ سے وہ بیر بہوٹی رک نہ جائے۔

بیر بہوٹی سرک رہی تھی۔ سرک رہی تھی۔ اس کے جسم کے ایک ان جانے مرکز سے چاروں طرف لہریں اٹھ رہی تھیں۔ وقت گویا تھم چکا تھا۔

پھر دفعتاً ایک گرداب اٹھا۔ وہ ہلکی ہلکی لہریں ایک عجیب سے طوفان میں بدل گئیں۔ ایک آتشیں میزائل فضا میں بلند ہوا اور پھر ایٹم بم کی طرح پھٹ گیا۔ چاروں طرف چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ ستارے ٹوٹ رہے تھے۔ پھر گھٹا ٹوپ

اندھیرا چھا گیا اور ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ ایک طویل و عریض سمندر پر ایک ٹوٹی ہوئی کشتی میں بہے جا رہا ہو اور چاروں طرف تھکی ہاری لہریں رینگ رہی ہوں۔

اس روز پہلی مرتبہ اسے اس تلاطم کا تجربہ ہوا تھا۔ پہلی مرتبہ اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کی اپنی شخصیت میں رنگین طوفان پنہاں ہیں۔ اگلے روز وہ بالا کے ہاتھ کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کتنا شفاف ہاتھ تھا وہ کس قدر مخملیں۔ اسے دیکھ کر ایلی کو بیک وقت نفرت اور دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ نفرت کا احساس غالب تھا۔ مگر اس نفرت کے باوجود رات کی تاریکی میں اس چھائی ہوئی خاموشی کے پس منظر پر وہ مخمل لمس رواں دواں ہو جاتا تو اسے محسوس ہوتا گویا کسی بربط کے تار لرز رہے ہوں۔ اس وقت وہ پہلو بدل کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیتا۔ لیکن جلد ہی ان جانے میں وہ پھر کروٹ بدلتا۔ اور پھر مخملی لہریں بڑھ کر طوفان کی شکل اختیار کر لیتیں افق پر خونیں چھینٹے اڑتے ایک میزائل شوں سے آسمان کی طرف لپکتا۔ پھر دیر تک طوفان زدہ سمندر کی ویرانی میں وہ لکڑی کے ٹوٹے ہوئے تختوں پر پڑا ڈبکیاں کھاتا اور کسی ان جانے احساس سے شرابور ہو جاتا۔ دن بھر وہ کالج سے متعلقہ مشاغل میں مصروف رہتا۔ شدت سے مصروف رہتا تا کہ اس کے ذہن میں بالا کا خیال نہ آ جائے۔ بالا کے روبرو جانے سے بھی اسے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ روحانی تکلیف۔ بالا اس کے ذہن میں ایک رِستے ناسور کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ لیکن۔

پیس میموریل

دولت پور کا کالج ایک وسیع احاطے میں طویلا نما عمارت میں واقع تھا۔ احاطے کے چاروں طرف ایک منزلہ کمرے بنے ہوئے تھے۔ جن کے ساتھ ساتھ ایک برآمدہ چلا گیا تھا اور درمیان میں ایک وسیع و عریض صحن تھا۔ جس میں دو ایک پلاٹ دو ایک ٹینس اور بیڈمنٹن کے کورٹ تھے اور درمیان میں کنکر بچھے ہوئے راستے بنے ہوئے تھے۔

احاطے کا شرقی پہلو تعلیم و تدریس کے لیے مخصوص تھا اور باقی تین پہلوؤں میں بورڈنگ طلبا کے رہائشی کمرے تھے جو زیادہ تر خالی پڑے رہتے۔

اس کالج کی حیثیت محض ایک سکول کی سی تھی۔ احاطے کے دونوں پھاٹکوں میں سٹولوں پر بیٹھے چوکیدار اونگھتے۔ کالج ونگ کے برآمدے میں ڈھیلے ڈھالے چپڑاسی ہاتھوں میں کاغذ تھامے ننگے پاؤں یوں گھومتے پھرتے جیسے بھکشو چل رہے ہوں۔ دفتر میں لالہ رام لال ہیڈ کلرک چشمہ ناک کی چونچ پر رکھے بڑے بڑے رجسٹروں میں اندراج کرنے میں مصروف دکھائی دیتے۔ ان کے ارد گرد کم سن کلرک حساب کتاب کے کھاتے کھولے بیٹھے رہتے۔

جماعتوں میں پروفیسر گنگنی آواز سے پڑھاتے اور لڑکے بنچوں پر بیٹھ کر اونگھتے۔ بورڈنگ کے ویران کمروں میں الگنیوں پر دھوتیاں لنگوٹیاں اور پرنے سوکھتے۔ رسوئی میں دال کی کڑاہیاں بجتیں۔ چولہے سے پھلکے اڑتے اور باہر بچھی ہوئی ڈائننگ ٹیبل پر لڑکوں کے بے صبرے ہاتھ انھیں کیچ کرنے کے لیے بڑھتے۔

دولت پور کالج کا نام پیس میموریل تھا جو کسی بڑے سیٹھ نے لوک رکشا کیلئے جاری کیا تھا۔ شاید اسی لیے کالج میں پیس صلح اور شانتی کے سوا کچھ نہ تھا۔ لڑکے شانتی سے اونگھتے۔ چپڑاسی آواز پیدا کیے بغیر برآمدوں سے چلتے پھرتے۔ دفتر میں ہیڈ کلرک کے قلم کے چراؤں چراؤں کے سوا کوئی آواز پیدا نہ ہوتی۔

اس پیس میموریل کالج میں صرف ایک گروپ ایسا تھا جو اس چھائی ہوئی خاموشی کو توڑنے کی کوشش کرتا۔ لیکن بسا اوقات ان کی یہ کوشش بری طرح سے ناکام ہو جاتی۔ یہ گروپ دولت پور کے شہر کے مسلمان لڑکوں کا تھا۔

شہر کے لڑکے صبح سویرے اپنے بائیسکل سنبھالتے اور چھاؤنی کی طرف چل پڑتے جہاں کالج واقع تھا۔ شہر سے نکلتے تو تعداد کے لحاظ سے ایسا معلوم ہوتا جیسے سائیکلوں کا ایک جلوس نکلا یا سائیکلوں کی ریس ہو رہی ہو۔ یہ جلوس گپیں اڑاتا۔ شور

مچاتا۔ شانوں پر ہاتھ رکھے ہینڈل چھوڑے قطار در قطار چلے جاتا۔ ان کے اس طور پر چلنے سے چھاؤنی اور شہر کے درمیان کی سڑک کا ٹریفک رک جاتا۔ تانگے والے چیختے رہے بابو۔ بچ کے بابو۔ بیل گاڑی والے چلاتے۔ ٹریفک کے سپاہی سیٹیاں بجاتے۔ ویران کوٹھیوں میں بڑے صاحبوں کے کتے نکل کر بھونکتے۔ لیکن وہ جلوس بے نیازی اور بے پروائی سے چلے جاتا۔

ان کی زبانیں قینچیوں کی طرح چلتی تھیں۔ نگاہیں کوندے کی طرح چپک جاتیں۔ چہروں سے شوخیاں جھلکتیں بھوؤں میں مستیاں لہراتیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹیں ابھرتیں۔ ایک دوسرے کو لمڈا بنانے کی کوشش کرتا۔ دوسرا دل پھینک عاشق کا روپ دھار لیتا۔ ایک شریف کی سی آنکھیں بناتا۔ دوسرا علی احمد کی طرح میدان میں آ کودتا۔

ایک کہتا۔ ''کیوں میری جان دیکھو گے یا مار ہی ڈالو گے۔''

دوسرا کہتا۔ ''کیوں بے سالے ہماری ہی بلی اور ہمیں سے میاؤں۔''

''کیوں سالے۔ ہم سے تو چھپتا ہے اور دوسروں سے آنکھیں لڑاتا ہے۔''

''بھئی ہم تو سرکار کے نوکر ٹھہرے۔''

''تو مشق ناز کرے خون دو عالم ہماری گردن پر۔''

''ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔ جان من۔''

ہر کسی کو شوق تھا کہ وہ عاشق کا رول ادا کرے اور دوسروں کو معشوق بنا کر رکھ دے۔ دولت پور کے لڑکوں کا صرف یہی ایک مذاق تھا۔ ان کے پاس بات کرنے کے لیے صرف یہی ایک موضوع تھا۔ جسے بات کرنی آتی تھی۔ جو چوٹ کر سکتا تھا۔ فی البدیہہ چست جواب دے سکتا تھا، وہ ہیرو بن جاتا اور جو لڑکے ازلی طور پر گنگے تھے وہ نکو بن کر رہ جاتے۔

ایلی ازلی طور پر ایک گونگا لڑکا تھا۔ اسی وجہ سے اس کے لیے ان کی باتیں بے حد

پریشان کن ہوتی تھیں۔ اور وہ جلوس خاصہ اذیت دہ۔ اس لیے وہ اکثر کوشش کرتا کہ ایسے وقت کالج جائے جب لڑکوں کے جلوس میں شامل ہونے کا ڈر نہ ہو۔

یہ جلوس جب کالج کے دروازے پر پہنچتا تو اور بھی شور مچاتا۔ لیکن ان کا وہ شور بے جان ہو کر رہ جاتا کوشش کرنے کے باوجود اس میں تسلسل پیدا نہ ہو سکتا۔ اس راہب خانہ نما احاطے میں عجیب خصوصیت تھی۔

اس احاطے میں بڑی سے بڑی شوخ بات بے جان ہو کر رہ جاتی۔ بڑی سے بڑی پھبتی فلیٹ ہو جاتی جیسے صحرا میں جھاڑیوں کی ہری خشک ہو کر اڑ جاتی ہے۔

یہ جلوس احاطے میں داخل ہوتے ہی بے جان ہو جاتا۔ لڑکوں کے ہونٹ خشک ہو جاتے۔ انکے حلق کی آوازیں جم جاتیں اور وہ چپ چاپ کلاس روم میں بیٹھ کر اونگھنے لگتے اور چھٹی کا انتظار کرتے تا کہ ایک بار پھر حرکت کر سکیں۔

پیس میموریل کے پروفیسر بھی عجیب تھے۔ ان میں شوخی یا بانکپن نام کا نہ تھا ان کے لباس بھڑکیلے نہیں بلکہ بدرنگ تھے۔ ان کی حرکات اس حد تک مدھم تھیں جیسے سلو موومنٹ پر فلم چل رہا ہو۔ ان کی آوازیں احاطے کی خاموشی کو تقویت دیتی تھیں۔ ان کے لیکچروں میں بھی علمی نمائش مفقود تھی۔ لیکچر دیتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے معلومات کا پرچار کرنے کے بجائے وہ اپنے علم کے عجز کا اظہار کر رہے ہوں۔ لڑکے ان کے اس انداز پر تمسخر سے ہنستے تھے۔ اگرچہ چوری چوری ہنستے تھے۔ لیکن پروفیسروں کے برتاؤ کو محسوس کر کے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کالج کی جگہ وہ ایک بودھی راہب خانہ ہو جہاں لوگ علم کی بجائے شانتی کا اپدیش سیکھ رہے ہوں۔

ایلی کے لئے وہ کالج خوش کن نہ تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ وہاں احساس کمتری کی وجہ سے اسے بھاگنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ اس لئے وہ کالج میں باقاعدہ جاتا۔ اگرچہ اس نے کبھی پروفیسر کے لیکچر کی طرف دھیان نہ دیا تھا۔ جماعت میں وہ اونگھتا۔ ریسیس میں لڑکوں کی باتیں سنتا اور خالی پیریڈ میں انہیں کسی ویران کمرے

میں تاش کھیلتے ہوئے دیکھتا رہتا یا کالج سے نکل کر چھاؤنی کے بازاروں میں گھومتا۔ کالج کے بند ہونے کے بعد وہ سیدھا گھر آتا۔ لیکن جوں جوں وہ گھر کے قریب پہنچتا اس کا دل بیٹھنے لگتا نہ جانے علی احمد کے کمرے میں کون ہوگی۔ نہ جانے شمیم کی بچیاں صحن میں بیٹھی کیا کر رہی ہوں گی۔ سارے گھر میں کوئی کونہ بھی تو ایسا نہ تھا جہاں وہ الگ تنہائی میں بیٹھ سکتا ہو۔

کچی گری

پھر دولت پور میں پنکھے کے میلے کا دن آ گیا۔ شہر کے پنواڑیوں کی دوکانوں پر بھیڑ لگ گئی۔ لوگ پان کھاتے پیکیں تھوکتے ایک دوسرے پر فقرے کستے۔ مذاق اڑاتے اور بالآخر شہر کے سیٹھوں اور پٹھانوں کے متعلق بات شروع کر دیتے۔

"کیوں بھئی غلام محمد کون کون آ رہی ہے اب کے پنکھے کے میلے ماں.........."

"اپنی زہرہ ہے دلی والی۔ علی جان ہے اور پٹیالے کی نرالی بانو ہے۔"

"بڑی اچھی اچھی آئیں گی۔ اب کی بار بڑا ٹھاٹھ رہے گا۔ تو دیکھیو تو۔"

"کیوں رے بڑا تان سین آیا ہے تو سمجھنے والا راگ و دیا کا۔"

"اچھا خاصہ تو گاتی ہے وہ اور جب ہاتھ اٹھا کر کولہے مٹکاتی ہے تو دیکھ لیجو تیرے جیسوں کے دل کو نہ ہوا کچھ کچھ تو کہنا۔"

"ارے یار تو بھی بس لفاٹو ہی رہا۔ یہاں گانے میں اپنی زہرہ کا جواب نہیں اور پھر دیکھنے میں بھی تو چھپن چھری ہے نری۔"

"ہونہہ دیکھنے میں تو وہ ہے جو آج دل شہر کی آنکھ کا تارہ بنی ہوئی ہے اور بھئی ہے بھی یوں سمجھ لو کچی گری۔۔۔ رضائی میں پڑ کر چباتے رہو۔ ہاں۔"

پھر وہ سب اس کچی گری کو چبتے اور اپنی تخیل میں کھو کر پان کی پیک نگل جاتے اور پھر کھانستے اور چلاتے۔

''کیوں بھئی گلام محمد بڑا تیج ہے۔ تیرا تمباخو کہاں سے منگوایا ہے اب کی مرتبہ۔''

غلام محمد ایک شان بے نیازی سے چلاتا۔ ''ابے کیا سمجھا ہے تو نے اپنی دوکان پر

یچ وہ آتی ہے۔ جو اول درزے کی ہو۔ہاں۔''

میلے کے دن شہر میں گھومتے ہوئے راج چوک میں مرزا کی دوکان کے قریب

ایلی ان کی باتیں سن کر ٹھٹکا۔

''ابے وہ سامنے تو ہے وہ شیخ کی دوکان کے اوپر جھرمٹ لگا ہے نا اس میں تو غور

سے تو دیکھ۔ آنکھیں ہیں تیری یا بٹن جو کہ دیکھنے کی ایچ رکھتی ہی نہیں۔''

''وہ تو اپنی بالیاں والی ہے۔ پٹاخہ کہاں رکھتا خود کو نہیں الٹا ہمیں جھٹلائے ہے۔''

''ہاں ہاں بالیاں والی کے ساتھ ہی تو ہے۔ بائیں ہاتھ کو ابے کیا ابھی سے

آنکھوں پر چنا آ گیا۔ کہا جو ہے تجھ سے بیسیوں بار چھوڑ دے یہ جیا دتیاں۔ اندھا ہو

کر راج چوک میں لاٹھی نہ ٹیکی تو نے تو اپنا نام مرجا نہیں۔''

ایلی غور سے دوکان کی چھت پر بیٹھی ہوئی عورتوں کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں بھڑکیلے

سستے کپڑے پہنے چند سانولی عورتیں بیٹھی تھیں۔ جن کے انداز میں نمائش کے علاوہ

عریانی کی جھلک تھی۔ اس نے محسوس کیا۔ جیسے وہ سب بکاؤ ہوں۔ جنہیں سستے

داموں خریدا جا سکتا ہو۔ تو کیا یہی تھی وہ دولت پور کی پٹاخہ جو ہوائی بن کر چھوٹی ہوئی

تھی شہر میں۔

''دیکھ لیا۔'' مرزا قہقہہ مار کر ہنسا۔ ''بڑے جوروں میں ہے آج کل یہ لمڈیا۔

اپنی لطیفن کی لمڈیا ہے یہ اے وی لطیفن جو منڈی میں دانے چھانتی ہے۔ اپنے سیٹھ

مجید الرحیم کی دوکان پر تین بہنیں ہیں۔ بڑی نے سیٹھ گردھاری لال کو سنبھال رکھا

ہے اور''

''اور کیا بے سلطے کی لاٹ کو کون نہیں جانتا۔ جانتا ہوں اسے اچھی طرح یوں۔''

''پر یار اس جالم پٹاخہ نے چکر دیا ہے سارے شہر کو۔''

ایلی حیرانی سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لوگ کس معیار سے انہیں پرکھتے تھے۔ نہ جانے کس نقطۂ نظر اسے انہیں عورتیں حسین نظر آتی تھیں۔ دولت پور کے پنواڑیوں کی بات تو خیر الگ تھی۔ اپنے علی احمد کے خیالات بھی اس سلسلے میں عجیب تھے۔ ایلی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ وہ چھپ چھپ کر ان عورتوں کو گھر رہا تھا جو شیخ کی دوکان پر بیٹھی پنکھوں کے جلوس کا انتظار کر رہی تھیں۔

"تو یہاں کیا دیکھ رہا ہے؟" علی احمد کی آواز سن کر وہ چونکا۔

"جی۔ جی۔ یونہی دیکھ رہا تھا۔"

"اس طرح پاگلوں کی طرح ادھر ادھر نہیں دیکھا کرتے۔" علی احمد نے کولھوں پر ہاتھ رکھ کر شیخ کی دوکان پر بیٹھی ہوئی عورتوں کی طرف بڑے انہماک سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو ابھی جلوس یہاں نہیں پہنچا ہوں۔" انہوں نے ایلی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "ابھی دیر میں پہنچے گا یہاں ہوں۔"

پھر وہ اسی طرح کولھوں پر ہاتھ رکھے وہاں ٹہلنے لگے۔ علی احمد نے نہ جانے کیا کیا۔ شیخ کی دوکان پر بیٹھی عورتوں میں سے ایک نے با معنی انداز سے دوسری کو کہنی ماری اور پھر مسکرا کر اٹھ بیٹھی۔ اسے اٹھتے دیکھ کر علی احمد بولے۔ "آؤ ایلی ذرا ادھر سے ہو آئیں۔ اس طرف۔" اور وہ ایلی کو لے کر چوک کے عقب کی اندھیری گلیوں میں گھس گئے اور ایک جگہ رک کر گویا کسی کا انتظار کرنے لگے۔

ان گلیوں میں عورتوں کے گروہ ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ نہ جانے کیوں ایلی کو دولت پور کی عورتوں سے گھن آتی تھی۔ ان کا انداز چال ڈھال، طور طریقہ گھٹیا قسم کا تھا۔ وہ عجیب کپڑے پہنتی تھیں۔ سستے اور بھڑکیلے ان کی حرکات میں کوئی حسن نہ تھا۔ ان کا انداز تکلم تو بالکل ہی گنوار پن کا مظہر ہوتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا رنگ عموماً کالا تھا اور کالے رنگ سے ایلی کو قطعی دلچسپی نہ تھی۔

بلوری پاؤں

دولت پور میں کہیں کہیں سفید رنگ کے لوگ بھی نظر آتے تھے مگر ان کی تعداد بہت کم تھی مثلاً علی احمد کے چوبارے کے سامنے جو بیٹھا بیٹھا سا کچا گھر تھا۔ اس میں وہ لڑکی جو کبھی کبھار کوٹھے پر چڑھا کرتی تھی اور پردوں کے پیچھے چھپ چھپ کر بیٹھا کرتی تھی اس کا رنگ کتنا سفید تھا۔ اس کے انداز میں نمائش کا نشان تک نہ تھا۔ پہلی مرتبہ جب ایلی نے اسے دیکھا تھا تو وہ حیران رہ گیا تھا۔ پردے کی جالیوں کے پیچھے دو بلوری پاؤں گویا بڑی نفاست سے چارپائی پر رکھے ہوئے تھے اور ان کے روبرو دو مخروطی ٹانگیں جو میلے لٹھے کے پاجامے میں ملبوس تھیں۔ ایلی نے پہلی مرتبہ پاجامے کے حسن کو محسوس کیا تھا۔ چوڑی دار پائجامہ تو اس نے اکثر دیکھا تھا مگر اسے دیکھ کر نفرت محسوس ہوئی تھی۔ جیسے وہ پتلے پتلے بانسوں پر چڑھا ہو۔

دولت پور کی عورتوں کا انداز اتنا بھدا تھا۔ ان کی حرکات اس قدر بے ڈھب تھیں۔ ان کی نگاہیں حجاب سے اس قدر بے بہرہ تھیں کہ ایلی نے ان کے لباس کی خوبی پر کبھی غور ہی نہ کیا تھا۔ اسی لیے اس روز اس لڑکی کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا۔ کتنی متناسب ٹانگیں تھیں اور پھر بلوری پاؤں پھر دفعتاً ایک سریلی دبی دبی آواز فضا میں گونجتی۔ ”آتی ہوں۔“ اور وہ جھک کر چھپتے چھپتے پردوں کی اوٹ لیتی ہوئی غائب ہو گئی تھی۔

ایلی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس اندھیری گلی میں ان آتے جاتے جامنی سایوں کو دیکھنے سے علی احمد کا مقصد کیا تھا۔ وہ وہاں کس لئے کھڑے ہر آتے جاتے کو تاکنے کی بے معنی کوشش میں مشغول تھے۔

میلہ

”تم ہو بابو جی۔۔“ قریب ہی سے آواز آئی۔ ایلی چونکا۔

اندھیرے میں علی احمد کے دانت چمکے۔ ”تم آ گئیں۔ ہی ہی ہی۔“ ٹین کا سپاہی

اپنے مخصوص انداز میں ہنسا۔

''پھر تم نے جو اشارہ کیا تھا'' ربڑ کی گڑیا کی آنکھوں کی سفیدیاں چمکیں۔

''ہی ہی ہی۔ تو تو نے دیکھ لیا'' وہ بولے۔ ''میں تو سمجھا تھا شاید۔ ہی ہی ہی۔''

''کیسے نہ دیکھتی۔'' وہ چمک کر بولی۔

اس کا دھیان تو تمہاری طرف ہی لگا رہتا ہے۔ قریب ہی چادر میں لپٹا ہوا ایک مرد گنگنایا۔

اس کی آواز سے سیلز مین شپ کی بو آتی تھی۔

''تو خواہ مخواہ'' وہ لاڈ سے غرائی۔ ''تو نہ بول بیچ ماں۔''

علی احمد یوں ہنسے جا رہے تھے۔ جیسے ان کی شان میں قصیدہ پڑھا جا رہا ہو۔

''اچھا تو'' وہ بولے۔ ''چلے گی اب۔''

''اب'' وہ چونکی۔ ''نہ بھئی ہم تو پنکھا دیکھ کر جاویں گے۔''

''بڑی متوالی ہے پنکھے کی۔'' سیلز مین ہنسا۔

''متوالی ہی تو ہے۔'' ٹین کے سپاہی نے گویا پھر وار کیا۔

''میلہ دیکھ کر پہنچوں گی۔ ہاں۔ سچی بات کہوں گی۔''

''میلہ تو تم خود ہو'' علی احمد قہقہہ مار کر ہنسے۔ ''دنیا دیکھ رہی ہے۔''

''اوں۔ جھوٹ۔'' اس نے لاڈ سے گویا شکایتاً کہا۔ ''کوئی بھی تو نہیں دیکھتا۔''

''ہی ہی ہی'' وہ ہنسے۔ ''وہ تو انگلیاں اٹھا رہے تھے۔ تمہاری طرف۔''

''پڑے اٹھائیں۔ اپنی بلا سے۔ اور وہ میری آیج لائے ہو۔''

ٹین کے سپاہی کا قہقہہ یک قلم موقوف ہو گیا۔ ''اوہ مجھے یاد نہیں رہا۔'' وہ سنجیدگی سے بولے۔

''وہ کیوں یاد رہنے لگا'' وہ بگڑ کر بولی۔

''بھیج دیں گے۔ بگڑتی کیوں ہو۔''

''کیوں نہ بگڑوں بس ایک ہی بات یاد رہتی ہے تمہیں۔''

''ایلی کے ہاتھ بھیج دوں گا۔ یہ ایلی ہے میرا لڑکا۔''

''اچھا تو یہ ہے ایلی۔'' وہ لاڈ سے چلائی۔ ''پڑھتا ہے تو۔''

''صبح مل لینا اس سے اپنی چیز بھی لے لینا۔'' علی احمد بولے۔ ''چلو ایلی۔''

اس کے جانے کے بعد وہ بولے۔ ''چلو تمہیں میلہ دکھا دیں۔ دیکھو گے نا۔''

اگلے روز صبح سویرے ہی علی احمد نے ایلی کو آواز دی اور اس کے ہاتھ میں ایک دس کا نوٹ دے کر ایک گٹھڑی سی تھما دی۔ ''یہ ادھر لے جا۔'' وہ بولے۔ ''غلام محمد چپڑاسی باہر کھڑا ہے وہ تمہیں ساتھ لے جائے گا۔ نوٹ جیب میں ڈال لو گر نہ جائے اور یہ گٹھڑی اسے دے دینا غلام محمد کو وہ اٹھا لے گا۔ سمجھے۔ غلام محمد۔'' انہوں نے چپڑاسی کو آواز دی۔ ''ایلی کو ادھر لے جاؤ۔''

ادھر کا نام سن کر شمیم تڑپ اٹھی۔ اس کی ناک پر حقارت آمیز جنبش ہوئی اور وہ گویا انتقاماً پچھواڑے کی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ جس کے عقب میں کوٹھے پر وہ نوجوان کھڑا انتظار کیا کرتا تھا۔ اس نے اپنا دوپٹہ جھنجھوڑ کر پھینک دیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بامعنی مسکراہٹ پھیل گئی۔ باہر میں کھانس رہے تھے۔ کھڑکی میں بیگم مسکرا رہی تھی۔ پلنگ پر پڑی ہوئی بچی ماں کی طرف دیکھ کر رو رہی تھی اور ننھی فاطمی چاروں طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے گردوپیش کے حالات سے آشنا ہونے کی کوشش کر رہی ہو اور ایلی اچھلتے ہوئے دل سے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔

جونکیں اور جسم

بازاروں اور گلیوں کا ایک لمبا چکر کاٹ کر ایلی کا رہبر ایک معمولی سے مکان میں داخل ہوا۔

صحن میں ایک سیاہ فام بڑھیا جھاڑو دے رہی تھی۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ چہرہ ابلے ہوئے انڈے کی جامد و ساکت تھا۔ پیشانی پر شکن تھے۔ انہیں داخل

ہوتے دیکھ کر وہ رک گئی اور بے باکانہ طور پر انہیں گھورنے لگی۔ پھر کولہوں پر ہاتھ رکھ کر یوں کھڑی ہو گئی جیسے ہاتھ کے جھاڑو سے تواضع کرنے کے لیے تیار ہو۔

''آ گئے تم۔'' بڑھیا غرائی۔

''کون ہے ماں۔'' اندر سے آواز آئی۔ ماں۔ ایلی گھبرا گیا کیا یہ اس کی ماں تھی ماں۔

''تیرے ہی پوچھ ہوں گے مجھے کیا معلوم۔'' وہ غرائی۔

''اے گرمی کیوں کھا رہی ہے تو ماں۔''

''گرمی تو تیری ٹھنڈی ہونے میں نہیں آتی۔''

''تو تجھے کیا تکلیف ہے تو مکے کی حاجن بن کر بیٹھ رہ آرام سے۔''

''لہو لگا ہے تجھے لہو، اندھی ہو رہی ہے ہر آتے جاتے سے نخرے ملاتی ہے۔'' بڑھیا چیخنے لگی۔

''اوہ غلام محمد تو ہے۔ آجا۔ اندر آجا۔'' کمرے سے کسی نے جھانک کر کہا۔

''بس لگاتی جا تو سینے سے۔'' بڑھیا غرائی۔ ''اور تیرا کام ہی کیا ہے مجھے کیا معلوم تھا کہ گود میں کتیاں پال رہی ہوں۔ کتیا یہ سب اس حرامی ساجو کا کام ہے اس شکارن نے سب کے منہ لہو لگا دیا۔ لہو چوستی ہیں۔ لیکن کب تک۔'' اس کے منہ سے کف جاری تھا۔

''بڑی گرم ہے بڑھیا آج راجو۔'' غلام محمد نے آنکھیں جھپکا کر کہا۔

''اس کا کیا ہے۔ یونہی بولتی بکتی رہتی ہے۔'' راجو نے نخرے سے جواب دیا۔ غلام محمد اس سے قریب تر ہو گیا۔ اس کی نگاہوں میں عجیب سی چمک تھی۔ ایسی چمک جو کسی چیڑ اسی کی آنکھ میں نہیں ہوتی۔

''ساجو کو کوستی ہے۔'' وہ ہنسا۔ ''تجھے نہیں۔''

راجو نے ایک انداز سے زبان ہونٹوں میں لے لی اور دوسرے کونے میں بیٹھی

ہوئی عورت کی طرف دیکھا۔

دوسرے کونے میں ایک پست قد فربہ سیاہ فام عورت چارپائی پر بیٹھی پان لگا رہی تھی۔ اس کی انگلیاں انگوٹھیوں سے لدی ہوئی تھیں۔ ابھرے ابھرے گالوں میں یوں ریںگ رہی تھیں۔ جیسے ڈبل روٹی میں سیاہ دراڑیں پڑی ہوں۔

''ابھی ساجو کا کیا دیکھا ہے اس بڑھیا نے۔'' وہ بولی۔ ''ابھی تو دیکھے گی۔ غضب خدا کا اسے گھی کی روٹی ہضم نہیں ہوتی۔ سوکھے ٹکڑوں کے بغیر جی نہیں سکتی یہ۔''

ساجو کے ابھرے ہوئے گالوں اور موٹی انگلیوں پر گویا جلی حروف میں حرص و ہوس کندہ تھا۔ اس کے ہونٹوں کو دیکھ کر ایلی محسوس کر رہا تھا۔ جیسے جونکیں ہوں۔ نہ جانے کیوں ایلی کو لگ رہا تھا۔ جیسے ساجو سرخ گوشت کا ایک لوتھڑا ہو۔

اس کے قریب ہی سب سے چھوٹی بہن آجو بیٹھی تھی۔ جیسے کسی سوکھے درخت سے ٹوٹی ہوئی شاخ ہو۔ اس کے چہرے پر اداسی برس رہی تھی۔ خدوخال سے ظاہر ہوتا تھا جیسے کوئی اپاہج ہو۔ ہاتھ ٹنڈ سے تھے۔ جیسے انگلیاں ٹوٹی ہوں۔ عمر بہت چھوٹی تھی لیکن چہرا معصومیت سے خالی تھا۔

ان تینوں میں سے صرف راجو ہی کو برداشت کیا جا سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی جوانی کے سوا اس میں کیا تھا اور جوانی بھی وہ جو نسائیت اور معصومیت سے یکسر خالی تھی۔ ایلی نے وہ نوٹ جیب سے نکال کر راجو کے سامنے رکھ دیا۔ ساجو نے نوٹ دیکھ کر سر اٹھایا اور پھر منہ بنا کر بیٹھ گئی۔

غلام محمد نوٹ دیکھ کر مسکرایا بولا ''میرا حصہ ری۔''

''تیرا حصہ۔'' راجو نے پیار بھری نظر اس کی طرف ڈالی اور پھر اپنی طرف یوں دیکھا جیسے اس کا حصہ سمجھا رہی ہو۔

''اور ہمارا نام ہی نہیں لیتا کوئی۔'' زمین پر بیٹھے ہوئے سیلز مین نے اپنی چادر

اتار کر مسکرا کر کہا۔

"بڑا سیٹھ مارا ہے نا اس لئے۔" ساجو نے ہاتھ چلا کر نفرت بھرے انداز میں کہا۔

دفعتاً ایلی کو یاد آیا ساجو۔ سلفے کی لت ساجو۔ سیٹھ گردھاری لال کی ساجو۔ اور اس نے پھر سے غور سے ساجو کی طرف دیکھا۔ کیا سیٹھ اس طرح کی داشتہ رکھتے ہیں۔ جو عام لوگوں کے سامنے ننگی بیٹھنے سے نہیں گھبراتی۔ پھر اس نے راجو کی طرف دیکھا۔ دولت پور کی پٹاخہ راجو۔ اس کی دانست میں تو وہ چلا ہوا پٹاخہ تھی اور اس کی حرکات وسکنات۔ اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر بھاگ لے اور صحن میں جا کر اس بڑھیا کے ساتھ مل کر چلائے۔

وہ اٹھ بیٹھا۔ "میں اب جاتا ہوں۔"

"لے پان تو کھا جا۔" ساجو نے بازاری انداز میں للکارا۔

آجو سہم کر کونے میں لگ گئی اور راجو مسکراتی ہوئی آگے بڑھی۔ "یہاں آیا کرنا تیرا اپنا گھر ہے یہ۔"

باہر بڑھیا چیخ رہی تھی۔ "حرام کاری کی لت پڑی ہے۔ انہیں خون چوسنے کا مزہ پڑ گیا ہے۔ جونکیں ہیں جونکیں۔"

نہ جانے بڑھیا کی بات نے ایلی پر کیا اثر کر دیا کہ گھر لوٹتے ہوئے تمام منظر ہی اس کی نگاہوں میں بدلا ہوا تھا۔ دوکانوں پر بیٹھے ہوئے لالے یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے مکڑے شکار کی تاک میں بیٹھے ہوں۔ سودا بیچتے ہوئے بھابڑے چادر میں لپٹے ہوئے سیلز مین کی طرح مسکرا رہے تھے۔ تماش بینوں نے اپنی نگاہوں کے جال بچھا رکھے تھے۔

پنواڑیوں کی دوکان پر مسکراتے ہوئے کھجاتے ہوئے انسان پلپلے کیڑوں کی طرح ایک دوسرے کو اپنے لعاب دہن میں پھنسا رہے تھے۔ گھر میں علی احمد حساب

کے رجسٹروں کا خون چوس رہے تھے اور کھڑکی میں کھڑی شمیم یوں حسرت سے ان ویران کوٹھوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جو چوبارے کے عقب میں صحرا کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ جیسے وہ اسی بات کی متمنی ہو کہ کوئی جونک اپنے ہونٹ اس پر گاڑ دے۔ اس کے سر پر آسمان نیلے بازو پھیلائے ایک عظیم گدھ کی طرح چھایا ہوا تھا۔ ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ خود ایک جونک ہو جسے خون چوسنے کے لیے کسی جسم کی تلاش ہو۔

جب ایلی گھر پہنچا تو بالا قیمتی پتھروں کا ڈبا کھولے بیٹھا تھا۔ ''ہاں بھائی صاحب یہ لعل ہے۔ چاندنی میں یہ پکھراج بدل جاتا ہے اور پھر بندر اس کی چمک کو دیکھ کر اسے اٹھا لاتے ہیں۔'' اس کے سفید مخملیں ہاتھ لعل کو یوں تھپک رہے تھے جیسے اس کی سرخی چوس رہے ہوں اور بالا کے قریب وہ بوڑھی جونک اس کی چچی بالا پر نگاہیں گاڑے بیٹھی تھی۔ کتنی عجیب تھی دنیا اور جونکیں جونکیں اور اجسام اور ارد گرد پھیلا ہوا چھایا ہوا ویرانہ۔

پھر ایلی کی زندگی کے بھیانک جمود میں ایک حرکت پیدا ہوئی۔ اس کے ماموں زاد بھائی رفیق اور یوسف تار کا کام سیکھنے کے لیے دو ماہ کے لیے دولت پور آ گئے۔ ان کے آنے سے ایلی کے لئے اس صحرا میں ایک چھوٹا سا نخلستان بن گیا۔

کچھ اور بھی

سیٹھ جمنا داس کے یتیم خانے میں ایلی دن گزارتا۔ جس کا نام کالج رکھ دیا گیا تھا۔ وہ شام کے وقت کالج سے سائیکل پر پاؤں مارتا ہوا گھر پہنچتا پھر رفیق اور یوسف کے ہمراہ بازاروں کے چکر کاٹتا اور رات کو گھر آ کر پڑا رہتا۔ اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ دنیا صرف جونک ار جسم کے اجتماع کا نام نہ تھا وہاں جونکوں اور جسموں کے علاوہ اور بھی کچھ تھا۔ بے نام سا کچھ جس میں پاکیزگی کی جھلک تھی۔ مثلاً رفیق اور یوسف مثلاً سامنے چوبارے میں دو بلوریں پاؤں چست پاجامہ یا وہ

سیاہ آنکھ جو کبھی کبھار ان جنگلوں میں طلوع ہوتی تھی۔ جس کا مقصد نہ دیکھنا تھا نہ دکھانا جسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ حسین ہے کیف آور ہے اور چھلکتی ہے۔ ایلی اسے دیکھتا تھا یہ جتائے بغیر دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے اسے اپنے طرف مائل کرنے کی کوشش کے بغیر اسے دیکھتا تھا۔ اور پھر اس اضطراب سے بچنے کے لیے جو اسے دیکھنے سے ایلی پر طاری ہو جاتا۔ وہ رفیق اور یوسف کو دیوانہ وار تلاش کرتا تھا۔

رفیق اور یوسف کے آنے سے اسے ایک نقصان بھی ہوا۔ انہوں نے ان جانے میں ایلی کا علی احمد کے گھر سے رہا سہا تعلق بھی توڑ دیا۔

شام کو کھانے کے بعد وہ چپکے سے ایلی سے کہتے ایلی چلو ذرا گھوم آئیں۔ پہلی مرتبہ جب انہوں نے ایلی کو گھومنے کی دعوت دی تھی تو اس کا جی چاہتا تھا کہ انکار کر دے لیکن اپنی طبیعت کے خلاف وہ ان کے ساتھ چل پڑا تھا۔

گھومنے پھرنے کے بعد جب وہ بڑے ڈاک خانے کی طرف مڑے تو وہ سوچنے لگا کہ ادھر جانے کا مطلب۔ وہ تو گھومنے پھرنے کی جگہ نہ تھی۔ وہاں تو بازار تھا۔ جہاں لوگ دیکھے جانا پسند نہیں کرتے۔

وہ ایک دودھ کی دوکان پر رک گئے۔ ''دودھ پیو گے ایلی؟'' رفیق نے پوچھا۔

''نہیں۔'' ایلی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''اچھا بھئی۔'' رفیق بولا۔ ''پیو یا نہ پیو گھر جا کر بتانا نہیں۔''

''اور بتا بھی دو گے تو کیا ہے۔'' یوسف اپنے سپاہیانہ انداز میں چلایا۔ ''میرا تو بھوک کے مارے دم نکلا جا رہا ہے۔ ڈالنا میاں آدھ سیر دودھ میں دو بن۔'' اور وہ دونوں اپنے اپنے پیالے لے کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک وہ چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر رفیق نے یوسف کو اشارہ کیا۔

''توبہ ہے۔'' یوسف چلایا۔ ''شمیم کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی کیسے کھا لیتے ہو تم ایلی۔''

''اسی ہاتھ سے بچوں کو پونچھتی ہے اور اسی ہاتھ سے آٹے کا پیڑا اٹھا لیتی ہے۔''

رفیق نے آہ بھری۔

''اب کیا دودھ بھی حرام کرو گے تم۔'' یوسف چلایا۔

اس کے بعد ایلی کے لئے بھی شمیم کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا مشکل ہو گیا اور وہ تینوں جھوٹ موٹ گھومنے پھرنے کا بہانہ کر کے رات کے اندھیرے میں پہلوان کی دوکان پر جا کر دودھ بن کھاتے اس وقت ایلی کے کان ملحق بازار پر لگے رہتے۔ جہاں سے سارنگی کے سُر گونجتے اور طبلے کی تھاپ کے ساتھ ساتھ ایلی کا دل دھک دھک کرتا اور وہ حسرت سے ان چوباروں کی طرف دیکھتا جہاں جانا اس کے لئے ممنوع تھا اور جہاں جانے کی تمنا روز بہ روز اس کے دل میں بڑھتی جا رہی تھی۔

سسٹر سارہ

رفیق اور یوسف کی ٹریننگ کلاس میں چار ایک عیسائی لڑکے بھی تھے، جن سے ان کی راہ و رسم تھی۔ خصوصاً وکٹر اور جان سے تو ان کی دوستی کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ وہ دولت پور کی عیسائی لڑکیوں کی باتیں کیا کرتے تھے اور رفیق لڑکیوں کی باتوں میں دلچسپی لیتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ انہیں اکثر دودھ پلانے کے لئے پہلوان کی دوکان پر لے جایا کرتے تھے۔

وکٹر اور جان آتے ہی رومانس کی بات چھیڑ دیتے۔ ان کے نزدیک زندگی کا مقصد صرف رومانس تھا اور انہیں اس لئے پیدا کیا گیا تھا کہ وہ روئے زمین پر رومانس کا سلسلہ ختم نہ ہونے دیں۔ وکٹر مس بھاگو اور مس پھتو کا دیوانہ تھا جان کو مس رجی مس چاند اور مس بالو کی لگن تھی اور وہ دونوں اس بات کے خواہش مند تھے کہ ہر جان پہچان والے عیسائی احاطے میں لے جا کر اسے اپنی محبوبائیں دکھائیں بلکہ ان کو انٹروڈیوس کرائیں۔

دو ایک مرتبہ رفیق یوسف اور ایلی بھی عیسائی احاطے میں گئے تھے۔ انہوں نے

مس چاند بالو اور بھاگو کو دور سے دیکھا تھا اور مس پھتو سے ان کا تعارف بھی کرایا گیا تھا۔ ایلی کو عیسائی احاطے میں جا کر بے حد مایوسی ہوئی تھی وہ سمجھتا تھا کہ یہ مسیں اگر میموں کی سی نہیں تو ان کے لگ بھگ ضرور ہوں گی۔ لیکن رنگ کالا تھا۔ اور نقش بے حد بھدے تھے۔ شاید وہ ان تفصیلات کو نظر انداز کر دیتا۔ لیکن ان کی آوازیں بے حد کرخت اور حرکات بھونڈی تھیں۔ عیسائی احاطے کو دیکھ کر ایلی کو جان اور وکٹر کی باتوں میں قطعی طور پر دلچسپی نہ رہی۔ بلکہ اسے یوسف اور رفیق پر غصہ آنے لگا۔

ایک روز وکٹر اور جان بھاگے بھاگے ان کے پاس آئے۔ آتے ہی انہوں نے ایک شور برپا کر دیا۔ ''حد ہوگئی یار۔'' وکٹر چلایا۔

''اتنی ونڈرفل گرل آج تک دیکھنے میں نہیں آئی۔'' جان بولا۔

''بالکل میڈونا کا سا فیس ہے۔'' وکٹر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر آہ بھری۔

''اور پھر کس طرح آنکھیں اٹھا کر دیکھتی ہے۔ ہرنی سی آنکھیں ہیں۔ بے وچنگ آئز۔'' جان نے کہا۔

''لیکن نہ جانے کس ظالم نے اسے تباہ کر دیا اسے بچہ ہو گیا۔ یعنی پروف مل گیا اور اسے راہبہ بننا پڑا۔'' وکٹر نے آہ بھری۔ ''اگر وہ راہب خانے میں نہ ہوتی تو......''

وہ دونوں اس نئی راہبہ کیتھی کے لئے پاگل ہو رہے تھے۔

کئی ایک دن تک وہ کیتھی کے سوا کوئی تذکرہ نہ کر سکے رفیق اور یوسف کا اشتیاق بڑھتا گیا حتیٰ کہ یہ کیفیت ہوگئی کہ وہ خود کیتھی کا تذکرہ چھیڑ دیتے۔

نہ جانے کیتھی کیسی ہوگی۔ ایلی سوچتا اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ اتنی خوبصورت ہو گی۔ بہر حال ایلی ان کی باتیں سنا کرتا۔ کیتھی کو دیکھنے کا شوق رفیق کے دل میں اس قدر بڑھ گیا کہ اس نے ایک روز صاف کہہ دیا۔ ''یار ہمیں بھی دکھاؤ۔''

ایلی کو اس بات پر بہت غصہ آیا۔ بڑا عاشق مزاج تو دیکھو۔

''دیکھ لیں گے کیا حرج ہے۔'' یوسف بولا۔

''لیکن کیا فائدہ۔'' وکٹر چلایا۔ ''خالی دیکھنے سے کیا فائدہ۔''

''وہ تو ایک ایتھریل چیز ہے۔ ایتھریل'' جان آہیں بھرتا۔

''کیا واقعی۔'' رفیق اور یوسف حیرانی سے پوچھتے۔

''وہ تو جیسے میڈونا کی جیتی جاگتی مورت ہے۔'' وکٹر چلاتا۔

''ہائے میں کیا کروں۔'' جان آہ بھرتا۔ ''وہ تو کسی کی طرف دیکھتی نہیں۔ مسکاتی نہیں۔ بات نہیں کرتی بیچاری بڑی دکھی ہے۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھری رہتی ہیں۔''

''جی چاہتا ہے۔ جس نے کیتھی کو خراب کیا ہے اسے جان سے مار دوں۔'' وکٹر گھونسا چلاتا ''بیچاری کو بچہ ہو گیا۔ اس لیے راہبہ بننا پڑا۔ ورنہ رہبان خانے میں نہ ہوتی تو ہم اس سے ملا کرتے۔ بس پروف دے دیا۔ ورنہ''

پھر ایک روز جان اور وکٹر کے اصرار پر رفیق یوسف اور ایلی کیتھی کو دیکھنے کے لئے گرجا گھر گئے۔ اس روز رفیق کی آنکھوں میں گلابی بوندیاں اڑ رہی تھیں۔ یوسف کچھ زیادہ ہی قلانچیں بھر رہا تھا اور ایلی کے دل میں کچھ کچھ ہو رہا تھا۔ گرجے میں ہجوم تھا۔ عیسائی احاطے کے نوجوان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر راہب خانے کے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ عیسائی لڑکیاں ناک بھوں چڑھا رہی تھیں۔ بوڑھا پادری دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

دفعتاً راہب خانے کا دروازہ کھلا۔ مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔ سات راہب لڑکیاں نگاہیں جھکائے گرجے میں داخل ہوئیں۔ ''وہ ہے وہ۔'' جان نے دبی آواز میں کہا۔ جوانوں کی بھوکی نگاہیں آخری لڑکی پر مرکوز ہو گئیں۔ اس کے نقوش ستواں تھے۔ چہرہ ستا ہوا تھا۔ ہونٹوں سے اداسی ٹپک رہی تھی۔ شانے جھکے ہوئے تھے۔ سر لٹکا ہوا تھا اور وہ آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔

''ہائیں'' دفعتاً رفیق کی چیخ سی نکل گئی اور وہ حسب دستور ''سی سی'' کرنے لگا جیسے کہ اس کی عادت تھی۔ ایلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ادھر سے یوسف زیر لب چلایا۔ ''وہی تو ہے یہ سارہ۔ سارا۔ ایلی۔'' ایلی نے غور سے کینتھی کی طرف دیکھا۔ سارا کی آنکھوں سے دو آنسو گالوں پر ڈھلک آئے۔ پھر اس نے سر جھکا لیا۔ سسٹر نے آ کر اسے تھام لیا۔

اندھا کنواں

پھر گرمی کی تعطیلات کی وجہ سے کالج بند ہو گیا۔ یوسف اور رفیق کی ٹریننگ بھی ختم ہو چکی تھی۔ علی احمد سے اجازت لے کر ایلی رفیق اور یوسف کے ساتھ علی پور آ گیا۔

گرمی کی چھٹیوں میں محلے کی زندگی میں ایک عجیب وغریب گہما گہمی پیدا ہو جاتی تھی۔ محلے کے ملازم پیشہ لوگ انہی دنوں چھٹی لے کر آیا کرتے تھے تاکہ محلے والوں سے میل ملاپ قائم رہے۔ اگر وہ خود چھٹی پر نہ آ سکتے تو وہ ایک ماہ کے لئے بچوں کو ضرور علی پور بھیج دیتے۔ اتنی دیر باہر رہنے کے بعد عورتیں نرالی سج دھج کے ساتھ علی پور میں داخل ہوتیں اور اپنے نئے حاصل کردہ فیشن اور خیالات کو اک شان سے محلے کے عوام کے سامنے پیش کرتیں۔ اپنی عظمت کا رعب ڈالنے کی کوشش کرتیں۔

''نہ بہن بچے کو ڈرایا نہیں کرتے اس طرح بچے کے دل میں ڈر بیٹھ جاتا ہے۔ ہاں میں تو پیٹ لیتی ہوں۔ اپنے سیدی کو لیکن ڈرانا۔ اونہوں!''

دوسری بولتی نہ بہن یہ چمکدار ساٹن نہ چلے گی اس شلوار کے ساتھ۔ اب تو بہن چمکدار چیز کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ میں نے جبھی بوسکی کی قمیصیں سلوالی ہیں۔

جوان لڑکیاں کھڑکیوں میں کھڑی ہو کر محلے کی کھڑکیوں کے سامنے اپنے لباس کی نمائش کرتیں۔ لڑکے اپنے دوستوں سے مل کر نئی سیکھی ہوئی باتوں کا ریکارڈ چلاتے۔

محلے کے بوڑھے ان کی باتیں سن کر مسکراتے جیسے پاگل خانے سے چھوٹ کر آئے ہوں پھر وہ کھنکارتے اور زیر لب لاحول پڑھتے ہوئے مسجد کا رخ کرتے۔

بوڑھیاں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ارد گرد دیکھتیں اور پھر "توبہ ہے کیا زمانہ آیا ہے" کہتی ہوئیں اپنے اپنے کام میں لگ جاتیں۔

محلے کی جوان لڑکیاں حسرت بھری نگاہوں سے ان نوواردوں کی طرف دیکھتیں۔ان کا جی چاہتا کہ باتیں کرتی رہیں اور وہ سنتی رہیں۔ان کی آنکھوں میں گویا شوق کے دیئے روشن ہو جاتے۔

اس لحاظ سے محلّہ ہر سال موسم گرما میں کینچلی بدلا کرتا تھا۔جس طرح خزاں میں درخت پرانے پتے گرا دیتے ہیں اور نیا سبز جامہ اوڑھ لیتے ہیں۔اس کے باوجود آصفی محلے کی زندگی بنیادی طور پر ویسے ہی اپنے صدیوں پرانے محور پر گھومتی رہتی محلے میں تبدیلی آتی تو تھی۔لیکن کچھوا چال سے کسی کیڑے کے رینگنے کے مترادف تھی۔در حقیقت اپنی مخصوص کہنہ کج رفتاری کی وجہ سے وہ محلّہ لوگوں کو پیارا تھا۔چونکہ وہاں جا کر وہ اپنے عظمت جتا سکتے تھے۔نئے حاصل شدہ خیالات سے محلے والوں کو مستفید کرنے کے عمل میں یہ خوش فہمی دل میں رچا سکتے تھے کہ وہ نئے خیالات سے کما حقہ واقف ہیں۔در حقیقت آصفی محلّہ وہ اندھا کنواں تھا۔جہاں کوئی سمندری مینڈک داخل نہ ہوا تھا۔جہاں جوہڑ کے مینڈک پھدکتے تھے اور وہ کبھی اس قدر نہ پھولے تھے کہ اپنے آپ میں نہ سما سکیں۔

سٹیشن کے قریب انہیں رضا مل گیا۔"بھئی واہ۔"وہ چلایا۔"آ گئے جناب۔ بھئی کیوں نہ آتے۔اب بھی نہ آتے تو کب آتے ساون آیا اور مینڈک نہ ٹرائیں۔"

یہ کہہ کر وہ ایلی سے بات کئے بغیر لاٹھ گھماتا ہوا کچہری کی طرف چل پڑا۔ابھی آتا ہوں ذرا کچہری جانا ہے۔"وہ کھٹ کھٹ چلتے ہوئے چلایا۔"ہو گی ملاقات

دوکان پر۔“

برساتی نالے کے پل پر انہیں چچا عماد ملے۔ ”ہوں۔“ انہوں نے آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا ”آ گئی یہ بھجن منڈلی۔ چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ کب سے مندر میں گھنٹیاں بج رہی تھیں۔“ یہ کہہ کر زیر لب لاحول پڑھتے ہوئے وہ سٹیشن کی طرف چل دیئے۔

”اس اللہ لوگ کو مندر کی گھنٹیوں کی کیا سوجھی۔“ ایلی نے رفیق سے کہا۔

”بس جو منہ میں آیا چلا دیا۔“ یوسف نے بے پروائی سے کہا۔

”کوئی بات ضرور ہے۔“ رفیق اپنے بھیگے بھیگے انداز میں بولا۔

چوراہے کے قریب چچی اماں کو دیکھ کر ایلی نے جھک کر سلام کیا۔ ”جیتے رہو۔“ وہ بولی ”چھٹی پر آئے ہو نا۔ اچھا ہے۔ اچھا کیا۔ دیکھ لو تم بھی رونق چار دن کے لئے دن ہیں تمہارے۔“

چچی اماں کی بات سن کر ان کا ماتھا ٹھنکا ضرور کوئی بات ہے۔ نہ جانے کیا ہے۔ مگر ہے ضرور جبھی تو وہ سب اشارتاً انہیں سمجھا رہے تھے کچھ رفیق بھی گھبرا گیا۔ لیکن یوسف قہقہے مار کر ہنستا رہا۔ ”ارے یار خواہ مخواہ ڈرتے ہو۔“

ڈیوڑھی میں ارجمند نے اسے پکڑ لیا۔ ”ارے تم ہو ایلی تم۔ ارے پٹ گئے۔ تباہ ہو گئے۔ برباد ہو گئے۔“ پھر اس نے رفیق اور یوسف کو دیکھا اور دفعتاً پہلو بدلا۔ پہلو بدلنے میں ارجمند کو کمال حاصل تھا۔

”السلام علیکم بھائی صاحب مزاج اچھے ہیں صاحب اپنا حال تو تباہ ہو رہا ہے اس ایلی کے بغیر کم بخت منہ موڑتا ہے تو پھر ادھر دیکھنے کا نام ہی نہیں لیتا اور فرمائیے آپ تو خیریت سے ہیں نا۔“

رفیق مسکرا کر آگے کو چل دیا۔ تو ارجمند نے ایلی کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ”ابے ٹھہر بے۔ ہم سے ملے بغیر دادی اماں کی جھولی میں کیسے جا سکے گا تو۔“

رفیق اور یوسف کے جانے کے بعد ارجمند نے اپنے سینے پر دوہتڑ مارنے شروع کر دیئے۔ ''تباہی بربادی۔ تباہی بربادی۔ ارے یار وہ سارا اینٹ البحر کا دفتر بے معنی ہو کر رہ گیا وہ انکر اینڈی خاک میں مل گیا اور یہ پریم ٹونا اور پریم پھریرا۔ اس نے اپنی بانسری اور ریشمیں رومال کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''سب فیل'' وہ تو نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتی نہ جانے وہ ناگ کس بین پر مست ہو گا۔ ارے ارے کوئی ناگ سا ناگ ہے۔ اف، اف، اف کی پھبن ہے۔ کیا دم خم ہے۔ کیا طمطراق ہے۔ ایک نگاہ دیکھ لے تو دن بھر سرور نہیں جاتا۔ اور سانورا رنگ جیسی گوکل کا کنہیا ہو۔ اب بولو وہاں اس خاکسار کی بانسری کیا کر سکتی ہے۔ بیچاری'' ''آخر بات بھی کرو گے۔'' ایلی نے جل کر پوچھا۔

''لو بھئی۔'' ارجمند نے سر پیٹ لیا۔ ''اور یہ کیا بکواس کر رہا ہوں۔ میاں دیکھو گے تو ہوش اڑ جائیں گے وہ چیز ہے جو دیکھے بنا تصور میں نہیں لائی جا سکتی۔ اللہ اللہ کیا چیز ہے۔ خدا کی قسم اس مسجد پر ایک۔۔ بھرپور نگاہ ڈال دے تو ایک آن میں سالی آپ ہی بت بن جائے۔ لو کر لو جو کرنا ہے۔ ہئے۔ ہئے۔''

ضیا کو آتے ہوئے دیکھ کر ارجمند ایک ساعت کے لیے خاموش ہو گیا۔ ''لو بھئی۔'' وہ زیر لب بولا۔ ''آ گئی۔ ٹھنڈا لائن لہٰذا اپنی گاڑی رک گئی۔''

''اپن کی تو مین لائن ہے بھائی۔ سیدھے روٹ پر چلنا جانتے ہیں ہم۔ ہمیں تو حوروں سے واسطہ ہے غلمانوں کی بات ٹھنڈا لائن سے پوچھو۔'' ضیا حسب معمول آنکھوں میں مسکرانے لگا۔ ''ان کی پانچوں گھی میں ہیں آج کل۔'' ارجمند بولا۔ ''اور ہمارا سر کڑھائی میں ہے۔''

''کیوں بھئی یہ ٹھیک کہتا ہے ارجمند۔'' ایلی نے بات سمجھے بغیر ضیا سے پوچھا۔

''بکتا ہے۔'' ضیا ہنسا۔ ''وہ تو میرا بھائی بن گیا ہے۔ ایمان سے۔'' اور پھر

چوگان کی طرف چل پڑا۔

"ہے۔" ارجمند نے چھاتی پر ہاتھ مارا۔ "وہ ہماری بہن ہی بن جاتی۔" وہ ضیا کی طرف دیکھ کر چلایا۔ پھر ایلی سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اچھا بیٹا تو جاؤ دادی اماں کے چرن چھو آؤ۔ خاکسار بھی حویلی کی لالٹین کے نیچے ڈیوٹی دے رہا ہوگا۔ دادی اماں کے بنے ہوئے لڈو کھانے نہ بیٹھ جانا ورنہ خاکسار کی آہ پڑے گی تم پر۔"

ایلی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آخر وہ کون تھی اور وہ کون تھا اور محلے والوں کے اوسان کیوں خطا ہو رہے تھے ارجمند اور ضیا کی تو اور بات تھی مگر چچی اماں اور چچا عماد ظاہر تھا کہ چچا عماد بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے تھے۔ ایسا کون تھا وہ۔

چوگان میں پہنچ کر اس نے ڈرتے ہوئے چاروں طرف دیکھا مگر محلے والیوں کے سوا وہاں کوئی نہ تھا اور محلے والیاں حسب دستور اسے دعائیں دے رہی تھیں۔

"اللہ بڑا مرتبہ نصیب کرے۔۔۔۔"

"کون آیا ہے چاچی۔"..........

"اے ہے اپنا ایلی آیا ہے۔"

"جیتا رہے بی بی ماں کے کلیجے کی ٹھنڈک ہے۔"

ڈیوڑھی میں جا کر وہ ڈر گیا اس کے سامنے نذیراں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ "تم آ گئے۔ اب چلے نہ جانا۔"

"ہائے کون ہے؟" دادی اماں چلائی۔ "دیکھ تو سیڑھیوں میں لڑکی جیسے کسی کی پٹائی ہو رہی ہو۔ ہائیں ایلی تو ہے۔ تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔ کیا ایسے چڑھا کرتے ہیں سیڑھیاں۔ کب آیا تو۔ راضی تو رہا نا۔ علی احمد کیسا ہے۔ بچے کیسے ہیں۔ وہ خود نہیں آیا چھٹیاں کب ہوں گی اسے؟"

سعیدہ اسی طرح گھٹنوں میں سر دیئے دادی اماں کے پاس بیٹھی تھی۔ "اماں سے ملا تو" دادی اماں نے کہا۔ "وہ ادھر ہی رہتی ہے۔ فرحت کے پاس۔ اچھا مل لیجو جا

کر ذرا بیٹھ تو۔ اب تو اتنا بڑا ہو گیا ہے تو منہ پر داڑھی نکل رہی ہے۔" دادی اماں نے حیرانی سے اس کا جائزہ لیا۔ "بول کیا کھائے گا۔ تیرے لئے بہت کچھ رکھا ہوا ہے۔ میں نے ہاں۔ اے حمیدہ رشیدہ لڑکیو، تم کیا دیکھ رہی ہو۔ جاؤ اپنا کام کرو۔" وہ ان دو لڑکیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگی جو دروازے میں کھڑی غور سے ایلی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

رشیدہ اور حمیدہ سیدہ کی بہن نیاز کی بیٹیاں تھیں۔ ان کی والدہ فوت ہو چکی تھی اور اب وہ دونوں دادی اماں کے پاس آ گئی تھیں۔ "جا رشیدہ جا کر وہ کمرہ صاف کر دے۔ حمیدہ تجھے تو بہت کام ہے ابھی برتن مانجھنے ہیں۔"

"اچھا ایلی۔" دادی اماں بولی۔ "علی احمد نے میرا خرچ نہ بھیجا۔ کیا اسے خود خیال نہیں آتا۔ اے ہے میں کیوں یاد کراؤں۔ خدا نہ کرے۔ مجھے کوئی بے اعتباری ہے۔" ایلی نے بڑھ کر دادی اماں کو گود میں لے لیا۔ "اے ہے چھوڑ۔" وہ چلائی۔ "جیسے کوئی دس سال کی بچی ہو تو میری ہڈیاں توڑ دے گا۔ توبہ ہے۔ دیکھتے دیکھتے کتنے بڑے ہو جاتے ہیں یہ ہاتھوں کے جنے۔ اچھا تو کوئی اور بات سنا۔ وہاں کیسے رہتا ہے تو۔" وہ بولے جا رہی تھی اور ایلی سوچ رہا تھا کتنی پیاری ہے۔ دادی اماں۔ اس کے پاس آ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے بچہ گھونسلے میں آ گیا ہو۔ دادی اماں کے پاس جا کر وہ بھول جاتا کہ ارجمند کچی حویلی میں اس کا انتظار کر رہا ہے اور وہ کون تھا جسے ضیا نے بھائی بنا لیا ہے۔ وہ سانوری کون ہے جو کسی بین پر مست نہیں ہوتی۔

بیگم

نہ جانے وہ کب تک دادی اماں کی ہڈیوں سے چمٹ کر بیٹھا رہا حتیٰ کہ ہاجرہ آ گئی۔

"ایلی آیا ہے۔" ہاجرہ کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں "ایلی آ فرحت تیرا انتظار کر رہی ہے۔"

”جاہل آ۔“ دادی اماں بولی۔ اور وہ اٹھ کر اماں کے ساتھ فرحت کی طرف چل پڑا۔

ابھی وہ فرحت سے بات کرنے ہی لگا تھا کہ اوپر کی سیڑھیوں میں شور ہوا۔ ”سنا ہے ایلی آیا ہے۔“ شہزاد کی آواز دور سے گونجی۔ شہزاد کی آواز کی سر تال ہی نرالی تھی۔ اس کا ہر انداز محلے والیوں سے مختلف تھا۔ ایلی نے شوق سے سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ سامنے شہزاد کھڑی مسکرا رہی تھی۔ مونگیا گھڑی کے پٹ پورے طور پر کھل چکے تھے۔

شہزاد کی ہر بات میں عورت اور لڑکی کی عجیب و غریب آمیزش تھی۔ ایسی آمیزش جو محلے کی کسی عورت یا لڑکی میں نہ تھی۔ شہزاد میں بچپن کی ایک ایسی جھلک تھی جو دوسروں کو کھیلنے پر اکساتی تھی۔

ایلی نے شہزاد کو دیکھ کر سر جھکا لیا۔ ”جی ہاں۔“ وہ بولا۔ شہزاد کے روبرو اس کے جسم و روح کا رواں رواں جی ہاں کہہ کر سر جھکا لیا کرتا تھا۔

”وہ بلاتے ہیں تم کو چائے پر۔“ شہزاد مسکرائی۔ ”چلو میرے ساتھ۔“ اور ایلی چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا۔

”تم آگئے“ شریف اسے دیکھ کر مسکرایا۔ اس کی آنکھیں اسی طرح چھت پر لگی ہوئی تھیں۔ البتہ ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم تھا۔ ایلی کی نگاہ میں شریف کس قدر خوش نصیب تھا۔ جسے شہزاد نے اپنایا تھا۔ جس کی زندگی شہزاد کی روشنی سے منور تھی۔ لیکن بظاہر شریف پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ وہ اب بھی انور کے خیال میں ویسے ہی مست رہتا تھا۔ کتنا وفا شعار سچا عاشق ہے۔ اس کی محبت کو کوئی چیز متزلزل نہیں کر سکتی۔ جس کی زندگی میں شہزاد سی مونگیا گھڑی کھل کر بھی کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکی۔

”ہوں تم کیسے ہو ایلی۔“ ایک باوقار حسین عورت اس کے روبرو آ کھڑی ہوئی۔ ایلی اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔ ”سلام کہتا ہوں۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”یہ ایلی ہے اماں۔“ شہزاد نے اس عورت سے کہا۔

”مجھے یاد ہے۔“ وہ بولی۔ ”برات کے دن اندر آیا تھا۔ وہی تو ہے۔“ ایلی نے اس کی طرف ڈرتے ہوئے دیکھا۔ اونچا لمبا قد۔ فربہ جسم اور پروقار چہرہ۔ اس کے خدوخال میں حسن و وقار کی عجیب آمیزش تھی۔ آنکھوں میں حکومت کی چمک تھی۔ آواز میں دبدبہ تھا۔ اس کی انگلیوں میں عجیب قسم کی انگوٹھیاں تھیں۔ جن میں نگ کلی کی طرح ابھرے ہوئے تھے۔

”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے گویا ایلی کو ڈانٹا۔ ”سنا۔ تیرے باپ کا کیا حال ہے۔ اب تو کشمیر کے سیب سے بھر گیا ہوگا اس کا دل کوئی نئی نویلی چڑھی ہے نگاہ میں۔“

”جی جی۔“ ایلی بن سوچے سمجھے کہے جا رہا تھا۔ لیکن اس کا جی چاہتا تھا وہ اس کے روبرو بیٹھا رہے اور کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھتا رہے۔ اس وقت وہ شہزاد کو بھی بھول چکا تھا۔ اور شریف تو بالکل ہی ذہن سے اتر چکا تھا۔

پھر ملحقہ کمرے سے کسی نے آواز دی اور بیگم بولی۔ ”پھر بیٹھوں گی کسی وقت تیرے پاس۔“ یہ کہہ کر وہ چلی گئی اور طلسم ٹوٹ گیا۔

ملحقہ کمرے سے شہزاد کی سی کئی ایک آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے چمن میں بہار آ گئی ہو۔ لیکن وہ چمن ایلی کے لئے ممنوع تھا۔ ممنوع نہ بھی ہوتا تو بھی اس کی جرات نہ ہوتی کہ وہاں جا کر دیکھتا کہ وہ آوازیں کن کی تھیں۔ جرات ہوتی بھی کیسے۔ اس میں کوئی بھی خوبی نہ تھی۔ چہرہ کارٹون سا تھا۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ دکھائی دیتا تھا۔ رنگ کالا تھا۔ کوئی بھی تو ایسی خصوصیت نہ تھی جس کے بل بوتے پر وہ اپنے آپ کو درخور اعتنا سمجھتا۔ امید رچاتا اور جرأت کو کام میں لاتا۔

سامنے شریف لیٹا ہوا نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔ وہ اپنے ہی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ نگاہیں ماضی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اسے یہ احساس نہ تھا کہ ایلی دنیا میں کھویا ہوا

ہے۔ اور اس کی بات نہیں سن رہا۔ اسے اس سے غرض نہ تھی کہ کوئی اس کی بات سنے۔ اسے تو کہنے سے غرض تھی اور بات کہنے کے لئے اس نے ایلی کو چن لیا تھا اور ایلی سننے کا انداز قائم کئے کچھ سوچ رہا تھا۔ اسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے کیا محسوس کر رہا ہے۔ اپنے محسوسات کو اپنا کے شاید اسے ندامت ہوتی اس لئے اس نے اپنے محسوسات کو واضح طور پر کبھی نہ اپنایا تھا اور قریب ہی کسی چمن میں رنگین چڑیاں چہک رہی تھیں دور کچی حویلی کی لالٹین کے نیچے انگر اینڈی کا شیدائی پریم سندلیس تھامے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

کار اور خاکسار

اگلے روز صبح سویرے ہی ارجمند آ گیا۔ ''اویزید کے چیلے۔'' وہ آتے ہی چلایا۔ ''کل سارا دن مجھے کچی حویلی کے صحرا میں پیاسا مارا اور خود گوکل کے بن میں سانوری سے رنگ پچکاری کھیلنے میں مصروف رہا۔ تف ہے تیری دوستی پر۔''

جب ایلی نے سانوری کے متعلق اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو ارجمند قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ ''ہمیں بتاتا ہے یار ہمیں جنہوں نے پریم دویا پر بالپن ہی میں عبور حاصل کر لیا تھا۔ اپن وہ ہیں جنہوں نے پانی پت کی ڈسپنسری کی میزوں پر پریکٹیکل ٹریننگ حاصل کی ہوئی ہے۔ کہو تو سند دکھا دیں۔ سند یافتہ لوگوں کو چٹکیوں میں اڑانا آسان نہیں۔ اچھا تو بیٹا کل کی رپورٹ دو۔ کونسے مراحل طے کر لئے اور کون کون سے باقی ہیں۔ لیکن یار کیا رنگ ہے کیا انداز پایا ہے۔ اور پھر ماشاءاللہ حساس اور سمجھدار۔ ہلکی سی جنبش بھی نوٹ کئے بغیر نہیں رہتی۔ رومال کی ہلکی سی جنبش کی یوں۔ مطلب خاکسار ابھی حاضر ہوا۔ فوراً بات پالی لیکن کیا مجال کہ چتون سے ظاہر ہو۔ صرف ایک لطیف مسکراہٹ اور پھر فوراً جتا بھی دیا۔ ہم سمجھ گئے۔ خاکسار ہو آئے اجازت ہے جب تک ہمیں چوگان سے کوئی دلچسپی نہیں'' اور پھر چوگان سے کوئی دلچسپی نہیں''

اور پھر چوگان سے منہ موڑ کر کھڑے ہو گئے اور جب تک خاکسار واپس نہ آیا ویسے ہی کھڑے رہے۔ واہ واہ کیا ذہانت ہے۔ جتنی بڑی بے پروا ہے۔ اتنی ہی چھوٹی حساس ہے۔ واہ واہ اپنا انکرایَنڈی وہ چلا ہے کہ بس کیا بتاؤں۔" وہ رک گیا۔

"لیکن سب بیکار رہے" اس نے بیتنترا بدلا۔ "سب بیکار انکرایَنڈی کا ہوش بھی رہا ہو۔ کس کافر کو ہوش رہے گا۔ میں کب تک مچھلی کانٹے پر لگی تڑپتی رہے اب تو وقت ہے کہ سرکار ڈوری کھینچیں۔ لیکن سرکار بھی کیا کریں ایلی وہ تو خود مہمان کی حیثیت سے آئے ہوئے ہیں وہ کیسے کھینچیں اور خاکسار کے لئے یہ رنگ محل ممنوع ہوا۔ وہاں جائے تو کس بہانے جائے اسی فکر میں تھا خاکسار کہ اللہ نے رحمت کا فرشتہ بھیج دیا یعنی تم آ گئے اور تم یہاں پہنچتے ہی یزید بن کر رہ گئے۔ ہئے ہئے۔"

سانورے کنہیا

"ہاہاہا" دفعتاً ارجمند چیخ کر بولا۔ "ہم اپنی رام کہانی میں لگے ہیں اور وہ دیکھو وہ۔ اس کھڑکی میں ارے اندھے وہ والی جو اندھیری ڈیوڑھی کے اوپر کھلتی ہے۔ نہ جانے سانورے کنہیا کب سے اپنی گوپیوں کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ اے ٹھہر تو۔ اتنا بے صبر کیوں ہوا جا رہا ہے۔ مجھے پرنام تو کر لینے دے۔" اور وہ درشن کے بن ترس گئی اکھیاں گنگنانے اور رومال ہلانے لگا۔

کھڑکی میں ایک اونچی لمبی لڑکی لمبی لمبی پلکوں سے سیادہ خوابیدہ آنکھوں کو ڈھانپے کھڑی تھی۔ اس کے نقوش ستواں تھے۔ چہرے پر انوکھی سی ریشمیں ملاحت کا شفاف سا نقاب پڑا تھا۔ جیسے کوئی سنڈیلا ہاتھ میں شیشے کا سلیپر لئے حیران کھڑی ہو۔ "لیکن یہ ہے کون؟" ایلی چلایا۔

"کیا واقعی۔" ارجمند نے حیرانی سے ایلی کی طرف دیکھا۔ "ہم تو سمجھ رہے تھے کہ بنا رہا ہے ہمیں۔ ارے بھائی یہ سب تمہاری اس مونگیا گٹھڑی سے نکلے ہوئے فتنے ہیں۔ جب سے وہ پنڈورا یہاں آئی ہے رنگین مصیبتوں کا ایک صندوق کھل گیا

ہے۔ اب کرلو جو کرنا ہے اور ابھی دیکھا گیا ہے ابھی تو وہ گلاب کا پھول اور رس گلا بھی ہیں۔ اف! وہ گلاب کی کلی جب کھلے گی تو دنیا پر رنگ کی وہ قیامت ٹوٹے گی کہ آنکھیں پھٹ جائیں گی۔ چھ سال کی عمر میں یہ کیفیت ہے کہ مسکراتی ہے تو فضا میں قندیلیں روشن ہو جاتی ہیں اور وہ ان کا بھائی شوکت جیسے موم کا پتلا ہو۔ ضیا تو اسے دیکھ کر ہمیشہ کے لیے بدمعاشی سے توبہ کر چکا ہے اور جمیل پیڑے کھانے کے شغل کو بھول چکا ہے خیر اپنے کو تو ٹھنڈا لائن سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اپن کو تو بار یہ سانورے کنہیا لے ڈوبے اور حضور گاتے بھی ہیں واہ وا کیا گاتے ہیں۔ چار دیک دن ہوئے بھجن منڈلی میں براجمان ہوئے تھے۔ وہ رنگ جمایا کہ بس کیا پوچھتے ہو۔ محلے کے لڑکوں کے دل کانوں میں منتقل ہو گئے اور بعضوں نے وہ تال دی کہ بس اے ہے۔" وہ چھاتی پر دوہتڑ مارنے لگا۔

عین اس وقت سیڑھیوں سے پاؤں کی چاپ سنائی دی جیسے کوئی نیزے پر ناچ رہا ہو اور پھر چھم سے شہزادہ داخل ہوئی۔ اس کا سانس چڑھا ہوا تھا۔ دوپٹہ کندھوں پر اڑ رہا تھا۔ منہ پر سرخی جھلملا رہی تھی۔ "ایلی ایلی۔" وہ بولی۔ "کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ چائے سامنے رکھے چلو۔ جلدی آؤ۔" یہ کہہ کر وہ واپس دوڑ گئی۔

ارجمند از سر نو سر پیٹنے لگا۔ "ہائے اللہ کی کریں ہم کدھر جائیں ہمیں کوئی نہیں بلاتا چائے پر کوئی پوچھتا ہی نہیں کہ میاں کون ہو۔ سیر ہو یا پاؤ ہو۔ اچھا بھئی جاؤ۔ مزے اڑاؤ۔ اپن کا کیا ہے۔ جیسے تیسے وقت بتا لیں گے بس یہی فرق ہے نا کہ تم سنگ ساتھی ہو اور ہم پردیسی۔ پر یاد رکھو دوست۔ سنگ ساتھی کو کبھی وہ رتبہ نہیں ملا جو پردیسی کو ملتا ہے۔ آخر میں بازی پردیسی ہی کے ہاتھ میں رہتی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے حریفانہ سلوٹ مارا اور چلا گیا۔

اس کے بعد یہ معمول ہو گیا۔ روز صبح سویرے چائے کے لیے شریف کی طرف سے بلاوا آتا۔ پہلے فضا میں گھنگرو بجتے پھر چھم سے شہزادہ اتر آتی۔ دوپٹہ اس کے

شانوں پر یوں لٹکتا جیسے کسی ہوائی ڈاک کا اشتہار ہو۔ بانہیں فضا میں لہراتیں جیسے رفتار ظاہر کرنے کے لئے مصور نے گلابی خطوط لگا دیئے ہوں۔ ''وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' وہ ہنستی۔ گھنٹیاں بجتیں۔

چاچے پر شریف اسی طرح چھت پر نگاہیں گاڑے رہتا اور ہر دو منٹ کے بعد ایک لمبی آہ بھرتا اور پھر جوش میں دبی آواز سے کہتا۔ ''کسی سے محبت کرو ایلی۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو بس محبت کرو۔''

دوپہر کو جمیل شوکت کو بلا لاتا ہے۔ وہ تینوں برساتی میں بیٹھ کر گپیں اڑاتے۔ جس کے دوران میں ایلی اس آئینے کی طرف دیکھتا رہتا جو جمیل نے ایسے زاویئے پر لگا رکھا تھا کہ نیچے سے آتا ہوا ہر شخص پہلے ہی نظر آجائے۔

جمیل شوکت سے باتوں میں مشغول رہتا۔ شوکت نہایت معصومیت سے جمیل کی طرف دیکھتا اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ روزانہ اسے اتنی مٹھائی کیوں کھلاتا ہے اور ایلی اس آئینہ پر کیوں جھکا رہتا ہے۔

دوپہر کے وقت شہزاد کی والدہ آجاتی جسے سب بیگم کہتے تھے اور وہ تھی بھی تو بیگ، ایلی اکثر محسوس کرتا تھا کہ اس کے سر پر چھوٹا سا تاج بھی ہونا چاہیے تھا۔ جیسے بیگمات پہنتی ہیں۔ اس کے انداز میں بلا کا رعب تھا اور اس کی نگاہوں میں ایک عجیب شان بے نیازی تھی۔

بیگم کو آصفی محلہ بالکل ناپسند تھا ''یہ کیا ہیں تمہارے محلے کے مکانات۔'' وہ ایلی سے کہتی ''اندھیرے کونے اجڑے ہوئے چوبارے جیسے گلی سڑی پیاز کے چھلکے ہوں ایک دوسرے کے اوپر۔ دوسرا تیسرے کے اوپر توبہ ہے ہمارے یہاں تو صاف ستھرے کمرے ہوتے ہیں اور شہزاد کے ابا۔ تو ایک دن بھی نہ ٹھہریں یہاں بڑے صفائی پسند ہیں وہ اور یہ جو تمہاری محلہ والیاں پکاتی ہیں۔ جسے تم لوگ کھانا کہتے ہو۔ ان کے سامنے رکھا جائے تو طوفان اٹھا دیں۔ تمہارے محلے کے مرد تو بدھو نہیں بدھو۔

مردوں کی سی بات نہیں ان میں۔ کبھی ہمارے یہاں آؤ تو تمہیں دکھاؤں میں۔"

ایلی مسحور ہو کر بیگم کی باتیں سنتا۔ اس وقت اس کی نگاہوں میں نور پور کا وسیع میدان پھیل جاتا اور قلعے کے برج ابھرتے اور وسیع فراخ کمرے کھلتے اور بالآخر ایک زرد مینڈک اور دو حنائی انگلیاں اس کی طرف بڑھتیں۔

پھر شام کے وقت جب سورج غروب ہونے کے لئے مغرب میں اترتا تو ایلی کوٹھے پر چڑھ جاتا اور کتاب ہاتھ میں لے کر وہاں ٹہلتا جیسے سبق یاد کر رہا ہوتا کہ متصل کوٹھے پر سانوری کو دیکھ سکے اور متصل کوٹھے پر ہلکے رنگوں میں ملبوس سانوری یوں ٹہلتی جیسے اسے ایلی کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہو۔

اس کی بڑی بڑی آنکھیں دور کسی افق پر مرکوز ہو جاتیں۔ اس کا دوپٹہ یوں لٹکتا جیسے تاج پوشی کی تصاویر میں شہزادیوں کے پیچھے ریشمیں کپڑے لٹکتے ہیں۔ ٹک ٹک ٹک۔ اس کی اونچی ایڑی والی گرگابی بلمپت لے میں تال دیتی اور پھر نہ جانے کیا ہوتا۔ گردوپیش کے دھندلے مکانات سبز پیراہن پہن لیتے اور چوبارے یوں دکھائی دیتے جیسے تنکوں سے بنے ہوئے جنگلی جھونپڑے ہوں اور پھر دور سے بانسری کی سریں بلند ہوتیں اور کرشن کنہیا گوکل کے بن میں ٹہلتے اور ان کے چہرے کے ریشمیں سانولے پن میں اشیر باد کی مدھم روشنی چمکتی اور ریچھے چوگان میں کوئی راکشش ارجمند کے روپ میں چلاتا۔ "نند گاؤں والے اے او گوکل کے پجاری۔ لو بھئی یہ حضرت ہاتھ سے گئے۔ نہ جانے کیا زمانہ آیا ہے۔ چھوٹوں کو بڑوں کا لحاظ نہیں رہا۔ اب بتاؤ۔ اقربا میرے کریں خون کا دعوے کس پر۔"

گل حکمت کا متوالا

پھر بیٹھے بیٹھے رفیق کو سوجھی۔ رفیق کو ہمیشہ ہی سوجھا کرتی تھیں اگرچہ بظاہر وہ ایک خاموش لڑکا تھا۔ رفیق کی تمام تر قوت اس کی آنکھوں اور گالوں میں سمٹ کر آ گئی تھی۔ جہاں تک زبان کا تعلق تھا وہ گونگا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی بات بھی کرو تو وہ

مسکرا دیتا اس کی مسکراہٹ میں تلخی نہیں ہوتی تھی۔ ایسی بات کرو جو اسے ناپسند ہو تو اس کے ہونٹ ہلکے سے کھل جاتے اور اس کی آنکھوں میں بوندا باندی شروع ہو جاتی۔ ایسی بات چھیڑ دو جو اس کے لئے تکلیف دہ ہو تو وہ گھبرا جاتا۔ اس کے ہونٹوں سے اف اف کی آواز نکلتی جیسے اس نے کوئی گرم چیز منہ میں ڈال لی ہو اور اس کی حرکات اضطرابی رنگ اختیار کر لیتیں۔

بے زبان ہونے کے باوجود رفیق بے حد حساس تھا۔ اس کی طبیعت میں دبی دبی رنگینی تھی۔ صبح سویرے ہی وہ شریف کے یہاں جا پہنچتا "چچی کوئی چیز تو نہیں منگوانی۔" اور پھر جب چچی رنگین اشتہار کی طرح اس کے سامنے آتی تو وہ گھبرا کے پیچھے ہٹ جاتا اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں اور کوئی رنگین سر گلے میں پھنس جاتا شدت تاثر سے وہ اف اف سی سی کرتا آنکھوں کی بوندا باندی اور تیز ہو جاتی۔ رفیق دبی دبی آنچ کو پسند کرتا تھا۔ وہ گل حکمت کا متوالا تھا۔ اسے بھڑک کر جلنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کے کردار میں دو پہلو نمایاں تھے رنگینی اور جھجک۔

آن ملا تھا

اس کے باوجود رفیق کو اکثر سوجھتی تھیں۔ اب کی بار اسے لاجواب بات سوجھی اور محلے کے لڑکے بات سن کر متفقہ طور پر جھومنے لگے۔

"میں کہتا ہوں۔" وہ بولا۔ "اگر ہم ایک ڈرامہ کھیلیں تو۔"

"ڈرامہ۔" ایلی کے دل میں گویا ایک رنگین ہوائی چل گئی۔

"ڈرامہ۔ آہا۔ کیا بات ہے۔" ارجمند چلایا۔ کرشن کنہیا ٹھیک رہے گا۔ آہا ہا ادھر گائیاں ادھر گوپیاں اور بیچ۔ میں بندرابن کا گوکل۔"

"ڈرامہ۔" صفدر نے ایک لمبی آہ بھری اور سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر شانے پھیلا کر گنگنانے لگا۔ "حافظ خدا تمہارا۔"

یوسف سپاہیانہ ہنسی ہنسا۔ "یہ بھی کر دیکھو۔" وہ بولا۔

رضا نے اپنی لنگڑی ٹانگ جھلا کر کہا۔ ''میاں کوئی بادشاہ کا پارٹ ہو تو ہمیں دے دینا۔ باقی سب خیریت ہے۔''

صفدر کے دالان میں پردوں کی جگہ کھیس اور چادریں لٹکائی گئیں۔ کیونکہ اس کے سامنے صحن کے اوپر کی چھت گیلری کا کام دے سکتی تھی۔ جہاں سے محلے کی عورتیں ڈرامہ دیکھ سکتی تھیں۔ آغا حشر کے کھیل ''خوبصورت بلا'' کا ایک رنگین ٹکڑا کھیلنے کے لئے چنا گیا۔ رفیق نے گلخیر و کا پارٹ سنبھال لیا۔ ارجمند کو زٹیک کا کام ملا اور اسی طرح سب ہی پارٹ محلے کے بڑے لڑکوں نے سنبھال لئے اور وہ سب شدت سے ریہرسل میں مصروف ہو گئے۔

اس رات صحن کھچا کھچ لڑکوں سے بھرا تھا اوپر گیلری میں بیس تیس عورتیں بیٹھی تھیں۔ بستر کے لٹکے ہوئے کھیسوں اور چادروں کے پیچھے گلخیر و کی آنکھوں میں گلابی رنگ کی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ارجمند زٹیک کے بھیس میں پریم پتر اور پریم ٹونا سنبھالے کھڑا تھا۔ صفدر ہدایت کار کی حیثیت سے شانے پھیلائے۔ ''اے دلربا میں ہوں فدا۔'' گنگنا رہا تھا۔

کھیل شروع ہوا۔ ایکٹریوں منہ اٹھا کر باتیں کر رہے تھے، جیسے اللہ تعالی سے ہم کلام ہوں۔ گلخیر و لقہ کبوتر کی طرح سینے کو دہرا کئے کھڑا تھا۔ زٹیک چھت سے باتیں کر رہا تھا۔ پرامٹ کرنے والوں کے لئے کتاب پر نظریں جمائے رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ پٹاخہ بجا بھی دیتے تو پردہ کھینچنے والے کو معلوم ہی نہ ہوتا کہ اسے پردہ کھینچنا چاہیے۔

ادھر زٹیک سامنے منظر کی وجہ سے اس حد تک مست ہو گیا تھا کہ ان جانے میں اس نے ڈنڈے کو یوں تھام لیا تھا جیسے وہ ایک بانسری ہو۔ صرف ایلی کی نگاہیں جھکی جھکی تھیں۔ اسے زنانہ پارٹ کرنے میں شرم محسوس ہو رہی تھی۔

تماشائی بار بار تالیاں بجا رہے تھے۔ گیلری کے دھندلکے میں سفید دانت

چمک رہے تھے۔ ہلکی ہلکی روپہلی گھنٹیاں بج رہی تھیں جنہیں سن کر اداکار اور بھی چمکتے اور ان کے لئے اپنے پارٹ پر محدود رہ جانا مشکل ہو جاتا اور وہ اپنی طرف سے بڑھا چڑھا کر مکالمے بولتے۔ آخری گانے پر زبردست تالیاں پیٹی گئیں۔ گیلری سے دبا دبا واہ وا کا شور بلند ہوا۔ اس پر گانے والے اور بھی چمکے اور وہ جوش میں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگے اور وہ اپنے بازو جھلاتے ہوئے چلایا ''آن ملا تھا۔ اک پردیسی پیاری بھول نہ جانا۔'' جیسے گیلری میں کسی سے مخاطب ہو۔ اس پر تالیوں کا طوفان اور بھی تیز ہو گیا۔ گیلری سے باآواز بلند نعرے سنائی دیئے اور آخری ڈراپ گرا دیا گیا۔

کون خوش نصیب

اگلے روز جب ایلی چائے پینے کے لئے شریف کے گھر بیٹھا تھا اور شریف دو ایک منٹ کے لئے اسے اکیلا چھوڑ کر خود کوٹھے پر گیا ہوا تھا تو دفعتاً قریب ہی سے اک سریلی آواز اس کے کان میں پڑی اور اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کوئی گا رہی تھی۔

''آن ملا تھا اک پردیسی پیارے بھول نہ جانا جی۔'' اس نے لپک کر ملحقہ کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ سانوری کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ جن پر لمبی لمبی پلکیں سایہ کئے ہوئے تھیں۔ اس کے سانورے رنگ میں مخملی چمک تھی اور کھڑے ہونے کے انداز میں واضح سپردگی ایلی کا دل اچھل کر اس کے گلے آ اٹکا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا وہ مسکرائے جا رہی تھی۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ اس سے بات کرے اس سے پوچھے ''تم سانوری ہو۔ کیا واقعی۔'' مگر اس میں اتنی جرات نہ تھی۔

شام کو ایلی جب دولت پور جانے کی تیاری میں مصروف تھا تو دفعتاً وہ چونکا۔

''ارے۔'' وہ چلایا۔ ''اس نے تو کہا تھا۔ پیارے بھول نہ جانا جی۔ پیارے ہاں

ہاں یقیناً اس نے پیارے کہا تھا۔ لیکن گیت میں تو پیاری تھا۔ ہاں ہاں۔ پیاری بھول نہ جانا جی۔ پھر سانوری نے پیارے کیوں کہا تھا۔ پیارے سے اس کا مطلب کیا تھا۔ کس سے مخاطب تھی وہ۔ اس وقت کمرے میں تو کوئی بھی نہ تھا اور وہ کھڑکی میں تو نہ تھی۔ کھڑکی سے دور اس دروازے کے قریب جو گھر میں کھلتا تھا۔" ایک ساعت کے لئے اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ "شاید" اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ "نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے یہ مجھ میں ہے ہی کیا لاحول ولا قوۃ مجھ سے یہ جملہ کیسے کہا جا سکتا ہے۔ پھر سانوری کہے۔"

"لیکن پھر وہ کون تھا۔ کون تھا وہ۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "نہ جانے کون تھا۔ کوئی خوش نصیب ہو گا۔"

اس کی چھٹیاں کیسے نازک وقت پر ختم ہوئی تھیں۔ اگر وہاں کچھ دیر اور رہتا کاش۔ کم از کم اسے یہی معلوم ہو جاتا کہ وہ خوش نصیب کون ہے۔

پھر جب وہ شریف کو خدا حافظ کہنے کے لئے شہزاد کے گھر گیا تو اس نے دیکھا کہ سانوری کھڑکی میں کھڑی تھی۔ خاموش اداس، ایک ساعت کے لئے اس کی پلکیں اٹھیں اس نے ایک ساعت کے لئے نگاہ بھر کر ایلی کی طرف دیکھا۔ ایک واضح آہ بھری پھر اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ سانورے رنگ کی لمبوتری انگلی نے یوں رخسار کو چھوا جیسے آنسو پونچھ رہی ہو پھر اس نے منہ موڑ لیا۔

"تم جا رہے ہو ایلی۔" شریف مسکرایا۔ "جاؤ چلے جاؤ۔ اس اندھے کنوئیں سے بھاگ جاؤ۔ جاؤ وہاں جہاں لوگ محبت کرنے کو گناہ نہیں سمجھتے جاؤ محبت کرو ایلی جاؤ۔"

ڈیوڑھی میں رفیق سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے ایک لمبی آہ بھری۔ سی سی کی مدھم آواز سنائی دی۔ "میں بھی جا رہا ہوں ایلی" وہ بولا۔ "نوکری مل گئی ہے۔ مجھے اب جانا ہی ہو گا۔" وہ یوں آہیں بھر رہا تھا جیسے نوکری کا مل جانا بدقسمتی ہو۔

لالٹین کے قریب ارجمند کھڑا اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ ''یہ تم نہیں جا رہے ایلی۔'' وہ بولا۔ ''تمہیں کون خاطر میں لاتا ہے۔۔۔'' وہ رک گیا۔

''لیکن کیا۔'' ایلی نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''پچکاری سے رنگ جا رہا ہے۔ بانسری سے نغمہ جا رہا ہے۔'' ارجمند نے آہ بھر کر کہا۔

''پاگل ہو گئے ہو۔'' ایلی نے اسے گھورا۔

''ہاں۔'' اس نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی۔ ''سچ کہتا ہوں۔'' اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''سانوری کنہیا نے پاگل کر دیا ہے کیا۔'' ایلی نے پوچھا۔

گوپیوں کے بغیر کنہیا کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں اتنا بھی نہیں جانتے تم۔ ارجمند نے پینترا بدلا'' چلے جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔ جاؤ ہم حکم دیتے ہیں جاؤ۔ مابدولت کا فرمان بجا لاؤ۔ جاؤ۔۔۔۔۔''

قرب کی آرزو

اب کی بار دولت پور میں پہنچ کر ایلی کے خیالات اور حسیات بدل رہے تھے۔ اس کے احساسات میں نئی بیداریاں پیدا ہو رہی تھیں۔ خیالات میں تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ جسم میں نئے تقاضے ابھر رہے تھے۔ اس کے دل میں عورت کے قرب کا شوق پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ عورت کے قریب جائے۔ اسے قریب سے دیکھے اسے پیار کرے مگر یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا۔ آصفی سماج میں کسی عورت کے قریب جانے کا امکان نہ تھا۔ اور اگر ہوتا بھی تو ایلی میں اتنی جرأت کہاں؟ بہر حال اس کی خواہش تھی کہ کسی کی بانہہ پکڑ لے اور پھر رو دے پھر اسے اس کوچے کا خیال آتا جہاں سے سارنگی کی سریں گونجا کرتی تھیں۔ لیکن...... اگر بفرض محال وہاں چلا بھی جاتا تو ان عورتوں کو دیکھ کر عجیب سی کراہت محسوس ہوتی جو لالٹین جلائے ہوئی بیٹھی مردوں کا انتظار کیا کرتی تھیں۔ در حقیقت وہ انہیں عورتیں ہی نہیں سمجھتا تھا۔

اس کوچے میں پہنچے بغیر کسی عورت سے قرب ممکن نہ تھا کسی کو بلوریں پاؤں سکھاتے ہوئے دیکھتا یا کسی کو کھڑکی سے جھانکتے ہوئے ایک نظر دیکھ لیتا تو اسے اور بھی مضطرب کر دیتا تھا پھر عورت سے قرب کی آرزو کیسے پوری ہو سکتی تھی۔

پھر دفعتاً اسے ایک خیال آیا۔ ایک مکروہ بھیانک خیال۔ اور وہ لرز گیا مگر لرزنا بیکار تھا اس کا مسلسل طور پر اس خیال پر لاحول پڑھنا بیکار تھا کیونکہ ابتداء سے ہی یہ خیال اس کے دل کی گہرائیوں میں بیٹھ چکا تھا جب وہ ابھر کر ایلی کے شعوری ذہن کی طرف یورش کرتا تو ایلی اسے پھر دبا دیتا اور اس طرح اپنی دنیا کو محفوظ کر لیا کرتا مگر وہ دبایا ہوا خیال اندر ہی اندر دل کو متعفن کیے جا رہا تھا۔

جنسیاتی محور

ایلی کی تمام تر جنسیاتی زندگی علی احمد کے محور کے گرد کھو گئی تھی جب کوئی جونک ان کے گھر آ کر علی احمد کا خون چوسنے کے شغل میں مصروف کار ہو جاتی تو وہ غصے سے بھوت بن جاتا۔ علی احمد کو ایسی زندگی بسر کرنے کا حق نہیں۔ اسے ٹین کے سپاہی کا کردار ادا کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اسے اپنے آپ کو لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل کرنے کا کیا حق ہے۔ کیا اسے ایسی سستی قسم کی عورتوں کے علاوہ کوئی باعزت عورت نہیں ملتی۔ وہ اس بات پر پیچ و تاب کھاتا۔ اور اگر سارہ صبورہ سی باعزت لڑکیاں علی احمد کے رنگین جال میں پھنس جاتیں تو بھی اسے غصہ آتا۔ کیا اسے اپنی عمر کی عورتیں نہیں ملتیں۔ کیا اسے اس قسم کی سستی عورتیں نہیں مل سکتیں جو روپے کے عوض خریدی جا سکتی ہوں۔ ہر صورت میں اسے علی احمد پر غصہ آتا اور غصے کے بہانے اس کے جنسی پہلو میں ابال آ جاتا اور پھر وہ چوری چوری سوچتا کہ عورت سے قرب حاصل کرنے کا ایک طریقہ ہے ایک واحد امید اور پھر ایک عمر رسیدہ عورت بادلوں سے جھانکتی اور اس کی طرف دیکھ کر مسکراتی۔ اسے اپنی طرف بلاتی اور اس کا جی چاہتا کہ اس کی گود میں سر رکھ کر رو دے۔ روتا رہے حتیٰ کہ جسم کا درد دور ہو جائے۔ ہڈیوں میں جو چیونٹیاں سی چلتی تھیں چٹکیاں لیتی تھیں ان سے نجات حاصل ہو نسوں میں جو تناؤ سا اسے پریشان رکھتا تھا وہ ختم ہو جائے لیکن دفعتاً وہ گود میں پڑے ہوئے محسوس کرتا کہ وہ اس بھرپور عورت کو جانتا ہے اس کی شکل و صورت مانوس سی دکھائی دیتی اس کے منہ سے ایک چیخ نکل جاتی۔ اور وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتا اور پھر معدوم ہونے کی کوشش میں کھو جاتا۔

ہائے ایلی!

اب کی بار جب وہ دولت پور میں آیا تو اس کے خیالات کی دنیا میں نئی تفصیلات کا اضافہ ہو گیا تھا۔ بیٹھے بٹھائے ایک رنگین سی آواز اس کے کان میں پڑتی پیارے بھول نہ جانا جی۔ ایک ملیح تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے جھلملاتی۔ پھر ایک بامعنی

ہنسی۔ واضح اور رنگین اور بالاخر مژگاں کے دو گھنے چھتر جھک جاتے اور ایک لمبی سی مخروطی پرنم انگلی فضا میں ابھرتی۔ پھر دفعتاً چھم سے کوئی آ جاتا اور منظر یوں بدل جاتا جیسے پتھر گرنے سے جھیل کے ساکت پانی میں ساحل کے ایوانوں کے دھندلے مگر حسین نقوش دفعتاً پاش پاش ہو جاتے ہیں اور چاروں طرف لہریں اٹھنے لگتیں۔ پھر فضا میں چاروں طرف مرکری دیوتا کے ٹخنوں پر لگے ہوئے ننھے بازو پھڑ پھڑاتے۔ بلوریں پاؤں رقص کرتے اور بال دوپٹہ اور مژگاں ایک زناٹے سے اس کے قریب سے نکل جاتے اور دور۔ دور ایک مدہم حسین آواز گنگناتی ہوئی سنائی دیتی۔ "ہائے ایلی وہ چاہئے پر انتظار کر رہے ہیں۔" اس وقت ایلی چونکتا اور شرم سے سر جھکا لیتا۔ ایک مبہم سا احساس جرم اس کے دل و دماغ پر چھا جاتا۔ دور ایک ننھی سی حسین عورت سفید آنچل پھیلائے اڑے جاتی۔ اور اس کا جی چاہتا کہ کہیں سر رکھ کر رو دے اتنا روئے کہ کوئی ہاتھ لپک کر اسے تھپکنے پر مجبور ہو جائے۔ قریب ہی سے شریف کا مدہم قہقہہ گونجتا۔ ایلی محبت کرو۔ محبت کرو چاہے کسی چیز سے کرو محبت کرو۔ محبت کیے بغیر تم کچھ بھی نہیں؟ وہ اپنا سر لحاف میں گاڑ دیتا آنکھیں بند کر لیتا۔ نہیں نہیں میں مجرم نہیں ہوں میں جرم نہیں کروں گا۔ اور پھر نہ جانے کہاں سے دو بلوریں ہاتھ اس کی طرف بڑھتے اور ہمدردی بھرے لمس سے اسے تھپکنے لگتے اور وہ یوں روتے روتے سو جاتا جیسے کوئی بچہ کسی کھلونے کو حاصل نہ کرنے پر روتے روتے تھک کر سو جاتا ہے۔

چھجو کا چوبارہ

خوش قسمتی سے انہیں دنوں ایلی کا بہنوئی اجمل دولت پور میں آ گیا۔ اسے دولت پور کی کچہری میں ایک نوکری مل گئی تھی۔

ایلی کو اجمل سے بہت ہمدردی تھی۔ کیونکہ کئی ایک پہلوؤں سے اس کی اپنی زندگی اجمل سے ملتی جلتی تھی اس کے علاوہ اجمل نے اوائل عمر میں ہی بصرہ اور کابل

سے دور دراز مقامات کے سفر کیے تھے جن کی وجہ سے اس کے دل میں اجمل کی عزت پیدا ہو گئی تھی۔

اجمل او نچے لمبے قد کا لڑکا تھا جس کی قابلیت پر ایلی فخر محسوس کیا کرتا تھا اور سب سے بڑھ کر اسے اجمل کی رنگین طبیعت بہت پسند تھی۔ باجرہ کی نکتہ چینی کے باوجود یا شاید اسی وجہ سے اسے اجمل بہت پسند تھا اور وہ محسوس کرتا تھا کہ اجمل اس کا دوست ہے۔

اجمل کے دولت پور آ جانے سے ایلی کو ایک سہارا مل گیا کیونکہ اجمل نے وہاں پہنچتے ہی اپنے اثر رسوخ سے علی احمد کے گھر سے ملحقہ چھجو کا چوبارہ کرائے پر لے لیا اور ایلی کے لیے اجمل کا گھر ایک نعمت غیر مترقبہ ہو گیا۔

ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ اجمل کے آ جانے سے ایلی نے شمیم کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانے سے نجات پا لی اب اسے پہلوان کی دوکان پر جا کر دودھ اور بن کھانے کی بھی ضرورت نہ پڑتی تھی۔

ادھر علی احمد نے ایک بار پھر۔ پرانے انداز کو اعلانیہ اپنا لیا تھا شاید اس لیے کہ کشمیر کا سیب اپنی تمام تر رنگینی کھو چکا تھا۔ اب علی احمد کو ان بل کھاتی ہوئی گلیوں سے گزر کر اتنی دور راجو کے گھر جانا نہیں پڑتا تھا بلکہ راجو خود ان کے یہاں آزادی سے آتی جاتی تھی اور علی احمد کا کمرہ ایک مرتبہ پھر وہی بام آباد کا کمرہ بن گیا تھا جہاں ربڑ کی گڑیا چیختی۔ اور ٹین کا بکتر بند سپاہی جنگ کے نعرے لگاتا اور پھر رنگین ہنسی کی آواز سنائی دیتی جسے سن کر شمیم غصے سے بل کھاتی اور پھر انتقاماً عقبی کھڑکی میں جا کھڑی ہوتی اور آنسو پونچھ کر مسکرانے کی کوشش کرتی۔

نہ جانے کیوں

نہ جانے کیوں عورتیں ربڑ کی گڑیوں کی طرح کیوں چیں چیں کرتی ہیں اور مرد ٹین کے سپاہی کیوں بن جاتے ہیں۔ کیا سبھی مرد ٹین کے سپاہی بن جاتے ہیں کیا

سبھی عورتیں ربڑ کی گڑیوں کی طرح چیں چیں کرتی ہیں۔ ان کے منہ سے بچوں کی طرح لاڈ بھری توتلی باتیں کیوں نکلتی ہیں۔ ویسے عام بات کریں تو ان کا لہجہ بالکل صاف ہوتا ہے۔ ذرا تو تلاپن نہیں ہوتا آواز میں لوچ نہیں ہوتا۔ ان امور کے علاوہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ علی احمد کس معیار کے مطابق عورتوں کو چنتے تھے۔ مثلاً۔ وہ کور تھی۔ یہ راجو تھی۔ ان میں کوئی کشش بھی تو نہ تھی۔ کوئی بات بھی تو نہ تھی جسے قابل ستائش یا دلکش سمجھا جا سکتا۔ کیا حسن و خوبصورتی کی خصوصیات کے وسیلے کے بغیر عورت بذات خود قابل حصول ہوتی ہے لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔ کچھ عورتوں کو دیکھ کر تو ایلی کو گھن آتی تھی۔

ایلی محسوس کرتا جیسے عورت ایک معمہ ہو ایک ایسا معمہ جو بند کمرے کے بغیر حل نہ ہو سکتا ہو اس خیال پر اسے شدید خواہش محسوس ہوتی کہ ایک بار اسے بھی کسی عورت کے ساتھ کمرے میں بند ہونے کا اتفاق ہو اور اس کے روبرو بھی وہ اسرار کھل جائیں صرف ایک بار۔ ایک بار۔

وہ راجو یہ راجو

ایک روز رات گئے جب ایلی گھر پہنچا تو علی احمد کے کمرے کے قریب پہنچ کر وہ ٹھٹھکا کمرے سے ٹین کے سپاہی کے نعروں اور ربڑ کی گڑیا کی چیں چیں کی بجائے عجیب سی آوازیں آ رہی تھیں کوئی کراہ رہی تھی کوئی مدھم آواز میں ہمدردی جتا رہا تھا۔

ابھی وہ اپنے کمرے میں داخل نہ ہوا تھا کہ دفعتاً علی احمد کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اندر سے ہنستی کھیلتی راجو کی جگہ نحیف و نزار راجو برآمد ہوئی۔ اس نے اپنا ہاتھ علی احمد کے کندھے پر رکھا ہوا تھا اور بصد مشکل سہارا لے کر چل رہی تھی۔

''ایلی'' انہوں نے باہر نکلتے ہی ایلی کو آواز دی۔ ''ادھر آؤ ذرا۔ ہمارے ساتھ چلو۔''

''اس وقت اتنی رات گئے۔'' شمیم زیر لب بولی۔

''ضروری کام ہے ابھی لوٹ آئیں گے۔'' انہوں نے بے رخی سے جواب دیا۔ ''چلو ایلی۔''

''اس بیچارے کو کیوں ساتھ خراب کرتے ہو۔'' شمیم نے کہا۔

''چلو ایلی۔'' علی احمد نے شمیم کی بات نہ سنی قافلہ چل پڑا۔ برقعے میں لپٹی ہوئی راجو علی احمد کے ساتھ گھسٹ کر چل رہی تھی۔ اور علی احمد نے اسے یوں سہارا دے رکھا تھا جیسے وہ بیمار ہو پیچھے پیچھے ایلی سوچتا ہوا چلا جا رہا تھا نہ جانے کیا بات ہے۔ نہ جانے کمرے سے یہ کون سی راجو نکلی ہے۔ راجو ایسی تو نہ تھی۔ وہ تو کتر کتر باتیں کیا کرتی۔ آنکھیں مٹکاتی نخرے کرتی۔ یہ راجو تو روئی روئی سی تھی۔ نہ جانے وہ کدھر جا رہے تھے۔ کیوں جا رہے تھے اور چلتے ہوئے راجو گھسٹ کیوں رہی تھی راجو اپنے گھر پہنچ کر دھڑام سے چارپائی پر گر پڑی اور علی احمد دوڑ کر دوسری چارپائی کے قریب کھڑے ہو کر چلانے لگے۔ ''رحیمن دوڑو دوڑو۔ دیکھو راجو کو کیا ہو گیا ہے۔''

کیا ہے۔ کیا ہے۔ چاروں طرف سے عورتیں راجو کی طرف لپکیں اور یک آن میں بھیڑ لگ گئی۔

صرف وہ بڑھیا دور کھڑی چلاتی رہی۔ ''کیا پاکھنڈ مچا رکھا ہے تم دونوں نے۔ میں مرتا ہوں۔ میں مرتی ہوں اور مرتا کوئی بھی نہیں نخرے دکھانے شروع کر رکھے ہیں۔ میں کہتی ہوں یہ شخص کیوں آتا ہے اس گھر میں اور یہ مرنے جوگی اس سے کیوں ملتی ہے اس سے تو یہی بہتر ہے کہ مر جائے خس کم جہاں پاک۔''

''پاگل ہو گئی ہو ماں'' راجو چلائی۔ ''لڑکی بے ہوش ہے ہاتھ سے جا رہی ہے اور تو کھڑی وعظ کر رہی ہے جیسے مکے سے آئی ہو۔''

''تو مجھے ماں نہ کہا کر ڈائن'' ۔ رحیمن چیخی۔

راجو حیرانی سے کھڑی دیکھ رہی تھی۔ اس کے ٹوٹے ہوئے ہاتھ چھاتی پر پڑے تھے منہ خوف سے اور بھی بدنما ہو گیا تھا۔

راجو کے رخسار پھول رہے تھے جیسے باسی ڈبل روٹی میں ابال آ گیا ہو۔

سیلز مین نے بڑھ کر راجو کو اٹھا کر بٹھا دیا۔ ساجو نے اس کی مدد کی علی احمد نے سرسری طور پر سہارا دیا لیکن بیٹھنے کی بجائے وہ ڈھیر ہو کر گر پڑی۔

یہ دیکھ کر علی احمد گھبرا گئے۔ "کاغذ کہاں ہے دوات دوات۔" وہ چلانے لگے کچھ دیر تلاش کرنے کے بعد انہوں نے کاغذ اور دوات علی احمد کو دے دی۔ علی احمد نے کاغذ پر کچھ لکھا اور چادر میں لپٹا ہوا سیلز مین اسے لے کر بھاگا۔

چھوٹے کمرے میں رحیمن کھڑی چلا رہی تھی قریب ہی ساجو غصے سے گھور رہی تھی۔ باہر دالان کے ایک کونے میں آجو سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس سے پرے ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر ایلی بیٹھا سوچ رہا تھا نہ جانے کیا ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔ راجو کیوں چارپائی پر ڈھیر ہوئی پڑی ہے اس کی ماں بیٹی سے ہمدردی کرنے کی بجائے ان سب کو صلواتیں کیوں سنا رہی ہے اور علی احمد اس قدر گھبرائے کیوں ہیں۔

پھر دروازہ کھلا اور چادر میں لپٹے ہوئے سیلز مین کی آواز سنائی دی "ڈاکٹر صاحب آ گئے۔"

"ڈاکٹر" ایلی! نے دیوار کی طرف منہ پھیر لیا۔ کہیں ڈاکٹر پہچان نہ لے۔ اس مکان میں دیکھ نہ لے لیکن علی احمد علی احمد بھی تو اسی گھر میں تھے اور علی احمد کا کیا ہوگا۔ اگر علی احمد کو ڈاکٹر نے پہچان لیا تو۔

علی احمد کھسیانی ہنسی ہنس رہے تھے "ہی ہی ہی ڈاکٹر صاحب مریضہ بے ہوش ہے آدھ گھنٹے سے یونہی پڑی ہے۔" "اسے اندر لے چلو۔" ڈاکٹر نے کہا۔ اور وہ سب راجو کو اٹھانے کے لیے دوڑے۔

بوکا ریلا

اس دوران میں ساجو آ گئی اور ایلی کے قریب بیٹھ کر پان لگانے لگی اندھیرے میں اس کے سفید دانت چمک رہے تھے۔

"گڈی گڈے کا کھیل بنا رکھا ہے انہوں نے۔" اس نے کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا۔ "بس اپنا ہی ہوش ہے دوسرے جائیں جہنم میں اب تم ہی بتاؤ انہیں ایسا کرنا چاہیے تھا کیا۔" وہ رک گئی۔ پھر آپ ہی آپ بولی۔ "راجو کے خصم کو پتہ چلا تو کیا ہو گا۔ اسی بات کا خیال ہونا چاہیے تھا انہیں دولت پور میں وہ کونسا چوک ہے جہاں ان کی باتیں نہیں ہو رہی ہیں۔ کیوں نہ ہوں۔ ڈھنگ سے باتیں کریں تو ہے۔ نا وہ ایک رات بھی اس کے بغیر نہیں رہتی اور اگر رہ بھی سکے تو یہ بڈھا بچوں کی طرح بلکنے لگتا ہے۔ اور رہی سہی بات اس بڑھیا نے ڈبو رکھی ہے کولھوں پر ہاتھ رکھ کر چیختی ہے جو کسی نے نہیں سنی بات تو یہ اللہ کی بندی اسے سنا کر رہے گی۔ پان کھاؤ گے۔" وہ ایلی کے قریب سرک آئی۔

قریب بہت ہی قریب ساجو کے میلے دانت چمکے بو کا ایک ریلا آیا۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے اسے کسی گندے نالے میں دھکیل دیا گیا ہو۔ جہاں گلے سڑے گوشت کا ڈھیر لگا ہو۔ وہ گھبرا کے اٹھ بیٹھا۔ "پان تو کھا لے" ایک سیاہ بازو اس کی طرف لپکا۔

"نہیں نہیں۔" ایلی نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"کاٹتا ہے کیا" وہ عجیب انداز سے بولی۔ "اچھا بیٹھ تو جا" اور وہ اس سے دور ہٹ کے چارپائی کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔

نیا عقدہ

چھوٹے کمرے کا دروازہ کھلا ڈاکٹر باہر نکلتے ہوئے بولا۔ "اسے اکیلے پڑا رہنے دو۔ شاید ٹھیک ہو جائے۔ کل صبح مجھے اطلاع دینا" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ ایک بار پھر سب نے چھوٹے کمرے کی طرف یورش کر دی اور وہاں لڑنے جھگڑنے لگے نہ

جانے کیا بات تھی جس پر وہ جھگڑ رہے تھے۔ بڑھیا چلا چلا کر رو رہی تھی۔ جیسے غصے سے برا ہوا بلیڈر پھٹ گیا ہو۔ ساجو طعنے دے رہی تھی۔ سیلز مین شاید اپنے ذریعہ تجارت کو تباہ ہوتے دیکھ کر بوکھلا گیا تھا۔ اس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی اور علی احمد اضطراب میں ٹہل رہے تھے جیسے وہ کمرہ ایک صحرا ہو۔ ہاتھ کولھوں پر رکھے ہوئے تھے ٹوپی ماتھے پر اٹی ہوئی تھی۔

آہستہ آہستہ شور کم ہوتا گیا۔ بڑھیا کی ہچکیاں مدھم پڑ گئیں ساجو کے طعنے نفرت بھری نگاہ تک محدود ہو گئے۔ آجو دروازے کے باہر چوکھٹ کے قریب سہمی ہوئی کھڑی تھی اس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔

دیر تک خاموشی طاری رہی۔ رحیمن راجو کی کوٹھڑی میں جا کر لیٹ گئی۔ آجو باہر کھاٹ پر ڈھیر ہو گئی ساجو پاندان سامنے رکھے بکری کی طرح جگالی کرتی رہی علی احمد ویسے ہی گھبراہٹ بھرے انداز میں ٹہلتے رہے پھر راجو کراہنے لگی علی احمد اور ساجو دوڑ کر اندر چلے گئے کچھ دیر کے بعد وہ دونوں باہر نکلے۔ ساجو کولہے مٹکاتی ہوئی باہر نکلی۔ پھولے ہوئے جسم میں سفید سفید دانت اور آنکھیں چمکیں۔ پیچھے پیچھے علی احمد تھے ایلی کو دیکھ کر وہ چونکے۔

"تم۔ تم یہاں تم۔" جیسے وہ ایلی کو ساتھ لانے کی تفصیل بھول چکے ہوں "اچھا اچھا خیر۔" دفعتاً وہ گھبرا کر رک گئے۔ "اب اس وقت تو گھر جانا ٹھیک نہیں۔" انہوں نے ایلی سے کہا۔ "رات بہت گزر چکی ہے۔ یہیں لیٹ کر سو رہو۔ صبح سویرے چلے جائیں گے۔"

زہر

علی احمد کے انداز میں غیر معمولی ملائمت پیدا ہو گئی تھی نہ جانے کیوں؟ "اور دیکھنا" علی احمد اس کے قریب بیٹھ کر رازدارانہ انداز میں کہنے لگے "گھر جا کر یہ نہ کہنا کہ راجو بیمار تھی۔ کہ راجو نے زہر کھا لیا تھا۔"

زہر۔ ایلی سکتے میں رہ گیا۔ کیا واقعی راجو نے زہر کھالیا تھا۔ مگر کیوں کیا سے علی احمد سے محبت تھی؟ کیا راجو بھی محبت کی اہل تھی لیکن۔ وہ سیلز مین اور وہ دس کا نوٹ جو اس روز وہ راجو کے لیے لایا تھا۔ اس کی وہ نگاہیں جو اس نے غلام محمد پر ڈالی تھیں۔ نہیں اسے محبت نہیں ہو سکتی۔ پھر اس نے زہر کیوں کھایا تھا۔ ایلی کے لیے یہ ایک نیا عقدہ تھا۔

''ساجو'' علی احمد نے منت سے کہا۔ ''بھئی ایلی کا کچھ انتظام کر دو۔ دن چڑھنے میں اب دو ایک گھنٹے ہی ہوں گے پڑ رہے گا کہیں۔'' یہ کہہ کر وہ راجو کے کمرے میں داخل ہو گئے اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

محبت۔ نہ جانے محبت کیا ہوتی ہے۔ مگر نہیں محبت تو ایک پاکیزہ جذبہ ہے۔ ایلی سوچنے لگا۔ نہ جانے لوگ عورت کے پیچھے اس قدر اندھے کیوں ہو جاتے ہیں۔ عورت میں وہ کون سی کشش ہے۔ راجو جیسی سیدھی سادھی گنوار لڑکی نے علی احمد کو دیوانہ بنا رکھا ہے۔ ایلی کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ عورت کو قریب سے دیکھے اسے عورت کا قرب حاصل ہو۔ مگر کیسے حاصل ہو۔ کوئی صورت بھی ہو اس نے چوری چوری اپنے گرد نگاہ دوڑائی۔ ایک طرف ٹوٹی ہوئی کھٹولی پر وہ پتلی دبلی لڑکی آجو پڑی تھی جس کی آنکھوں میں زرد زرد میل لگا رہتا تھا اور جس کے ہاتھ ٹوٹے ہوئے تھے۔ اس نے جھرجھری محسوس کی۔ آجو میں کوئی بھی ایسی بات نہ تھی کہ اسے عورت سمجھا جا سکے۔

بدلاؤ

''آؤ ایلی۔'' ساجو چارپائی بچھاتے ہوئے بولی۔ ''یہاں آ جاؤ۔'' ایلی اٹھ کر اس چارپائی پر جا پڑا ایلی نے ساجو کی طرف دیکھا۔ نہیں نہیں وہ عورت نہیں۔ ایلی کے لئے تو عورت ایک لطیف اور پاکیزہ چیز کا نام تھا۔ وہ سوچنے لگا نہیں نہیں یہ عورتیں نہیں یہ تو جونکیں ہیں اور وہ چپ چاپ پڑ گیا۔

ساجو نے ایک عجیب سی دھن گنگنانی شروع کر دی۔ عجیب سی دھن تھی وہ جیسے کوئی کسی ویرانے میں تنہا بیٹھی کس کا انتظار کر رہی ہو۔ اس دھن سے جسم کی بو آتی تھی۔ وہ دھن جو لالٹین جلا کر بیٹھنے والی عورتیں ہی گنگنا سکتی ہیں۔

نفرت سے ایلی نے منہ موڑ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن وہ گنگناہٹ لحظہ بہ لحظہ ننگی ہوتی گئی جیسے کوئی آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے کپڑے اتار رہا ہو۔ پھر چارپائی کھینچنے کی آواز سنائی دی لیکن وہ اپنے خیال میں کھویا ہوا تھا۔ اسے کسی ربڑ کی گڑیا کی چیں چیں سنائی دے رہی تھی۔ اس کی نگاہوں تلے ٹین کا سپاہی ابھر رہا تھا۔ بڑھ رہا تھا۔

"بابو جی۔" کورکی مکروہ آواز سنائی دی۔ سفید دانت اندھیرے میں چمکے وہ سہم گیا۔ لیکن عین اس وقت خانم کے ہاتھ نے بڑھ کر کور کو پرے دھکیل دیا اور پھر وہ حسین بازو ایلی کی طرف بڑھا۔ اس لمس کی وجہ سے اندھیرے میں ایک الاؤ روشن ہو گیا سرخ سرخ چھینٹے اڑے۔ چاروں طرف چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر پہلو بدلا۔ بو کا ریلا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا ساجو کی چارپائی اس کے ساتھ ملی ہوئی تھی اور ایک حریص تھوتھنی اس کی طرف بڑھ رہی تھی گھبرا کر پیچھے ہٹنے کی بجائے اس نے اپنے آپ کو بدرو میں پھینک دیا اور گرم غلیظ جسم کے ایک بھبکے نے اسے آغوش میں لے لیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھے اور اس نائٹ میئر سے اپنے آپ کو محفوظ کر لے لیکن اس کے برعکس نہ جانے کیوں اس دیوانگی کے تحت جو اس پر مسلط ہو چکی تھی اس نے اس غلاظت بھرے جوہڑ میں چھلانگ لگا دی۔ ایک لمس۔ ایک ڈبکی۔ آتش فشاں سے لاوے کا ایک ریلا نکلا جس نے ایلی کو تنکے کی طرح بہا کر نہ جانے کہاں پھینک دیا۔

قریب ہی سے تمسخر بھری مدھم آواز سنائی دی بس۔ اور ایلی نے محسوس کیا جیسے اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا ہو۔ وہ ایک کیڑے کی طرح رینگ رہا تھا۔ رینگ رہا تھا پھر

سیاہ ہمدردانہ اندھیرے نے اپنا دامن پھیلا کر اسے چھپا لیا۔

نائیٹ میئر

"ایلی۔ ایلی۔" آواز سن کر ایلی نے آنکھیں کھول دیں ارے میں کہاں ہوں۔ پھر علی احمد کو دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا۔ اس نے حیرانی سے چاروں طرف دیکھا اور اس غیر مانوس جگہ کو دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ساتھ والی چارپائی پر مبہم سی حرکت ہوئی اس نے ادھر دیکھا سا جو۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ وہ ننگا ہے اور کوئی ڈائن اس کا پیچھا کر رہی ہے اس کا مضحکہ اڑا رہی ہے۔ اور وہ بھاگ رہا ہے۔

سامنے افق پر لمبی مژگاں سے ڈھکی ہوئی دو پرنم آنکھیں تھیں۔ سانوری انگلی سے گرا ہوا آنسو پونچھ رہی تھی۔ نہیں ایلی۔ شریف مسکرا رہا تھا نہیں نہیں۔ محبت کرو چاہے کس سے کرو۔ کوئی بھی ہو لیکن محبت کرو۔ اور ایلی کا جی چاہتا تھا کہ شریف کے گلے سے لگ کر روئے۔

ایلی کے لیے وہ رات بھیانک خواب یا نائٹ میئر کی حیثیت رکھتی تھی جس کی یاد سے وہ لرز جاتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے اس نے بہت بڑا جرم کیا ہو جیسے اس نے ہمیشہ کے لیے اپنے آپ کو قعر ذلت میں دھکیل دیا ہو اور وہ تمسخر اور تحقیر سے بھرا ہوا قہقہہ۔ کیا یہی عورت کا قرب تھا کیا علی احمد کو اسی قرب کا شوق تھا۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا؟ عورت کے قرب کا مطلب غلاظت کے جوہڑ میں ڈبکیاں کھانا نہیں ہو سکتا۔ نہیں نہیں۔

کئی ایک دن وہ اس نائٹ میئر کے تاثرات میں کھویا رہا اس کے دل میں صرف ایک خیال تھا کہ وہ عورت کے قرب کے قابل نہیں اس میں وہ اہلیت ہی نہیں ورنہ وہ تمسخر بھرا قہقہہ جس کی وجہ سے وہ ایک کیڑے کی طرح رینگنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

نہیں نہیں۔ شریف کی آواز سنائی دی۔ یہ نہیں محبت کرو محبت پھر وہ دیوانہ وار ادھر ادھر گھومتا کس سے محبت کروں۔ کیسے محبت کروں اور اس کے دل میں جستجو کی

ایک لہر رواں ہو جاتی۔

وہ بلوریں پاؤں واقعی اس قابل تھے کہ ان سے محبت کی جائے لیکن اسے اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ وہ پاؤں کس کے ہیں۔ وہ کون ہے جو ان پاکیزہ پاؤں کی مالکہ ہے۔ اس نے کئی بار اسے دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر تنگ پاجامہ ایک سیاہ آنکھ اور دو بلوریں پاؤں کے علاوہ اسے کچھ دکھائی نہ دیا تھا۔

ان حالات میں محبت کرنا کیسے ممکن تھا اس بھیانک خواب کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ اس کے دل میں عورت کے قرب کا خوف جاگزیں ہو گیا اور اپنی نا اہلیت کا خیال یقین کی حد تک مستحکم۔

بےزاری

دولت پور میں اب ایلی کی زندگی نے ایک مخصوص رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اس کے صبح و شام ایک مخصوص ڈگر پر چلنے لگے تھے کالج اس کے لیے دلچسپی سے خالی تھا۔ اگرچہ اب وہ کالج جانے سے بالکل نہ گھبراتا۔ لیکن اس کی توجہ تعلیم کی طرف مبذول نہ ہوئی تھی۔ اسے یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ تحصیل علم کرنا اس کے لئے ضروری ہے۔ ایلی کے لئے کالج محض ایک تفریح گاہ تھی۔

کالج سے واپس آتے ہی وہ کتابیں گھر میں پھینک کر اجمل کی طرف چلا جاتا اور وہاں کسی نہ کسی شغل میں مصروف ہو جاتا۔ گھر میں تو کوئی ایسی بات نہ ہوتی تھی جو اس کے لئے جاذب توجہ ہوتی۔

علی احمد حساب کا رجسٹر پر کرنے میں مصروف رہتے یا کسی نہ کسی بات پر شمیم سے جھگڑا شروع کر دیتے۔ شمیم دو ایک منٹ چیختی چلاتی ہاتھ چلاتی اور پھر تھک کر رونا شروع کر دیتی۔ اسے روتا دیکھ کر اس کی دونوں بچیاں چیخنے لگتیں اور گھر میں کہرام مچ جاتا۔

راجو آجاتی تو علی احمد کی حساب کتاب سے دلچسپی ختم ہو جاتی۔ رجسٹر بند کر کے وہ راجو کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ بات بات پر ہنستے چہچہاتے۔ نہ جانے کیوں راجو کے آنے پر وہ بہانے بہانے شمیم کو بلاتے اس سے کچھ پوچھتے یا اس کی تعریف کرتے۔ شاید شمیم کو تنگ کرنے میں مزا آتا ہو یا شاید اس کی وجہ ان کی ازلی تماش بینی ہو۔ راجو کو دیکھ کر غصے کی وجہ سے شمیم کی آنکھوں کا فرق بے حد نمایاں ہو جاتا اور اس کی شکل وصورت بالکل ہی مضحکہ خیز ہو جاتی۔

بالآخر ٹین کا سپاہی قلع بند ہو جاتا اور کشمیر کا سیب انتقاماً ملحقہ کمرے کی عقبی کھڑکی میں لٹک جاتا۔ بند کمرے میں ربڑ کی گڑیا چیختی اور مٹی کا پہلوان گرتا اور پھر ایستادہ ہو جاتا پھر گرتا اور ایستادہ ہو جاتا۔ گڑیا تالیاں پیٹتی قہقہے لگاتی۔ نیچے سڑک سے گزرتے ہوئے لوگ ان بامعنی قہقہوں کو سن کر رک جاتے پھر پنواڑی کی دوکان پر بات چل نکلتی۔

"ہاں میاں روج آوے ہے اس چوبارے والے بابو کے پاس۔"

"ٹھیک کہے ہے یہ میں آپ دیکھے ہوں روج یہاں سے گجرتے دے۔ یہاں آکر آنکھیں جھکالے ہے میں نے کبھی نہیں جتایا۔"

"کیا کہا یہاں اس چوبارے ماں۔ ارے نہیں بھائی عقل کی بات کرو۔"

"ارے ماں کھوب جانوں یہ چوبارے والا بابو بڑا گھاگ ہے یہ بابو۔ چار روج ماں نچوڑ لیا اس نے اب وہ چلا وا پٹاخہ ہے۔ چلاوا۔"

شام پڑتی تو راجو رخصت ہو جاتی اور علی احمد پھر سے رجسٹر کھول کر مصروف ہو جاتے۔ پھر جب رات کے آٹھ بجتے تو وہ آپ ہی آپ گنگنانے لگتے۔ "اوہ مجھے تو آج انسپکٹر صاحب نے بلایا تھا۔ یاد ہی نہ رہا۔ حافظہ کس قدر کمزور ہو گیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ باہر جانے کے لئے کپڑے پہننے لگتے۔

چار ایک منٹ بل کھانے کے بعد شمیم گویا اپنے آپ سے کہتی۔ "جیسے میں جانتی

ہی نہیں ان کے انسپکٹر صاحب کو۔"

علی احمد ہنس پڑتے "تو تو بالکل پگلی ہے راجو کی طرف جانا ہوتا تو چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"تو بہ اتنا نڈر بھی نہ ہو کوئی چوری اور پھر سینہ زوری شرم نہیں آتی۔" شمیم جواب دیتی۔

"بے وقوف شرم تو عورتوں کے لیے ہے۔" وہ ہنسنے لگتے۔ "مردوں کے لیے نہیں۔"

اس پر شمیم خاموش ہو جاتی اور چھوٹے کمرے سے سسکیوں کی آواز آنے لگتی۔

"بس میں ابھی آیا۔" کہہ کر علی احمد باہر نکل جاتے اور پھر آدھی رات تک راجو کے یہاں پڑے رہتے۔ ان کی واپسی پر گھر ہی دو گھڑی تو میاں بیوی کی لڑائی ہوتی۔ شمیم بات بڑھانے کی کوشش کرتی لیکن علی احمد اسے چٹکیوں میں اڑا کے لیٹ جاتے۔

"ٹھیک ہے" وہ کہتے "تو لڑنا چاہتی ہے تو میں ضرور تیری خواہش پوری کروں گا لیکن حقے کی چلم بے بغیر لڑنا۔ نہ بھئی یہ مشکل ہے تو ذرا چلم بھر دے پھر لڑیں گے کیوں نہیں لڑیں گے تو چاہے اور ہم نہ لڑیں۔ بھئی واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" اس پر شمیم روتے ہوئے چلم بھرنے لگتی اور علی احمد کپڑے بدلتے ہوئے گنگنانے لگتے۔

گزشتہ خفت

جب بھی علی احمد باہر جانے لگتے تو ایلی گھبرا جاتا کہ کہیں علی احمد کو اسے ساتھ لے جانے کا خیال نہ آ جائے۔ ان کے ساتھ باہر جانے سے وہ ڈرتا تھا۔ اس مکان سے ڈرتا تھا جہاں اس نے وہ رات بسر کی تھی۔ اس سیاہ فام عورت سے ڈرتا تھا جس کا تحقیر بھرا قہقہہ اب تک اس کے کانوں میں گونجتا تھا۔ وہ اس قرب سے ڈرتا تھا جس کا وہ ایک بار رسزا وار ہو چکا تھا۔

علی احمد باہر جانے لگتے تو وہ گھبرا جاتا۔ راجو ان کے گھر آتی تو وہ چپ چاپ

دبے پاؤں باہر نکل جاتا۔ راجو کی زیرلب مسکراہٹ سے اسے ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ ایلی کی گزشتہ خفت سے کما حقہ واقف ہو جیسے وہ جانتی ہو جانے بغیر سمجھتی ہو جیسے ساجو نے اسے اس تمسخر بھرے قہقہے سمیت ساری بات بتا دی ہو۔ اس کی مسکراہٹ ایلی کے سینے میں دھار بن کر اتر جاتی اور وہ محسوس کرتا جیسے وہ کہہ رہی ہو۔

''اچھا تو جناب بھی اس میدان میں قدم رکھتے ہیں۔ واہ واہ بڑی خوشی ہوئی یہ جان کر۔'' اس پر وہ گزشتہ خفت از سر نو اس پر طاری ہو جاتی۔

کبھی تو راجو کو دیکھ کر ایلی کے دل میں ایک عجیب سی وحشت بیدار ہو جاتی اور اس کا دل چاہتا کہ بڑھ کر اس کی قمیض تار تار کر دے اور پھر چلا چلا کر کہے ''میں تمہیں جانتا ہوں تم جونک ہو جونک۔'' پھر وہ لاحول پڑھ کر اپنے آپ کو محفوظ کرنے کی کوشش میں کھو جاتا اور بالآخر چپکے سے گھر سے باہر نکل جاتا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اسے شریف کی ہنسی کی آواز سنائی دیتی۔ ''نہیں نہیں ایلی محبت کرو محبت۔''

تین راہگیر

ایک روز راجو کے آنے پر جب وہ دبے پاؤں سیڑھیاں اتر رہا تھا تو علی احمد نے آواز دی ''ایلی۔ جانا نہیں۔''

وہ رک گیا اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ''نہیں نہیں میں نہیں جاؤں گا۔ میں ابا کے پاس نہیں جاؤں گا۔''

''ایلی ادھر آؤ۔'' علی احمد نے پھر آواز دی۔

راجو اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی ''اب تو نظر ہی نہیں آتا ایلی۔'' اس نے لاڈ بھرے انداز سے کہا ''جی نہیں چاہتا تیرا ملنے کو۔'' ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ بات طنزاً کہی گئی ہو۔

''ایلی ذرا ہمارے ساتھ چلنا ہے تمہیں۔ ابھی چلتے ہیں ذرا ٹھہرو'' علی احمد بولے۔

''میں نہیں جاؤں گا۔'' ایلی نے باآواز بلند کہنے کی ناکام کوشش کی۔ اور پھر اپنی بے بسی پر بل کھا کر خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر کے بعد علی احمد تیار ہو گئے ''چلو ایلی'' وہ بولے اور پھر علی احمد، راجو اور ایلی سیڑھیاں اترنے لگے۔

علی احمد اور راجو کے ساتھ دولت پور کے بازاروں سے گزرنا ایلی کے لیے بہت بڑی مشکل تھی۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ پنواڑیوں کی دوکانوں پر کھڑے لوگ ان کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتے تھے۔ ان کے متعلق زیر لب باتیں کرتے تھے۔ اس وقت ایلی کی حیثیت سیلز مین کی سی ہو جاتی تھی۔ اسے یہ بات بے حد ناگوار گزرتی لیکن وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔

وہ تینوں راہ گیر عجیب انداز سے چلے جا رہے تھے۔

علی احمد کو تو لوگوں کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہوتا تھا راہ چلتے ہوئے انہوں نے کبھی راہگیروں یا پنواڑیوں کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ انہیں ادھر دیکھنے کی فرصت ہی نہ ہوتی تھی وہ تو گردن اٹھا کر چلنے کے عادی تھے اور ان کی گردن کا زاویہ ایسا ہوتا تھا کہ سڑک نگاہ سے اوجھل رہتی بلکہ مکانات کی نچلی منزل کی طرف دیکھنا ان کے لیے ممکن نہ رہتا اور دو رویہ بنے ہوئے چوباروں یا کوٹھوں کی منڈیروں کی طرف دیکھتے ہوئے وہ آگے بڑھے جاتے۔ ان کے عقب میں راجو برقعہ پہنے ہوئے گرگابی بجاتی ہوئی یوں چلتی جیسے وہ دولت پور کی راجو نہیں بلکہ کوئی اور ہی ہو جیسے اسے کوئی جانتا ہی نہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی اس کا سینہ تن جاتا قدموں میں شوخی لہراتی اور جالی کے پیچھے سے آنکھ لپکتی جیسے اس کا جی چاہتا ہو کہ ان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے والے لوگوں سے کہے۔ ''میں ہی ہوں دولت پور کی پٹاخہ میں ہی ہوں کیا سمجھا ہے تم نے جہاں میرا جی چاہے جاؤں گی جس کے ساتھ جی چاہے رہوں گی کر لو میرا جو کرنا ہے۔'' اور دور پیچھے ایلی یوں چلا آتا جیسے بازار سے کوئی سودا

خریدنے کے لیے جا رہا ہو اور اسے اس میلے بر قعے میں ملبوس ٹھک ٹھک کرتی ہوئی عورت اور رچو بارہ نگاہوں والے مرد سے کوئی تعلق نہ ہو۔

اس روز ان کے پیچھے چلتے ہوئے وہ دعائیں مانگ رہا تھا یا اللہ کہیں وہ اس گھر میں نہ جا رہے ہوں جہاں میلے پنڈے کی بو کے ریلے آتے ہیں اور وہ سیاہ گوشت میں میلے دانت۔ وہ اس کے روبرو کیسے جائے گا نہیں نہیں۔

موڑ پر جا کر علی احمد رک گئے۔ ''اچھا راجو تو چل گھر۔ لیکن جلد اس جگہ پہنچ جائیو۔ سمجھی ہم انتظار کریں گے۔''

اچھا کہہ کر راجو چلی گئی اور علی احمد اور ایلی مڑ کر دوسری سڑک کو ہو لیے۔ کئی ایک راستوں سے ہوتے ہوئے بالآخر وہ ٹاؤن ہال میں داخل ہوئے جہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔

بے بی شو

''آؤ ایلی آؤ۔ یہاں آج بے بی شو ہے۔'' علی احمد نے ایلی کی طرف دیکھا۔

''ارے بے بی شو نہیں جانتے اور کہنے کو کالج میں پڑھتے ہو۔'' وہ ہنسنے لگے ''واہ یہ بھی لاجواب بات ہے۔ دیکھو بے بی کا مطلب ہے بچہ۔ یعنی دودھ پیتا بچہ یعنی وہ بچہ جو ماں کا دودھ پیتا ہے آج یہاں ان بچوں کا شو ہو گا میونسپل ہال میں جو بچہ سب سے زیادہ تندرست ہو گا اسے انعام ملے گا۔ یعنی یعنی۔'' وہ ادھر ادھر تاکتے ہوئے کہنے لگے۔ ''یہ بچوں کی نمائش ہے سمجھے اور سرکار یہ نمائشیں اس لیے مروج کر رہی ہے تاکہ لوگوں کی توجہ بچوں کی صحت کی طرف مبذول ہو۔ ہی ہی ہی۔'' وہ نہ جانے کس کی طرف دیکھ کر ہنسے۔ اور پھر اپنا لیکچر شروع کر دیا۔

''ہاں تو کیا کہہ رہا تھا میں۔ ہاں بے بی شو۔ شو کا مطلب ہے۔ مظاہرہ مطلب دکھانا۔ سی یعنی ایس ڈبل او۔ مطلب دیکھنا اور سی سے شو۔ یہ ناؤن ہے۔ سمجھے۔'' پھر خاموش ہو گئے۔

"ہاں تو کیا کہہ رہا تھا میں۔" وہ پھر کسی طرف دیکھنے لگے۔

حفظان صحت اور زچہ و بچہ کا لیکچر تو محض جملہ معترضہ تھا۔ مطلب تو یہ تھا کہ اس احاطے میں کھڑے ہو کر باتیں کرنے کے بہانے ارد گرد کے مجمع میں کسی کو تاکا جائے۔ ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے بچوں کے بہانے وہ عورتوں کی نمائش ہو اور پھر دولت پور کی عورتیں بھی تو ایسی اچھی نہ تھیں ان میں وہ امرتسر اور لاہور والی بات ہی نہ تھی۔ سیاہ رنگ کی دبلی پتلی عورتیں جن کے بانس نما ٹانگوں پر میلے تنگ پاجاموں کے غلاف چڑھے تھے اور جن کی گودیوں میں انسانی ڈھانچے لٹک رہے تھے۔

ہر جملے کے بعد علی احمد چاروں طرف دیکھتے اور ہر برقعہ پوش کو نگاہوں سے ٹٹولتے جیسے اسے تول رہے ہوں اور پھر ہنسنے لگتے۔

"ہی ہی ہی۔ تم انفینٹ مارٹیلٹی کو بھی نہیں جانتے تمہیں کالج میں پڑھاتے کیا ہیں وہ۔ دیکھو ہم تمہیں سمجھاتے ہیں۔" ..... "آیئے خان صاحب آیئے۔ کہیے مزاج کیسے ہیں" وہ ایک اجنبی سے کہنے لگے۔ "ہاں ہاں میں ایلی کو سمجھا رہا تھا کہ انفینٹ مارٹیلٹی کسے کہتے ہیں بچے کو باتیں سمجھانے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اسے ایسے تہوار دکھائے جائیں۔ ہی ہی ہی۔ اور خان صاحب کے جانے کے بعد وہ مسکراتے ہوئے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ ہاں تو کیا کہہ رہا تھا۔ میں یعنی مطلب ہے۔"

ایلی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مطلب کیا ہے اور وہ چاہتا تھا کہ چلا چلا کر لوگوں پر واضح کر دے کہ مطلب کیا ہے بلکہ خود انہیں بتا دے کہ وہ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ مطلب کیا ہے۔

سفید دھبہ، بھوری لٹ

"ہائیں تم ہو تسلیم۔ تم۔" علی احمد ایک اجلے برقعے کی طرف بڑھے تم یہاں۔"

برقعہ پوش گھبرا کر رک گئی۔ "تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ ہی ہی ہی۔" وہ ہنسنے لگے۔

"بھئی میں علی احمد ہوں۔ علی احمد اپنے آغا صاحب اور میں دونوں ایک ہی دفتر میں تو تھے۔ آج کل کہاں ہیں آغا صاحب۔"

"امرتسر گئے ہوئے ہیں۔" ایک باریک سی سہمی سہمی آواز سنائی دی۔ "ہاں ہاں امرتسر ہی گئے ہوں گے انہوں نے خود مجھ سے کہا تھا ہی ہی۔"

"پرانے دفتر سے چھٹی لی ہے کیا۔"

"استعفیٰ دے دیا ہے۔"

"ہی ہی۔" وہ ہنسے۔ "ہاں ہاں استعفیٰ دینے ہی کو تو کہتے تھے۔"

"اور۔ اور تم یہیں ہو ابھی۔"

"ہم بھی جا رہے ہیں۔" وہ بولی۔

"اوہ تو تم بھی جا رہی ہو۔ اس سلسلے میں میری مدد کی ضرورت ہو تو بلا روک ٹوک کہہ دو۔ آغا صاحب اور مجھ میں کوئی فرق نہیں ہمارے پرانے دوست ہیں اور پھر خاندانی تعلقات ہیں ہی ہی ہی۔"

جھوٹ جھوٹ۔ ایلی کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی مکڑا اپنے پنجے پھیلا رہا ہو ہی ہی کے تار سے جال بن رہا ہو اور مکھی قریب ہوئی جا رہی ہو اور قریب ۔۔۔

ایلی کو اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ علی احمد چھوٹی سی لڑکی سے بھی ہی ہی کیے بغیر نہ رہتے۔ کتنی چھوٹی عمر تھی اس کی جب کہ وہاں علی احمد کے برابر کی عورتیں موجود تھیں۔ پھر......

شاید وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ لڑکی کسی نوجوان کی توجہ کے لائق تھی۔ پھر دفعتاً اسے سارہ اور صبورہ یاد آ گئیں اور اسے علی احمد کی آواز سنائی دی۔ سارہ سو گئی کیا۔ ہی ہی۔ "شرماؤ نہیں تسلیم" علی احمد اسے بھر مار رہے تھے۔ "ہاں ہاں برقعہ اٹھا لو کیا حرج ہے۔ ڈرو نہیں۔ ہم جو تمہارے ساتھ ہیں۔"

دفعتاً سفید رنگ کا ایک دھبہ ایلی کی آنکھوں تلے ابھرا اور گھنگھریالے بالوں کی ایک لٹ لہرائی اور اس نے گھبرا کر نگاہیں نیچی کر لیں۔

علی احمد کو تسلیم کی کلائی پر گھڑی باندھتے ہوئے دیکھ کر نہ جانے کیوں اسے شدید صدمہ محسوس ہوا جیسے کوئی اس کا دل مسل رہا ہو۔ ایلی کی نگاہوں میں وہ نمائش دھندلی پڑ گئی۔ بے بس غصے سے اس نے علی احمد کی طرف دیکھا اور پھر مٹھیاں بھینچ کر چل پڑا جیسے اس کے دل میں ایک عزم قائم ہو چکا ہو۔ جیسے اس نے ایک فیصلہ کر لیا ہو۔

''نہیں نہیں میں اسے سارہ نہیں بننے دوں گا۔ اس کی زندگی تباہ نہیں ہو گی۔ اسے اپنی عمر راہب خانے میں بسر نہیں کرنی پڑے گی نہیں نہیں'' وہ چلا رہا تھا۔ اس کے گرد لوگ شور مچا رہے تھے۔ تانگے والے چلا رہے تھے۔ عورتیں سینے سے بچے چمٹائے بھاگی جا رہی تھیں لیکن اس کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا۔ ایک ارادہ تھا۔ سامنے شریف مسکرا رہا تھا ہاں۔ ایلی ہاں۔ محبت کرو۔ چاہے کسی سے کرو لیکن محبت کرو۔

اچھا تو

گھر پہنچ کر وہ دھڑام سے چارپائی پر گر پڑا غصے اور بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان آنسوؤں کے دھندلکے میں شریف تحسین بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ''محبت کے بغیر تم کچھ بھی نہیں ایلی۔ کچھ بھی نہیں۔''

اجمل دفتر سے آیا تو ایلی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ''ایلی تم رو رہے ہو۔ علی احمد سے لڑائی ہو گئی کیا۔''

''نہیں تو'' وہ بولا۔

''تو کیا شمیم نے کچھ کہا ہے۔''

''نہیں تو'' ایلی کی ہچکی نکل گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔ اس کی ہچکیاں کیوں نکل رہی ہیں۔ اس کی کوئی وجہ بھی تو نہ تھی، مگر اس کے باوجود وہ

چاہتا تھا کہ کسی کے کندھے پر سر رکھ کر رو دے اس کا دل چاہتا تھا کہ رازدارانہ انداز میں اجمل کو ایک طرف لے جائے اور اس سے کہے ''مجھے محبت ہو گئی ہے۔ اب میں کیا کروں۔''

ایلی بار بار کوشش کرتا کہ اپنی محبوبہ کے تصور میں کھو جائے لیکن ایک سفید سا دھبہ اور بھورے بالوں کی گھنگھریالی لٹ کے سوا کوئی اور تفصیل اس کے تصور میں نہ آتی بلکہ یہ تفاصیل بھی دھندلی پڑتی جا رہی تھیں۔ کتنا پیارا نام تھا اس کا تسلیم۔ اور آواز۔ کتنی میٹھی کتنی رسیلی۔

ایلی کی باتیں سن کر اجمل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''ہوں'' اس نے ایک آہ بھر کر کہا۔ ''اچھا تو ایلی کو محبت ہو گئی ہے۔'' اتنا کہنے کے بعد وہ کسی خیال میں کھو گیا اور اس کی آنکھوں تلے نجو کا بلوریں جسم منور ہو گیا نجو الھڑ رقاصہ جو اس کے باپ کے داشتہ جانکی کی عزیزہ تھی اور جسے اس نے کئی ایک سال آنکھوں کا تارا بنائے رکھا تھا۔ وہ نجو جس کو بھلانے کے لیے اس نے بصرے کی خاک چھانی تھی اور کابل کی پہاڑیوں میں پناہ لی تھی اور جسے بھولنے کی شدید کوشش میں وہ اب تک ملحقہ چوباروں میں نہ جانے کس کی تلاش کیا کرتا تھا۔

کچھ نہیں سے..... بہت کچھ

اس حادثے کے بعد ایلی کا دولت پور میں رہنا قطعی طور پر ناممکن ہو گیا اس نے وہ آخری مہینہ بڑی مشکل سے گزارا۔ اب اس کی نگاہ میں علی احمد کی حیثیت ایک راکھشش کی رہ گئی تھی جس کا کام صرف یہ تھا کہ سیتاؤں کو اپنی لنکا کی بھینٹ چڑھاوے اور راجو ساجو تو غلیظ ڈھیروں کے سوا کچھ نہ تھیں۔ ان سے بات کرتے ہوئے ایلی کو گھن آنے لگی تھی۔

البتہ اب جب شمیم عقبی کھڑکی کا سہارا لیتی تو ایلی کو غصہ نہ آتا بلکہ اس کے دل میں ہمدردی کی ایک لہر دوڑ جاتی بیچاری جو اس خوفناک لنکا میں بیکار بے مصرف مقید

تھی۔ جو جھوٹے سہاروں پر اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی تھی جس کے لیے زندگی صبح وشام کے تواتر کے سوا کچھ نہ تھی۔

ایک ماہ کے لیے کالج میں امتحان کی تیاری کے لیے چھٹیاں ہو چکی تھیں ایلی کتابیں لے کر اجمل کے پلنگ پر پڑ جاتا۔ ایک گھنگھریالی لٹ اس کی آنکھوں تلے لٹکتی۔ ایک سفید سا دھبہ چاند کی طرح چمکتا اور وہ چھت کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بیٹھ جاتا اور نگاہوں کو مست بنانے کی شدید کوشش کرتا چھت سے شریف کی متبسم آواز آتی۔ ''تم محبت کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو ایلی۔ کچھ بھی نہیں۔'' اور وہ محسوس کرتا کہ وہ بہت کچھ ہے بہت کچھ۔ پھر اسے امتحان دینے کے لئے اجلا ریاست میں جانا پڑا۔

ریاست اجلا

اجلا ایک ویران شہر تھا۔ جس میں یہاں وہاں آبادی کے ٹکڑے تھے۔ اور کہیں کہیں خوبصورت محل اور باغات تھے۔ اجلے کا بڑا بازار کا ایک وسیع اور غلیظ کوچہ تھا جس میں سیاہ فام چست و چالاک قسم کے لوگ ادھر ادھر گھومتے پھرتے تھے۔ جن کی زبان کچر کچر چلتی اور جن کی آواز میں نہ تو دلی کی سی رنگینی تھی اور نہ لاہور کی سی مٹھاس۔ باتوں میں عجیب سی کرختگی تھی۔ انداز میں عمومیت سی تھی جس کی باتیں گویا ننگی تھیں۔ بھونڈی اور ننگی۔

اس بازار کے ادھر ادھر پرانی وضع کی بڑی بڑی عمارتیں تھی۔ جن پر ویرانی اور اداسی چھائی رہتی تھی اور جن کی اندھیری لمبی ڈیوڑھیوں میں اونچے لمبے سپاہی بندوقیں اٹھائے پہرہ دیا کرتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ ان پرانے محلوں میں مہاراج کی وہ رانیاں مقیم تھیں جو مہاراجہ کا چاؤ ختم ہو جانے پر ان محلات میں منتقل کر دی گئی تھیں اور زندگی کے باقی دن نوکروں اور اہل کاروں کی نگاہ التفات کے سہارے بسر کر رہی تھیں۔

ایلی محلات کے نوکروں کو مسرت کی نظر سے دیکھتا۔ دفعتاً اسے مہاراج پر غصہ

آنے لگتا پھر علی احمد کی آواز سنائی دیتی۔ ''شرمانے کی کیا بات ہے تسلیم۔ ہم کوئی بیگانے تو نہیں۔'' ایلی کی نگاہوں تلے ایک سفید دھبہ جھلملاتا ایک بھوری لٹ لہراتی اور وہ آہ بھر کر آسمان کی طرف دیکھنے لگتا اور محسوس کرتا جیسے وہ بھی کچھ ہو۔

مہاراج

مہاراج کا موتی محل دیکھ کر ایلی سہم گیا۔ کتنے حسین کمرے تھے۔ کتنا خوبصورت سازوسامان تھا ایلی کے لیے اتنی خوبصورتی اور فراوانی قابل حصول نہ تھی۔ زیادہ عالی شان چیزوں کو دیکھ کر اس کے دل میں ڈر سا پیدا ہو جاتا تھا ایک بوجھ سا پڑ جاتا تھا۔

شاہی حمام کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا۔ یہاں رانیاں اور مہاراج نہاتے تھے تالاب میں خوشبو دار پانی بھر دیا جاتا تھا۔ پھر غلام گردش پر وہ ایک دوسرے کو پکڑتے تھے۔

پھر جب اسے معلوم ہوا کہ سیڑھیاں چڑھتے وقت مہاراج سہارا لیتے ہیں تو اس کے دل میں مہاراجوں کے خلاف بغض پیدا ہو گیا اور اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ دنیا غریبوں کی شرافت اور محبت کی وجہ سے قائم تھی۔

واپسی پر سندر محل کے دروازے کے قریب وہ رک گئے ان کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ دروازے پر سنتری سے بات کریں۔

ظالم یا مظلوم

''کیوں بھئی یہاں کیوں کھڑے ہو۔'' سنتری نے للکارا۔

''جی جی۔'' ایلی بولا۔ ''یہ محل دیکھنا چاہتے ہیں ہم۔''

''یہ محل نہیں دیکھا جا سکتا۔'' وہ بولا۔ ''مہاراج آ رہے ہیں یہاں۔ اب بھاگ لو یہاں سے۔''

مجید جو ان سب میں شوخ طبیعت کا لڑکا تھا چلا کر کہنے لگا۔ ''وہ جو بوڑھا اور نوجوان لڑکی وہاں بٹھا رکھے ہیں۔''

تو اس نے اندر باغیچے کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ کیوں بیٹھے ہیں جی۔''

باغیچہ کے اندر ایک کونے میں ایک بوڑھا اور اس کی نوجوان بیٹی چپ چاپ گھاس پر بیٹھے تھے۔

سنتری مسکرایا "تم کون ہو بھئی۔" وہ بولا "ہندو ہو یا مسلمان" "الحمد اللہ" مجید نے شوخی سے کہا۔

سنتری قریب آ گیا "تم نہیں جان سکتے یہ بات۔" اس نے مسکرا کر رازدارانہ انداز سے کہا۔ "یہ کام نہ تم کر سکتے ہو نہ جان سکتے ہو۔ یہ بڈھا بڑی امید لے کر مہاراج کے دربار میں آیا ہے۔"

"تو کیا یہ جو اس کے ساتھ لمڈیا ہے اس کی امیدیں ہیں۔" الطاف نے اس گوری نوجوان لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا جس کی نگاہ خمار آلود تھی۔

"ہاں۔" سپاہی ہنسا "اس لڑکی کو اس نے ۱۲ سال تک گائے کا دودھ پلا پلا کر جوان دیا ہے۔ کہتا ہے میں نے لڑکی کے پنڈے پر حلوہ باندھ باندھ کر اسے پالا ہے اس امید پر کہ مہاراج یہ نذرانہ منظور کر لیں۔"

"اوہ۔" مجید ہنسا "تو نذر نیاز کا معاملہ ہے۔" ایلی نے غور سے اس لڑکی کی طرف دیکھا جو نوعمر ہونے کے باوجود جوانی سے بھرپور تھی۔ ایلی سوچنے لگا کیا ہر مرد ایسا ہی ہوتا ہے۔ کیا عورت کے معاملہ میں ہر مرد ہی مہاراج ہوتا ہے۔ وہ۔ وہ کور تھی۔ وہ بھی تو بھائی کو ملازمت دلوانے کے لیے آئی تھی اور پھر وہ خانم تھی جسے وہ باداموں کی گٹھڑیاں دینے جایا کرتا تھا اور رہا آخر راجو۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ مہاراج ظالم تھا یا وہ بوڑھا باپ۔

ویرانہ

امتحان سے فارغ ہو کر وہ پھر علی پور آ گیا اس کا خیال تھا کہ علی پور وہی علی پور ہو گا جہاں سے وہ چند ماہ پہلے گیا تھا جہاں بندرابن کی رنگینی چھائی رہتی۔ کرشن کنہیا بانسری بجاتے اور سانوری کوٹھے پر ٹہلتی تھی جہاں کپ چھلکتے تھے کیپ بڑے

طمطراق سے اپنی نمائش کرتی تھی اور کچی حویلی کی کبڑی لالٹین کے نیچے علی پور کا جادوگر اپنا سامان لے کر ہنکر اینڈی کا اسم اعظم پڑھتا تھا مگر اب کی دفعہ وہ علی پور پہنچا تو وہ ایک ویرانہ تھا۔لق و دق ویرانہ۔

رنگ محل کی عمارت ویران پڑی تھی شریف اور بیگم اپنے کنبے سمیت واپس نور پور جا چکے تھے رنگ محل کے جنوبی حصے میں صرف رابعہ اور اس کا ننھا بیٹا ساحر مقیم تھے۔ مغربی حصے میں فرحت اور باجرہ رہتی تھیں شمال میں اس کے ماموں حشمت علی اور ان کا بڑا بیٹا صفدر رہتے تھے۔حشمت علی پانچ وقت کی نماز پڑھنے اور قرآن کریم کی تلاوت کرنے میں مشغول رہتے تھے ان کا بیٹا پرانی یادوں کو بار بار دل میں دہرانے اور ''حافظ خدا تمہارا'' کی دھن الاپنے میں مصروف رہتا اور کبھی کبھی اپنے نانا سے روپے ہتھیا کر چوری چوری شراب پینے کے شغل میں وقت بسر کرتا تھا۔

پرویز

رابعہ۔سیدہ اور انوراجمل کی بہنیں تھیں۔رابعہ کی شادی نوعمری میں اس کے خالہ زاد بھائی پرویز سے ہو چکی تھی جو میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد فوج میں بھرتی ہو گیا تھا اور جس نے دوران تعلیم ہی میں حلقہ اسلام کو چھوڑ کر عیسائیت اختیار کر لی تھی۔کہا جاتا تھا کہ مذہب کی اس تبدیلی کا سبب کسی نوجوان لڑکی کا حسن و جمال تھا لیکن اس کے متعلق وضاحت سے کوئی بھی نہ جانتا تھا۔کیونکہ پرویز کی زندگی ایک پر اسرار معمہ بن کر رہ گئی تھی۔وہ ماں باپ کا بے حد لاڈلا تھا اسی وجہ سے باپ نے اسے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی حالانکہ وہ صاحب حیثیت شخص نہ تھے۔پھر بھی انہوں نے بیٹے کی ہر بات پوری کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ پرویز متوسط درجے کے والدین کا بیٹا ہونے کے باوجود فیشن ایبل حلقوں میں رہنے کا عادی ہو گیا اور ہمیشہ کے لیے اپنے عزیزوں کی سی عامیانہ زندگی بسر کرنے سے نجات حاصل کرنے کی غرض سے اس نے عیسائیت اختیار کر لی تھی۔

پرویز کی تبدیلی مذہب گھر والوں کے لیے ایک گہرا صدمہ تھی اس کی والدہ نے اس خبر کو سنا اور یوں خاموش ہو گئی جیسے کسی اتھاہ سمندر میں ڈوب گئی ہو۔ والد نے سنا تو وہ اضطراب سے ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔ نہیں نہیں۔ "وہ چلائے۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔ نہیں پرویز ایسا نہیں۔" اور پھر جب انہیں یقین ہو گیا کہ خبر درست ہے تو انہوں نے پہلو بدلا۔ "عیسائی ہو گیا تو کیا ہوا۔" انہوں نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" مگر ان کے انداز سے واضح تھا کہ فرق پڑتا ہے۔ ایسا فرق جو ان کے لیے قابل برداشت نہیں۔

پرویز کے متعلق یہ خبر اس کی بیوی رابعہ نے سنی تو اس نے لپک کر ننھے ساحر کو اپنی گود میں اٹھا لیا اور حیرانی سے چاروں طرف دیکھنے لگی جیسے کھو گئی ہو۔ رابعہ نوجوان تھی حسین تھی اور زندگی کی راہ میں ابھی نو آموز تھی۔

رابعہ کو دیکھ کر ایلی کو پرویز پر غصہ آنا شروع ہو جاتا اور وہ سوچنے لگتا کہ ضرور پرویز کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہو گا جیسا سارہ کے ساتھ آیا تھا ورنہ عیسائیت کا سہارا کیوں لیتا۔

کیا ہے تجھے

سارہ کا خیال آتے ہی اسے علی احمد یاد آ جاتے اور پھر بے بی شو کا وہ میدان دکھائی دیتا اور ایک اجلے برقعہ والی لڑکی اس کے روبرو آ کھڑی ہوتی۔ ایک سفید دھبہ ایک گھنگھریالی لٹ۔ پھر وہ چپ چاپ گھر جا کر بیٹھ جاتا اور دادی اماں پوچھتی ایلی کیا ہے تجھے کیا ہو گیا ہے۔ کیا بات ہے۔ ایلی۔ ایلی کو خود بھی معلوم نہ تھا کہ اسے کیا ہو گیا تھا۔

محلے کا احاطہ ویران پڑا تھا اس لئے کہ ارجمند نہ جانے کہاں کس نوکری پر چلا گیا تھا اور انکر انڈی کا کھیل ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی ایلی گھبرا کے ارجمند کے گھر چلا جاتا جہاں تخت پر ارجمند کی بانسری پڑی دیکھ کر اس کا دل بھر آتا۔ یا کسی

وقت جب وہ نگاہ بچا کر مقابل کے مکان کی طرف دیکھتا اور وہاں ہکوری ڈکوری کا کوئی ایڈیشن نظر آتا تو دل پر ٹھیس لگتی۔ پھر وہ کچی حویلی کی کبڑی خمیدہ لالٹین تلے چلا جاتا لیکن وہاں کھڑے ہونا تو بالکل بیکار تھا۔ اگرچہ کیپ فوراً کھڑکی میں آ کھڑی ہوتی اور مسکرا مسکرا کر کسی نہ کسی سے باآواز بلند باتیں کرنے لگتی لیکن ایلی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے کس طرح ہاتھ ہلائے، رومال لہرائے۔ وہاں بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑے رہنا بھی تو بے معنی بات تھی اور پھر لوگ۔ پھر وہ رضا کی دوکان پر جا بیٹھتا اور رضا اسے دلچسپ باتیں سناتا اور ہر آتے جاتے کو چھیڑتا اور بالآخر ایلی پر فقرے کسنے شروع کر دیتا۔ ''ہوں تو ایلی بابو کو محبت ہو گئی ہے۔ بڑا خطرناک مرض ہے یہ۔ اللہ ہی بچانے والا ہے ورنہ ایسے مریض بچتے نہیں۔'' اور ایلی کو اس کی باتوں کے علاوہ اپنی حماقت پر غصہ آتا کہ اس نے اپنی محبت کی بات رضا کو کیوں بتا دی تھی مگر رضا کو بتائے بغیر چارہ بھی تو نہ تھا علی پور میں اور کون تھا جس سے وہ راز دل کہہ سکتا تھا۔ صرف ایک رضا تھا نا۔ رفیق بھی تو نوکری کے سلسلے میں کہیں جا چکا تھا۔

حمیدہ رشیدہ

محلے میں اس کے لیے دلچسپی کی کوئی صورت نہ تھی گھر میں بوڑھی دادی کے سوا کوئی نہ تھا۔ سیدہ تو بالکل ہی خاموش رہا کرتی تھی۔ وہ ہر وقت دادی اماں کے ساتھ چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی۔ جوان ہونے کے باوجود وہ ازلی طور پر بوڑھی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا خاوند اس کی پروا نہ کرتا تھا۔ کبھی کبھار سال دو سال کے بعد رات کے اندھیرے میں وہ چپ چاپ آ جاتا پھر اگلی صبح جب ایلی بیدار ہوتا تو اسے خبر ملتی کہ فاضل صاحب آئے ہوئے ہیں وہ دور سے ہی اسے دیکھتا۔ سیاہ فام بھاری بھرکم سا مرد جس کے بال کالے ہونے کے باوجود سفید دکھائی دیتے تھے اور جس کی جھکی ہوئی کمر سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ شانوں پر صدیوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ وہ دھیمی آواز میں باتیں کرنے کا عادی تھا یہاں تک کہ گھر والوں کو اس کی کھسر پھسر

سے اندازہ نہ ہو سکتا تھا کہ وہ آپس میں محبت بھری باتیں کر رہے ہیں یا ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں البتہ جب کبھی ایلی اس کے پاس جاتا تو وہ ایک نہ ایک دلچسپ بات شروع کر دیتا اور ایلی کو یقین نہ آتا کہ اس شکل و صورت کا شخص ایسی چمکیلی اور دلچسپ بات بھی کر سکتا ہے۔

ایلی کے گھر میں سیدہ کے علاوہ سیدہ کی مرحوم بہن نیاز کی بیٹیاں حمیدہ اور رشیدہ بھی رہتی تھیں مگر وہ تو بالکل بچیاں تھیں۔ حمیدہ اور رشیدہ کا ایک بھائی بھی تھا جس کا نام نقی تھا اور جس کے چہرے پر بہت بڑا داغ تھا۔

حمیدہ اور رشیدہ کے آنے سے ایلی کو چند ایک سہولیات ضرور حاصل ہو گئی تھیں کیونکہ اسے دو چھوٹی بہنیں میسر ہو گئی تھیں جو اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں مصروف رہتی تھیں اور اس کا کام کرنے میں حقیقی مسرت محسوس کرتی تھیں مگر ان باتوں کے باوجود اسے گھر رہنے میں کوفت ہوتی تھی اور وہ ہر ممکن موقعہ پر رضا کے پاس جا بیٹھتا اور رضا اسے اداس دیکھ کر کہتا۔ "آؤ تمہیں گھما لائیں۔ کیا یاد کرو گے بابو۔"

وہ اپنی لاٹھی سنبھال کے ساتھ ہو لیتا اور جب وہ علی پور کی فصیل کے باہر چکر لگا لگا کر تھک جاتے تو وہ اسے پہلوان اور طفیل کے پاس لے جاتا۔ پہلوان اور طفیل آصفی محلے کے پڑوس میں رہتے تھے پہلوان ایلی کو دیکھ کر مسکراتا۔ "آیئے بابو جی۔" اور پھر اپنی تمام تر معصومیت کو لیے ہوئے بیٹھا مسکراتا رہتا۔ طفیل ایک دبلا پتلا لڑکا تھا جس کی طبیعت میں رنگینی اور تیزی دونوں عنصر موجود تھے۔ وہ دونوں ایلی کے ساتھ بڑی محبت اور عزت سے پیش آتے تھے اور ایلی محسوس کرتا تھا جیسے وہ ایک بلند و برتر ہستی ہو۔ پھر وہ شیخ ہمدم کی طرف جا بیٹھتے جو چمڑے کا سوداگر تھا۔

شیخ ہمدم

پہلی دفعہ شیخ ہمدم کو دیکھ کر ایلی بہت متاثر ہوا تھا۔ شکل و صورت سے معزز دکھائی

دینے کے باوجود اس کے خیالات نوجوانوں کے سے تھے اور طبیعت میں بلا کی چمک تھی۔ شیخ ہمدم پہلا شخص تھا جو عمر اور مرتبے میں بڑا ہونے کے باوجود ایلی سے دوستانہ حیثیت سے ملتا تھا۔ ”آئیے الیاس صاحب“ وہ اسے دیکھ کر مسکراتا ”تشریف رکھیے یہاں گھبرانے کی کوئی بات نہیں بس چار ایک منٹ میں سودا ہو جائے گا اور پھر بیٹھ کر گپ اڑائیں گے۔“ ”ہاں جی چودھری جی۔“ وہ اپنے گرد بیٹھے ہوئے بیوپاریوں سے کہتا۔ ”بس جو کہہ دیا ہے نا میں نے وہ عین مناسب ہے۔ آپ بھی کیا یاد رکھیں گے چودھری صاحب۔ سو کے پیچھے ایک آنہ اور سہی۔ بس چودھری صاحب اب تو مطمئن ہو جانا چاہیے آپ کو۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے اچھا تو سلام علیکم ہاں جی الیاس صاحب۔ تو رہے گی شطرنج کی بازی۔ مگر ابھی تو آپ نا پختہ ہیں اس فن میں بہر حال چلئے۔ ہو ہی جائے ایک بازی۔ ہاں کیا پئیں گے آپ نہیں چائے تو واہیات ہے۔ اولڑکے دودھ والے۔ آدھ سیر دودھ میں چار پیڑے بلو کر لانا۔ ذرا بالائی زیادہ ڈالنا۔ الیاس صاحب بھی کیا یاد کریں گے کہ کسی شیخ سے پالا پڑا تھا۔ بابو الیاس صاحب دودھ پیجیے۔ بالائی کھائیے اور روز ورزش کیجیے۔ یہی عیش ہے آپ کی قسم۔ ہاں تو کہیے کیسی گزرتی ہے آج کل۔“

شیخ ہمدم میں زندگی تھی۔ جوانی تھی اور اس کے علاوہ وہ معزز شہری سمجھے جاتے تھے اور یہ سب باتیں علی پور میں ایلی کو نصیب نہ تھیں گھر اور محلے والے اسے کھلنڈرہ لڑکا سمجھتے تھے اور بس وہ اس قابل نہ تھا کہ اسے کوئی اہمیت دی جائے۔ اس میں ذہنی چمک تو تھی مگر وہ ڈر اور خوف کے دبیز پردوں میں دم توڑ رہی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خود کفیل نہ تھا جیسے کہ شیخ ہمدم تھے۔ جب شیخ ہمدم اسے الیاس صاحب کہتے تو وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا اور اسے محسوس ہوتا کہ وہ بھی ایک حیثیت کا مالک ہے باعزت فرد ہے ایک ایسا شخص جو بالغ العقل ہے۔

ان باتوں کے باوجود ایلی زیادہ دیر تک شیخ ہمدم کے پاس نہ بیٹھ سکتا تھا کیونکہ جلد

ہی اس پر احساسِ کمتری چھا جاتا اور وہ وہاں سے چلے آنے کا کوئی نہ کوئی جواز پیدا کر لیتا۔ گھر آ کر وہ چارپائی پر لیٹ جاتا اور شریف کی سی آنکھیں بنا کر چھت کو گھورنے لگتا چھت پر ایک سفید سا دھبہ چمکتا اور ایک بھوری لٹ لٹکتی دو سیاہ آنکھیں ڈولتیں۔ بار بار آہیں بھرتا اور پہلو بدلتا اور محسوس کرتا کہ زندگی ایک مسلسل کوفت ہے ایک دکھ بھری کیفیت۔

نتیجہ

ایلی کا نتیجہ نکلا تو وہ فیل تھا۔ اس خبر کو سن کر اسے بہت صدمہ ہوا لیکن اس نے اپنی تعلیمی ناکامی کو ایسی چابکدستی سے ناکامیِ محبت کی طرف مبذول کر دیا کہ اسے فیل ہونے کا کوئی صدمہ نہ رہا وہ الجھی ہوئی لٹ اور پر پیچ ہو گئی اور اس سفید دھبے میں دل کے خون کی ہلکی سی سرخی شامل ہو گئی۔

نتیجہ کے اعلان کے بعد علی احمد کا ایک خط موصول ہوا جس میں ایلی کو مختصر طور پر ہدایت کی گئی تھی کہ وہ امرتسر جا کر ایڈورڈ روڈ پر روشن لال سے ملے خط میں علی احمد نہ یہ نہ لکھا تھا کہ یہ روشن لال کون تھے اور ان سے ایلی کو ملانے کا مقصد کیا تھا۔ ایلی صرف اس حد تک سمجھ سکا تھا کہ روشن لال علی احمد کے دوست تھے اور انہوں نے کسی نجی کام کے لیے اس سے روشن لال سے ملنے کو کہا تھا۔

ایلی کو معلوم نہ تھا کہ روشن لال امرتسر آریہ کالج کے پرنسپل تھے اور علی احمد کا مقصد اس ملاقات سے صرف یہ تھا کہ روشن لال ایلی کو امرتسر آریہ کالج میں داخل ہونے پر رضامند کر لیں اور وہ لاہور میں آوارگی کرنے سے محفوظ ہو جائے انہیں معلوم نہیں تھا کہ ایلی کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ وہ امرتسر جائے وہاں ایک سال رہنا تو بہت بڑی خوش نصیبی تھی۔ شاید انہیں بے بی شو کا وہ معمولی واقعہ یاد ہی نہیں رہا تھا ان کی زندگی ایسے واقعات سے بھری پڑی تھی اس لیے انہوں نے اسے چنداں اہمیت نہ دی تھی۔ لیکن ایلی کے لیے اب بے بی شو کا وہ دن ایک تاریخی دن تھا

ایک ایسا دن جسے وہ کبھی فراموش نہ کر سکتا تھا۔

پرنسپل

روشن لال خوش شکل اور جوان قسم کے آدمی تھے ان کے بشرے سے ذہانت اور بے تکلفی ٹپکتی تھی۔

"ہوں......" وہ بولے۔ "تو تم علی احمد کے لڑکے ہو۔ جانتے ہو علی احمد میرے دوست ہیں لنگوٹیہ دوست۔ مگر تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔ علی احمد کے بیٹے کو گھبرانا زیب نہیں دیتا۔ بیٹھ جاؤ چائے پیو گے نا۔ اوہ تو تمہیں مجھ سے زیادہ ان سنہری مچھلیوں سے دلچسپی ہے۔" ایلی کو بلور کے مرتبان میں تیرتی ہوئی مچھلیوں کی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر وہ ہنسنے لگے۔

"اچھا تو الیاس یہ بتاؤ کہ جب مرتبان کا پانی گندہ ہو جائے اور مچھلیوں کو تازہ پانی بہم پہنچانا ہو یعنی مرتبان کا پانی بدلنا ہو تو کیا کریں گے۔"

ایلی سوچنے لگا "ہاں ہاں سوچ لو۔" وہ مسکرا کر بولے۔ "مگر کوئی ایسی بات بھی نہیں۔ سائنس پڑھی تھی نا تم نے دسویں میں۔"

ایلی ان کی بے تکلف باتیں حیرانی سے سن رہا تھا اس کا تو خیال تھا کہ روشن لال اسے کوئی ضروری پیغام دیں گے اور بزرگانہ انداز میں کچھ فرمانے کے بعد یہ ملاقات ختم ہو جائے گی مگر وہ تو اس سے یوں باتیں کر رہے تھے جیسے وہ علی احمد کی بجائے خود ایلی کے دوست ہوں۔

"اچھا تو الیاس تمہارے مشاغل کیا ہیں؟" وہ پوچھنے لگے۔ "سنا ہے فی الحال فیل ہونا تمہارا مشغلہ ہے جب میں تمہاری عمر میں تھا تو میرا بھی یہی شغل تھا۔ کئی ایک سال میں کامیابی سے فیل ہوتا رہا۔"

ایلی حیران تھا کہ انہیں کیا جواب دے وہ بڑے شوق سے ان کی باتیں سن رہا تھا اور مسکرا رہا تھا "اچھا بھئی" بالآخر وہ بولے۔ "اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو ہم تمہیں

اپنے کالج میں داخل کر لیں۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ کیوں۔"

"آپ کا کالج"۔ ایلی نے خوشی سے پوچھا۔

"ہاں ہاں" وہ بولے۔ "ایک چھوٹا سا کالج ہے اور اسے چلانا میرے ذمہ ہے تم ایسے لڑکے اگر میرے کالج میں داخل ہو جائیں تو بڑا اچھا ہو۔"

"جی ہاں" ایلی خوشی سے جھوم گیا۔ ایک تو امرتسر اور پھر روشن لال صاحب اس سے بہتر صورت کیا ہو سکتی تھی اور وہ داخل ہونے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔

ہال دروازے پر پہنچ کر دفعتاً اسے خیال آیا کہ وہ یہاں رہتی ہے اس شہر میں ان تانگوں میں بیٹھتی ہو گی اس نے بازار میں چلتے ہوئے تانگوں کی طرف دیکھ کر سوچا۔ ان سڑکوں پر چلتی پھرتی ہو گی کتنی خوش نصیب ہیں یہ سڑکیں یہ راستے یہ تانگے یہ ہوا۔ ایک سفید سا دھبہ اس کی نگاہوں میں چمکنے لگا اور گھنگھریالی لٹ لہرا لہرا کر اسے بلانے لگی۔ اللہ کرے ابا روشن لال کی تجویز مان لیں اور میں امرتسر کالج میں داخل ہو جاؤں۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ تجویز تو خود علی احمد کی تھی جسے روشن لال نے اپنی جانب سے پیش کیا تھا تا کہ ایلی کو یہ احساس نہ ہو کہ اسے امرتسر میں داخل ہونے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ اور وہ لاہور میں داخل ہونے کا مطالبہ نہ کرے۔

دس دن کے اندر اندر علی احمد کا خط موصول ہوا جس میں اسے امرتسر میں داخل ہونے کی اجازت دے دی گئی اور وہ اپنا مختصر سا سامان اٹھا کر امرتسر آ پہنچا اور آریہ کالج میں داخل ہو گیا اور پرنسپل روشن لال نے اسے بورڈنگ میں داخل ہونے کی خصوصی اجازت حاصل کر دی کیونکہ وہاں مسلمان لڑکوں کو رہنے کی اجازت نہ تھی۔

آم اور سانپ

بورڈنگ شہر سے بہت دور نہر کے کنارے آموں کی کوٹھی میں واقع تھی۔ آموں کی کوٹھی ایک ویران جگہ تھی زرد رنگ کی یہ پرانی عمارت چاروں طرف سے آم کے

درختوں میں گھری ہوئی تھی جہاں رات بھر زمین پر سانپ رینگتے اور دن بھر الو بولتا۔ مغرب کی جانب ایک کچی سڑک تھی جس کے پرے امرودوں کا ایک باغ تھا جنوب کی طرف نہر بہتی تھی اور باقی دونوں طرف ویران زمین تھی۔

کوٹھی سے ایک پختہ سڑک شہر کی طرف نکل گئی تھی۔ سڑک کا یہ ویران ٹکڑا دو فرلانگ لمبا تھا جس کے دونوں طرف اونچے لمبے درخت لگے تھے اور وہ اتنے گھنے تھے اور تعداد میں اس قدر زیادہ تھے کہ اچھی خاصی جنگل کی شکل بن گئی تھی۔ سڑک کے اس ویران ٹکڑے سے پرے کمپنی باغ اور ٹھنڈی کھوئی تھی۔

اڑتے پھلکے

بورڈنگ میں تقریباً بارہ تیرہ کمرے تھے جن سے ہٹ کر دو کمرے تھے جو باورچی خانے کے لیے مخصوص تھے جن میں چار ایک غلیظ باورچی اور نوکر ہر وقت کام کاج میں مصروف رہتے تھے۔ کوٹھی کے مشرق میں دو بڑے کمرے بنگالی پروفیسر بینر جی کے لیے مخصوص تھے جو بورڈنگ کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور اکثر چوری گھر میں مچھلی پکا کر کھایا کرتے تھے کیونکہ بورڈنگ میں مچھلی اور انڈا پکانا قانونی طور پر منع تھا۔ بورڈنگ کے باورچی خانے میں آلو ساگ بھنے ہوئے ٹینڈے بینگن کا بھرتہ اور دالیں پکتی تھیں۔ رسوئی کے باہر ایک لمبی میز پڑی تھی۔ یہ میز لڑکوں کا ڈائیننگ ہال تھی۔ بندو باورچی چھوٹے چھوٹے پھلکے پکا کر انہیں باورچی خانے سے پراسرار رکابیوں کی طرح ہوا میں پھینکتا اور باہر میز پر بیٹھے ہوئے لڑکے انہیں دبوچتے۔

''بندو پھلکا۔'' رام لال چلاتا اور بندو ایک زرد زرد سا پھلکا فضا میں چھوڑتا جو رام لال کے ہاتھوں میں آ گرتا۔ ایلی بندو کی چستی اور نشانے پر حیران رہ گیا۔ وہ منظر عجیب تھا۔ باورچی خانے کے باہر سفید زمین پر ایک لمبی غلیظ میز پر دس بارہ لڑکے کٹوریاں سامنے رکھے بیٹھے تھے اور بندو کے پھلکے کبوتروں کی طرح ہوا میں اڑ

رہے تھے۔

''بندو پھلکا'' اور ایک ساعت میں ایک پھلکا پکارنے والے کے ہاتھ میں آ گرتا۔

''بندو دال'' ایک لڑکا چیختا اور ہنستا ایک کٹوری لے کر بھاگتا۔

ایلی کے لیے کھانے کی میز کا یہ منظر بالکل نیا تھا۔ نیا اور انوکھا۔ لیکن اسے اجازت نہ تھی کہ وہ اس میز پر بیٹھے کیونکہ وہ مسلمان تھا اور مسلمان کے لیے جنرل ٹیبل پر بیٹھنا منع تھا اس کے لیے کچن کے برتنوں کو استعمال کرنا ممنوع تھا۔ خوش قسمتی سے اس سال بورڈنگ میں دو اور مسلمان لڑکے داخل ہو گئے تھے جنہیں خصوصی وجوہ کی بناء پر وہاں رہنے کی اجازت مل گئی تھی اور ان تینوں کا فرض تھا کہ یا تو وہ سب سے پہلے کھانا کھا لیں اور یا سب کے بعد اور یا کمرے میں بیٹھ کر جب جی چاہے کھائیں بشرطیکہ اس وقت کوئی نوکر فارغ ہو جو ان کے لیے کھانا لا سکے۔

کٹوریاں

نوکر ان زرد کٹوریوں میں کھانا لے آتا اور پھر کٹوریوں میں انگلیاں ڈال کر بڑی بے تکلفی سے دال یا سبزی ان کے ذاتی برتنوں میں انڈیل دیتا۔ اس عمل کے دوران میں وہ احتیاط رکھتا کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ ان کے برتنوں سے چھو کر بھرشٹ نہ ہو جائے اور پھر وہ تینوں باری باری چلاتے۔ ''بندو پھلکا'' اور پھلکے ہوا میں اڑتے اور برتن بجتے اور وہ تینوں ایلی شفیع اور مولاداد شور مچاتے۔

ہفتے کو سر شام ہی سے کچن سے باہر دودھ کی بڑی بڑی گاگریں قطار میں پڑی دکھائی دیتیں۔ نہ جانے وہ گاگریں کہاں سے آتی تھیں۔ شام کو ہر آدھ گھنٹے بعد کوئی مہرا سر پر گاگر اٹھائے تیزی سے نیم چلتا نیم بھاگتا ہوا آتا دکھائی دیتا۔ اس کا جسم میل سے بھرا ہوتا۔ ہاتھوں کی انگلیاں گاگر میں ڈوبی ہوئی ہوتیں اور کہنیوں تک بازو دودھ میں تر ہوتے دودھ کی چھلکتی ہوئی گاگر لیے وہ بھاگا آتا اور پھر ہنستے یارامو

کی مدد سے گاگر اتار لی جاتی۔

ہفتے کی رات بندو بڑے بڑے کڑاہے چولہوں پر رکھ کر آگ جلا دیتا اور پھر رات بھر ان کڑاہوں میں چمچہ چلانے کی آوازیں آتیں اور بندو باری باری ہنستے اور رامو کو ڈانٹتا۔ اگلے روز بڑی بڑی زرد تھالیوں میں کھیر ڈال دی جاتی اس پر لڑکے خوشی سے پھولے نہ سماتے اور پھر میز پر بیٹھ کر کھیر بھری انگلیاں چاٹتے۔ اس روز بندو کے چھلکے ہواؤں میں نہ اڑتے اور کٹوریاں باورچی خانے کے ایک کونے میں ڈھیر کر دی جاتیں۔

معزز آدمی

شفیع۔ مولا داد اور ایلی بورڈنگ کے ایک علیحدہ کمرے میں رہتے تھے۔ شفیع پتلا دبلا دراز قد لڑکا تھا جس کے خدوخال سے چستی اور ذہانت ٹپکتی تھی۔ اس کے والدین امرتسر کے قریب ہی کسی گاؤں کے زمیندار تھے۔ مولا داد کوتاہ قد اور جسیم تھا۔ خدو خال سے وہ کالج کا لڑکا معلوم ہی نہ ہوتا تھا اور گفتگو سے ظاہر ہوتا تھا جیسے کسی گاؤں کا جاٹ بھول کر شہر میں آ نکلا ہو۔ اس کا لباس بھی عجیب تھا۔ کم از کم ایلی کے لیے تو وہ لباس بہت ہی انوکھا تھا اس کے لباس کو دیکھ کر پہلے روز ہی پرنسپل نے اسے دفتر میں بلا لیا اور کہنے لگے۔

”مولا داد یہ کیا حلیہ بنایا ہے تم نے۔“

”حلیہ“ مولا داد نے حیرانی سے دیکھا اور پھر ٹھوڑی پر ہاتھ پھیر کر بولا ”پرنسپل صاحب میں تو اپنے گاؤں کا ایک معزز آدمی ہوں اور جناب حلیہ تو مجرموں کا ہوتا ہے۔“ مولا داد کی آواز اور انداز میں ایک خاص قسم کی سنجیدگی اور معصومیت تھی۔

”نہیں۔ نہیں یہ تہہ بند کالج میں نہیں چلے گا۔ کوئی شلوار نہیں ہے تمہارے پاس پہننے کے لیے۔“

”مل جائے تو پہن لوں گا۔“ وہ بولا۔

اس پر پرنسپل نے کسی فنڈ سے اسے دو شلواریں سلوا دی تھیں۔ اس کے بعد بورڈنگ سے چلتے وقت مولا داد ایک شلوار اخبار کے کاغذ میں لپیٹ کر لے جاتا۔ جب کالج کی گھنٹی بجتی تو وہ تہہ بند اتار کر جھٹ شلوار میں داخل ہو جاتا اور جماعت میں جا بیٹھتا جہاں خالی پیریڈ آتا وہ شلوار کاغذ میں لپیٹ لیتا اور تہہ بند باندھ کر اطمینان کا سانس لیتا۔

''بھئی اب کرو بات۔'' وہ چلاتا۔ ''یار اس شلوار میں تو دم گھٹتا ہے۔''

کوئی نہیں جانتا تھا کہ مولا داد کہاں کا رہنے والا تھا اور کہاں سے آیا تھا اس نے کبھی اپنے گاؤں اور والدین کا ذکر ہی نہ کیا تھا البتہ اسے جیب خرچ بہت کم ملتا تھا اور اس کے زیادہ تر اخراجات کالج والے خود ادا کیا کرتے تھے کیونکہ وہ کرکٹ کا ایک نہایت عمدہ کھلاڑی تھا اور بائیں ہاتھ سے گگلی گیند پھینکنے کی وجہ سے کالج والے اس کی عزت کیا کرتے تھے۔

شفیع یا تو سانپ مارنے کے شوق میں ادھر ادھر گھومتا پھرتا اور یا ہاکی کھیلنے کے متعلق گپیں سناتا رہتا۔ مولا داد تہہ بند جھاڑتا اور عجیب و غریب منصوبے بناتا رہتا۔ پہلے ہفتے میں اس نے لنگوٹا باندھ کر جبڑے پر رومال باندھ کر ہاتھ میں لٹھ لے لیا اور رات کے وقت سڑک پر دو رویہ درختوں میں جا چھپا۔ جب بھی کوئی بورڈنگ سے متعلقہ لڑکا سڑک پر آتا دکھائی دیتا تو وہ لٹھ لے کر درختوں سے باہر نکل آتا۔

رکھ دے یہاں جو بھی تیرے پاس ہے وہ ڈاکو بن کر انہیں ڈانٹتا۔ اس طرح پہلی رات اس نے کئی پنسلیں۔ چاقو۔ گھڑیاں اور سات روپے بارہ آنے نقد جمع کر لیے تھے اور بورڈنگ کے لڑکوں کے دل میں سڑک کے اس ویران حصے کا ڈر پیدا ہو گیا تھا۔

..........میں ہوں!

سویرے وہ تینوں تیار ہو کر کالج کی طرف چل پڑتے اور دو گھنٹے کی پیدل

مسافت طے کرنے کے بعد کالج پہنچتے کیونکہ ان کے پاس بائیسکل نہ تھے اور تانگے پر جانے کی توفیق نہ تھی۔ راستے میں مولا داد بار بار تہہ بند جھاڑتا جاٹوں کی طرح چنگھاڑتا اور عجیب وغریب حرکات کرتا۔

شفیع یا تو مست انداز میں کوئی دھن گنگناتا رہتا یا باکی کے میچوں کے متعلق قصے سناتا۔ ایلی چپ چاپ اپنے خیالات میں کھویا چلا جاتا۔ نہ جانے وہ کہاں رہتی ہے۔ نہ جانے اسے معلوم بھی ہے یا نہیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرح اس کا پتہ لگائے اسے صرف یہی معلوم تھا کہ اس کے بھائی پہلے کسی دفتر میں ملازم تھے اور اب ان کا ارادہ تھا کہ ملازمت چھوڑ کر وکالت شروع کر دیں اور ان کا نام آغا صاحب تھا۔ آغا غلام بخش۔

وہ امرتسر میں آوارہ پھرتے ہوئے بڑے غور سے لوگوں کے بورڈ پڑھتا رہتا کہ شاید کہیں آغا غلام بخش کا بورڈ ہو مگر کئی روز تک وہ بے کار گھومتا رہا اور اسے وہ بورڈ نظر نہ آیا۔

ایلی کے دل میں تسلیم کے متعلق نقوش دھندلے پڑتے جا رہے تھے اور جوں جوں وہ دھندلے پڑتے ڈوبتے کے مانند وہ ان تنکوں سے شدت سے چمٹے جاتا جس قدر وہ نقوش دھندلے تھے اسی قدر اس کا جذبہ محبت بڑھتا جا رہا تھا وہ ڈرتا تھا کہ کہیں وہ شکل اس کے دل سے محو نہ ہو جائے اور اسے محبوبہ کی از سر نو جستجو کرنی پڑے کہیں ایک مرتبہ "سب کچھ" ہو جانے کے بعد وہ پھر سے "کچھ بھی نہ" نہ رہ جائے۔

برقعہ میں لپٹی ہوئی ہر عورت کو وہ امید بھری نگاہ سے یوں دیکھتا جیسے اسے توقع ہو کہ وہ چپکے سے اس کے پاس چلی آئے گی اور قریب آ کر برقعہ اٹھا کر رازدارانہ انداز سے جھانکے گی اور پیار بھرے لہجے میں کہے گی۔ تسلیم میں ہوں۔

ہر برقعہ پوش لڑکی جب اس کے قریب سے چپ چاپ گزر جاتی تو اسے دکھ سا

محسوس ہوتا لیکن جلد ہی دور سے آتی ہوئی کوئی اور برقعہ پوش اس کی امید کا مرکز بن جاتی اور وہ بڑے شوق سے اسے ٹٹولتا شاید وہ نورانی دھبہ اور گھنگھریالی لٹ اس برقعے میں ملفوف ہو۔ اکثر مرتبہ ایسا بھی ہوتا کہ کمپنی باغ میں ٹہلتے ہوئے اسے لڑکیوں کے گروہ دکھائی دیتے جنھوں نے برقعے اٹھائے ہوتے اور اسے کئی ایک سفید دھبے اور گھنگھریالی بھوری لٹیں دکھائی دیتیں اور اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کس کی طرف دیکھے۔ اسے سبھی گوری چٹی لڑکیاں حسین معلوم ہوتی تھیں لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کے قریب نہ آتی اور رازدارانہ انداز میں نہ کہتی۔ "تسلیم۔ میں ہوں۔" یہ صورت حال بے حد تکلیف دہ تھی اور سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ امرتسر میں وہ کسی سے دل کی بات نہ کہہ سکتا تھا۔

شفیع تو صبح و شام سانپ مارنے۔ اچھلنے کودنے۔ گنگنانے اور بالاخر ہاکی کی دلچسپی میں کھویا رہتا تھا اور مولا داد کی شکل و صورت ہی ایسی تھی کہ اس سے کوئی رنگین بات بیان ہی نہ کی جا سکتی تھی۔ کالج میں بیسیوں لڑکے تھے مگر وہ ان سے اچھی طرح واقف نہ تھا مثلاً مدھوک تھا۔ اونچا لمبا پیارا سا ساتھی۔ جس کے انداز سے بے پناہ ہمدردی ٹپکتی تھی اور جس کی آنکھوں پر گھنی اور لمبی بھویں عجیب ہپناٹک اثر رکھتی تھیں۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود ایلی کے لیے مدھوک سے ایسی بات کرنا ممکن نہ تھا۔ پھر وہ پست قد بشیر تھا مگر وہ تو سراسر مسخرہ تھا اس سے کوئی سنجیدہ بات نہ ہو سکتی تھی۔ البتہ آصف تھا۔

آصف........

آصف ایک خوبصورت اور دراز قد لڑکا تھا جو بات بات پر شرما جانے کا عادی تھا اور جس کے جذبات ہر لمحہ اس کے چہرے پر گلابی رنگ کی صورت میں ناچتے رہتے تھے۔ معمولی سی بات پر اس کے رخساروں پر ایک گلابی لہر دوڑ جاتی۔ نگاہیں جھک جاتیں آنکھوں میں پھلجھڑیاں سی چلتیں اور جسم بید کی طرح جھولتا۔

آصف زیادہ باتیں کرنے کا شوقین نہ تھا اور نہ ہی محفل میں جانے کا دلدادہ جب بھی لڑکے خالی پیریڈ میں کالج کے گراؤنڈ میں کھڑے ہو کر خوش گپیاں کرتے وہ مسکراتا ہوا آنکلتا اور چپکے سے ایلی کو اشارہ کرتا اور وہ دونوں چپکے سے وہاں سے کھسک جاتے اور یا تو پہلوان کی دوکان پر بیٹھ کر پوری کچوری کھاتے یا راموپان والے سے سگریٹ خریدتے۔ بازاروں میں گھومتے پھرتے ہوئے جب بھی کوئی عورت قریب یا دور سے گزرتی جس کے سینے پر سلوٹ پڑے ہوتے تو آصف ایلی کو کہنی مار کر چپکے سے کہتا۔ ”وہ دیکھو۔ ادھر، وہ ادھر۔“

آصف کو کپڑے کی سلوٹوں اور متناسب جسم کے دائروں سے بے پناہ دلچسپی تھی جسے اس نے عام لڑکوں کے سامنے کبھی ظاہر نہ کیا تھا۔ اس کے احساسات بے حد پاکیزہ اور لطیف تھے اور جذبات میں شاعرانہ رنگ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا لیکن عورت کے جمال کے علاوہ اسے اس سے کوئی اور دلچسپی نہ تھی بلکہ عورت کے قرب کا ڈر اس کے دل میں خطرناک قسم کی شدت اختیار کر چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ عورت کے جمال کو دیکھے۔ اس کے جسم کے خم و پیچ کو جانچے چوری چوری حسن سے محفوظ ہو مگر دیکھے جانے والی کو احساس نہ ہو جائے کہ اسے دیکھا جا رہا ہے۔ نگاہیں چار نہ ہو جائیں اگر کوئی شوخ راہ گیر نگاہ بھر کر اسے دیکھ لیتی تو آصف کو پسینہ آ جاتا۔ آنکھیں پلکوں تلے غروب ہو جاتیں اور رخساروں پر یوں ہوائیاں چلتیں جیسے غروب آفتاب کے وقت بادلوں میں گلابی نقوش بنتے بگڑتے ہیں۔

آصف کی طبیعت ایسی تھی کہ دیر تک اس سے دل کا راز نہ کہنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے ایلی نے ایک روز ٹہلتے ٹہلتے اس سے اس دھبے اور گھنگھریالی لٹ کا راز کہہ دیا۔ ایلی کا قصہ سن کر آصف نے ہتھیلی پر رخسار رکھ کر ترچھی نگاہ سے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں گلابی بوندیوں کی پھوار پڑنے لگی۔ ”تم تو چھپے رستم ہو۔“ وہ مسکرانے لگا۔

آصف سے دردِ دل کہنے کا ایلی کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ نہ کسی لڑکی نے نقاب پلٹ کر کہا "تسلیم میں ہوں۔" اور نہ ہی کسی بورڈ پر آغا غلام بخش لکھا نظر آتا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ جب ایلی لڑکوں میں کھڑا ہوتا تو آصف چپکے سے آ کر کہتا "تسلیم" اور ہاتھ اٹھا کر سر جھکاتا اور پھر مسکرائے جاتا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کچھ سمجھا رہا ہو جتا رہا ہو۔

گلابی جھینپ

ایک روز حسبِ معمول آصف اور ایلی دونوں کالج گراؤنڈ کے درمیان کھڑے مہر کی طرف دیکھ رہے تھے جو کالج کا حسین ترین نوعمر لڑکا تھا۔ مہر بھاگتا ہوا آ رہا تھا دفعتاً اسے ٹھوکر لگی اور اس کی ٹوپی دور جا پڑی۔ گھنگھریالے بال بکھر گئے۔ اس پر آصف مدہم آواز میں گنگنایا "کہیں یہی تو نہیں تمہاری تسلیم" اور ایلی نے ایک نظر مہر کی طرف دیکھا پھر محسوس کرنے لگا جیسے وہ تسلیم کا ہم شکل ہو۔

اس کے بعد تمام تر بکھری بکھری توجہ مہر پر مرکوز ہو گئی اس کے ذہن میں تسلیم نے مہر کا روپ دھار لیا۔

علی الصبح ایلی بڑے شوق سے کالج آتا اور پھر آتے ہی اس دروازے پر کھڑا ہو جاتا جہاں سے مہر داخل ہوا کرتا تھا اور وہاں کھڑا مہر کا انتظار کرتا رہتا۔ مہر آ جاتا تو ایلی کے جسم میں بجلی کی ایک کرنٹ سی دوڑ جاتی اور پھر وہ سارا دن یہ سوچتا رہتا کہ کس مقام پر کھڑا ہو۔ اور کس سمت سے دیکھے تاکہ مہر کا مسکراتا ہوا چہرہ پورے طور پر اسے نظر آتا رہے۔ دوپہر کے وقت جب رسس ہوتی تو آصف اور ایلی کالج کے دروازے کی طرف بھاگتے جس سے گزر کر مہر گھر جایا کرتا تھا وہ گزر جاتا تو دونوں پہلوان کی دوکان پر پوریاں کھاتے نسائی خم و پیچ دیکھتے۔ مہر کی واپسی کا انتظار کرتے۔ اگرچہ مہر کی حیثیت محض نعم البدل کی تھی لیکن اس سفید دھبے اور بھوری لٹ کی نسبت جسے ڈھونڈ نکالنے میں وہ ناکام ہو چکے تھے۔ یہ نعم البدل ایک مثبت اور

ٹھوس حقیقت تھی۔ اور حقیقت بھی ایسی جس پر ایک خواب کا سا عالم طاری رہتا تھا۔ چونکہ مہر نہ تو گردن اٹھانے کا عادی تھا۔ نہ قریب آ کر بات کرنے کا۔ اس کے برعکس وہ ایک دور کا موہوم تبسم اور گلابی جھینپ کی آمیزش تھا۔ لہٰذا چاہے وہ لڑکا تھا یا لڑکی ایلی کے لیے چنداں فرق نہیں پڑتا تھا۔

کالج کے بعد ایلی اور آصف امرتسر کے بازاروں اور باغات میں گھومتے رہتے یا آصف کے گھر جا بیٹھتے۔ آصف گھومنے کا بہت شوقین تھا مگر اسے اپنے والدین کی عزت اور اپنی نیک نامی کا بہت خیال رہتا تھا۔ بازاروں میں چلتے ہوئے وہ ہمیشہ سر جھکا کر چلتا تاکہ اس کے رویے سے آوارہ پن ظاہر نہ ہو نہ ہی وہ ایسے علاقوں میں جانے کے لیے تیار ہوتا جہاں پائے جانے پر بدنامی کا خدشہ ہو مثلاً وہ کٹڑہ رنگین میں کبھی داخل نہ ہوتا حالانکہ یہ کٹڑہ ان کے مکان کے قریب ہی تھا۔

کٹڑہ رنگین

کٹڑہ رنگین میں رقاصائیں رہتی تھیں اور وہاں سے ہر وقت دلکش آوازیں آیا کرتیں۔ کبھی دور سے سارنگی بین کرتی ہوئی سنائی دیتی کبھی ستار رقص کرتی اور کبھی طبلہ کی تھاپ سن کر ایلی کے دل میں کچھ کچھ ہونے لگتا۔ اس وقت ایلی کا دل چاہتا کہ ایک بار کٹڑہ رنگین میں سے گزرے اور ان آوازوں کو قریب سے سنے۔ آصف بھی ان آوازوں کو سن کر مسکراتا اور اس کی آنکھوں میں گلابی بوندیوں کی پھوار پڑتی لیکن وہ ایک لمبی آہ بھر کر کسی اور طرف مڑ جاتا۔ ایلی آصف کی وجہ سے مجبور تھا اس لیے وہ بھی کبھی اس کٹڑے میں داخل نہ ہوا تھا۔ وہاں اکیلے جانا بھی تو مشکل تھا اس نے کئی بار ادھر کا رخ کیا تھا مگر موڑ پر جا کر وہ گھبرا جاتا اور اس کا دل دھڑکنے لگتا۔

کئی ایک مرتبہ شیخ ہمدم کے ساتھ بھی اسے امرتسر کے بازاروں میں گھومنے کا اتفاق ہوا۔ ہمدم تجارت کے سلسلے میں امرتسر آتے رہتے تھے اور ہمیشہ آنے سے پہلے خط کے ذریعہ ایلی کو اطلاع دے دیتے "الیاس صاحب میں آ رہا ہوں شام کو

تین بجے مجھے کمپنی باغ کے مرکزی پلاٹ میں ملیئے۔ وہاں سے ہم سینما جائیں گے۔

ہمدم ایلی سے ملتے ہی مخصوص انداز میں چلانا شروع کر دیتے۔ ''ایلی صاحب یہ کیا مصیبت ہے آپ ایسے دکھائی دے رہے ہیں جیسے قیامت ٹوٹی ہو، عشق تو نہیں ہو گیا کہیں۔ عشق سے بچنے کا بہترین طریقہ ہم بتائیں گے۔ آیئے آیئے نا صاحب۔'' اور وہ اسے دودھ کی دوکان پر لے جاتے۔ ہاں پہلوان ذرا آدھ سیر دودھ میں چار پیڑے بلونا۔ بس الیاس صاحب صبح و شام کھاؤ پیو انشاء اللہ عشق قریب نہیں پھٹکے گا۔ اس مرض کے لیے دودھ ہی تریاق ہے اور سگریٹ اور چائے سے پرہیز لازم ہے۔ آیئے اب سینما چلیں۔ سینما دیکھنا صحت کے لیے بے حد مفید ہوتا ہے۔ آیئے رام باغ میں مسٹریز آف نورا کی فلم لگی ہے۔ اور وہ دونوں سینما چلے جاتے وہاں سگریٹ پیتے پوریاں کھاتے اور پھر شیخ ہمدم رات کی گاڑی سے واپس علی پور چلے جاتے اور ایلی آموں والی کوٹھی کا رخ کر لیتا۔ ایلی کے دل میں ایک دبی دبی امید تھی کہ شاید کسی روز شیخ ہمدم یاسمین سینما ہاؤس جانے کا ارادہ کر لیں جو کٹڑہ رنگین میں واقع تھی لیکن ہمدم نے کبھی اس میں جانے کی بات نہ کی تھی۔

پھر ایک روز امرتسر میں دو مشہور شاعر تشریف لائے۔ جن سے آصف کے گہرے تعلقات تھے ان کی آمد پر آصف کو امرتسر میں ایک عظیم مشاعرے کا انتظام کرنا پڑا اور حسن اتفاق سے وہ مشاعرہ یاسمین سینما ہال میں ہونا قرار پایا۔ جو اس ممنوع کٹڑہ میں واقع تھا آصف نے پہلے تو بہت کوشش کی کہ مشاعرے کا انتظام کسی اور جگہ ہو جائے لیکن وہ کامیاب نہ ہوا بہر حال آخر کار اسے کٹڑے میں جانا ہی پڑا۔

کٹڑہ رنگین امرتسر کے خوب صورت ترین بازاروں میں سے تھا اس کی لمبائی ایک فرلانگ سے زیادہ نہ تھی ویسے کافی فراخ تھا۔ سڑک کے دو رویہ خوبصورت چوبارے بنے ہوئے تھے جن کے چھجے بڑھے ہوئے تھے جن پر رنگ روغن کیا ہوا تھا

۔ان چھجوں کے پیچھے فراخ چوباروں میں چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں۔گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے اور چھتوں سے جھاڑ فانوس لٹکتے دکھائی دیتے تھے۔جنگلوں میں خوب صورت رقاصائیں دیدہ زیب ملبوسات پہنے بڑے طمطراق سے بیٹھی نگاہ غلط انداز سے نیچے بازار کی طرف دیکھتی رہتیں۔ان کی حرکات جمیل تھیں آوازیں لوچ دار تھیں۔

ایلی انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔وہ کبھی تصور نہ کرسکتا تھا کہ ناچنے گانے والی عورتیں اس قدر لطیف انداز اختیار کرسکتی ہیں خصوصاً وہ چوبارے جو اس کے متصل اور ملحق تھے ان کی مکین تو بے حد جاذب نظر تھیں۔بازار میں دو رویہ خوبصورت دوکانیں تھیں جن میں پنواڑیوں کی کثرت تھی۔

پنواڑیوں کی دوکانوں پر آتے جاتے پان کھانے کے بہانے کھڑے ہو جاتے اور پھر عاشقانہ نظروں سے چوباروں کی طرف دیکھتے۔ان کے متعلق فقرے چست کرتے یا عریاں اشارے کرتے جس پر چوباروں میں بیٹھی ہوئی رقاصائیں لطیف تبسم سے منہ پھیر لیتیں۔

شام کے وقت اس کوچے میں گویا بہار آجاتی تھی۔چوبارے والیاں شام سے پہلے ہی نہا دھو کر نیا جوڑا بدلتیں سنگار کرنے کے بعد وہ تیار ہو کر جنگلے میں آ بیٹھتیں۔

رات پڑتے ہی محفل ہائے نشاط آراستہ ہو جاتیں۔کثرہ موسیقی کی آوازوں سے گونجتا سارنگیاں چھڑ جاتیں گھنگھرو بجتے لے بلمپت سے شروع ہو کر درت ہوتی جاتی اور جوں جوں رات بھیگتی گیت کے بولوں کی ادائیگی میں عریانی کا عنصر بڑھتا جاتا۔

نیچے بازار میں محروم مگر شوقین مزدوروں کی پیکوں سے سڑک اور دیواریں رنگی جاتیں اور ان کے نعرے بلند ہوتے جاتے۔

”میری جان۔“

''ایک نظر ادھر بھی۔''

''ڈھول لکھنا دل پردیسیاں دا راجی رکھنا۔''

بالآخر ان کی محرومی اضطراب میں بدل جاتی اور کسی معمولی سے بہانے پر یہ اضطراب شدت اختیار کر لیتا اور پھر آپس میں گالی گلوچ تک نوبت پہنچ جاتی اور کٹہرہ میں لڑائی شروع ہو جاتی کسی کا سر پھٹ جاتا کسی کا پیٹ چاک کر دیا جاتا پھر پولیس میدان عمل میں آ پہنچتی۔ اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی۔ کی سی نگاہیں ڈالتے ہوئے چوباروں میں بیٹھے ہوئے سیٹھ اس ہنگامے سے گھبرا کر میراثیوں کو برخواست کر دیتے اور رقاصہ کا قرب حاصل کر کے خود کو ایک شدید تر ہنگامے کے حوالے کر دیتے تاکہ کٹہرے کے ہنگامے سے نجات حاصل کر سکیں۔

مجسم شعر

ایلی یاسمین سینما کی فراخ ڈیوڑھی میں کھڑا حیرانی سے کٹہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سینما کے مقابل کے چوبارے میں بیٹھی ہوئی رقاصہ کس قدر حسین و جمیل تھی۔ اس کی حرکات کس قدر متوازن اور دلفریب تھیں۔ اس کا وہ بے پروائی اور بے نیازی بھرا انداز اسے اور بھی خوب صورت بنا رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے رقاصہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی حرکت سے بھی تو سستا پن۔ عریانی یا نمائش کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔

آصف سینما ہال کے اندر چھپا ہوا تھا تاکہ کوئی اسے وہاں دیکھ نہ پائے۔ ایلی ڈیوڑھی میں کھڑا چوری چوری چوباروں کی طرف دیکھ رہا تھا اس کے دائیں بائیں کھڑے سبھی لوگ بے تکلفی سے طوائفوں کی طرف دیکھ رہے تھے پھر بھی نہ جانے کیوں ادھر دیکھنے میں اس حد تک مصروف تھے کہ انہیں ایلی کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہ تھی اور اگر فرصت ہوتی بھی تو وہ اس کے اس فعل کو قطعی طور پر اہمیت نہ دیتے۔

دفعتاً ایک اور گروہ ڈیوڑھی میں داخل ہوا جس کے پیش پیش ایک نوجوان تھا

جس کے بال بکھرے ہوئے تھے آنکھوں میں مستی جھلک رہی تھی اور چہرے سے شگفتگی اور ذہانت ٹپکتی تھی۔

''اخاہ........'' وہ سامنے کے چوبارے میں بیٹھی ہوئی حسینہ کی طرف دیکھ کر بے تکلفی سے چلایا۔ ''سبحان اللہ۔ حضور تو مجسم شعر ہیں۔ واہ وا۔ واہ وا۔'' وہ ٹکٹکی باندھ کر دیوانہ وار رقاصہ کی طرف دیکھنے لگا اس کے ساتھی مسکرانے لگے۔

''واہ وا کیا انداز دلبری ہے حسن بذات خود انگشت بہ دنداں ہے۔'' رقاصہ نے شور سن کر ایک بھرپور نگاہ اس نوجوان پر ڈالی۔

نوجوان عالم مستی میں سینما کے دروازے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر رقاصہ کی طرف دیکھ دیکھ کر چلانے لگا۔ ''اللہ کی قسم ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است۔''
آصف بھاگتا ہوا ہال سے باہر نکلا اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور وہ کانپ رہا تھا۔ وہ شاعر سے مخاطب ہو کر چلایا۔ ''یہ کیا کر رہے ہیں آپ لوگ کیا کہیں گے۔''

آغا

''بھئی واہ۔'' بے خود حیرانی سے چلایا۔ ''اس میں کہنے کی بات کیا ہے۔ کیوں بھئی تم کچھ کہتے ہو کیا۔'' اس نے جملہ لوگوں کو مخاطب کر کے پوچھا۔ اور طوائف کی طرف ٹکٹکی باندھ کر با آواز بلند یہ شعر پڑھنے لگا۔

نظر کو ہے عادت تماشا!
جہاں ہو جیسا ہو جس طرح ہو
کوئی یہ حسن ازل سے کہہ دے
کہ جلوہ آرا ہو جس طرح ہو

شعر سن کر لوگ جھومنے لگے اور آصف گھبرا کر ایلی کی طرف بڑھا۔
''ہائیں۔ آصف ایلی کے پاس کھڑے ایک شخص کو دیکھ کر بولا آپ ہیں آغا صاحب آپ یہاں۔

آغا صاحب۔ ایلی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا وہ درمیانے قد کا شخص تھا چہرے پر متانت کے آثار تھے اور انداز سے خلوص ٹپکتا تھا۔

"یہ ہیں الیاس میرے ہم جماعت اور دوست۔" آصف نے آغا سے کہا۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" آغا صاحب نے ایلی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "آپ امرتسر کے رہنے والے ہیں۔"

"جی میں۔" ایلی نے جواب دیا۔ "میں تو علی پور کا ہوں۔" "علی پور" آغا صاحب نے دہرایا۔ "وہاں میرے ایک عزیز دوست علی احمد رہتے ہیں۔ بڑے رنگین مزاج ہیں۔" وہ ہنسنے لگا۔

"یہ انہیں کے بیٹے ہیں۔" آصف مسکرا کر بولا۔

"علی احمد کے بیٹے۔" آغا صاحب نے پھر ایلی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "کتنی خوشی ہوئی آپ سے مل کر خاکسار کو آغا غلام بخش کہتے ہیں۔ آپ کے والد صاحب میرے گہرے دوست ہیں اور مہربان بھی۔"

آغا غلام بخش۔ ایلی کی نگاہ میں گردوپیش دھندلا گئے۔ نہ جانے وہ جوان شاعر سیڑھیوں پر بیٹھا کیا کہہ رہا تھا۔ نہ جانے چوبارے میں بیٹھی ہوئی گلابی کریپ میں ملبوس رقاصہ کیسے مسکرا رہی تھی۔ ایلی کی نگاہوں تلے اس شور بھرے دھندلکے میں آغا صاحب کے علاوہ سبھی معدوم ہو چکے تھے اور آغا صاحب کے عقب میں ایک گھنگھریالی لٹ لٹک رہی تھی اور ایک رنگین دھبہ مسکرا رہا تھا۔

"تسلیم" آصف نے مسکرا کر ایلی کی طرف بامعنی انداز سے کہا۔ "تسلیم" آغا صاحب کے عقب میں کسی تبسم چہرے نے گھنگھریالی لٹ جھٹک کر کہا۔

ایلی کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ وہ خوشی سے ناچنے لگے اور چیخ چیخ کر کہے "تسلیم مزاج اچھے ہیں۔"

"تسلیم آپ آغا صاحب ہیں۔" "تسلیم مجھے آپ سے مل کر بے حد خوشی

ہوئی۔"" تسلیم....."

آغا صاحب کا مکان یاسمین سینما کے قریب ہی کٹھرہ رنگین میں واقع تھا مکان کے باہر ایک سنار کی دوکان تھی جس کے پیچھے ایک دالان تھا جس میں مگ کھلتا تھا جسے ملاقاتی کمرے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور جس کے ایک پہلو میں ایک زینہ اوپر کو چلا گیا تھا۔ آغا کے گھر کے لوگ اوپر چوبارے میں رہتے تھے اور یہ چوبارہ کٹھڑے کے باقی چوباروں کی طرح تھا۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ اس کے آگے بالکونی نہ تھی اور چوبارے کی تین کھڑکیوں پر چقیں پڑی ہوئی تھیں اور ان کھڑکیوں سے کبھی کسی نے باہر نہ جھانکا تھا۔

ایلی اس بات پر حیران نہ ہوا کہ وہ اس چوبارے میں کیوں رہتے تھے اور اگر رہتے تھے تو کٹھڑے کی رسم کے مطابق وہ کھڑکیاں چقوں سے خالی کیوں نہ تھیں یہ باتیں غیر اہم تھیں۔ اس لیے تفصیلات اس کی توجہ کو جذب نہ کر سکیں اور وہ اپنی امیدوں کے اس گہوارے کو دیکھنے میں کھو گیا۔

تیم نیم

آغا کے ساتھ ملاقاتی کمرے میں بیٹھے ہوئے اس کے احساسات عجیب سے تھے وہ اس بات پر مسرت محسوس کر رہا تھا کہ وہ اسی مکان میں بیٹھا ہے جہاں وہ رہتی ہے اسی چھت تلے بیٹھا ہے جس کے اوپر نہ جانے وہ کس کام میں مصروف ہے آغا سے باتیں کرنے کے باوجود اس کے کان ان آوازوں پر لگے ہوئے تھے جو اوپر سے آ رہی تھیں۔ "ہائے میں کیا کروں۔ لو میں کیا جانوں یوں ہوتا ہے۔" ان آوازوں میں لے تھا راگ تھا۔ شوخی تھی۔ ان قدموں کی آوازوں میں ترنم تھا۔ اوپر سے بہت سی آوازیں آ رہی تھیں لیکن ان سب کا ایک ہی انداز تھا جیسے سانچے میں ڈھلی ہوں۔ نہ جانے اس کی آواز کون سی تھی۔

جب دالان کے اوپر جنگلے سے کوئی پلو لہراتا ہوا نکل جاتا تو ایلی کا دل دھک سے

رہ جاتا۔ ان پلوؤں کی اڑان کتنی حسین تھی۔ بظاہر وہ آغا سے باتیں کر رہا تھا مگر اس کا دل کسی اور ہی لے پر ناچ رہا تھا اور آغا میں بھی کتنی مٹھاس تھی اس کے چہرے پر اطمینان کی ایک دبیز تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ سکون اور اطمینان۔ گویا وہ یوں اپنے آپ میں مگن تھا جیسے کوئی ناؤ کسی ساکن جھیل میں چپوؤں کی مدد کے بغیر آپ ہی آپ رواں ہو۔

''اچھا بھئی میں ذرا نہا لوں۔'' آغا صاحب اٹھ بیٹھے۔ ''ابھی پانچ منٹ میں حاضر ہوا۔'' وہ قریب ہی غسل خانے میں داخل ہو گئے۔

ایلی موقع غنیمت جان کر بلا تکلف اوپر دیکھنے لگا جہاں سفید آنچل لہرا رہے تھے۔ ''بھائی جان۔'' ایک سریلی آواز سنائی دی۔ معصوم گلابی چہرہ جھکا۔ ایک تبسم جھلکا۔ ''بھائی جان۔'' پھر آواز آئی۔

چند ساعت کے بعد نو دس سال کی ایک حسین چینی کی گڑیا نیچے اتر آئی۔ اس نے ایلی کی طرف دیکھا اور پھر ایک متبسم مسکراہٹ سے شرما کر منہ موڑ لیا وہ صابون اور تولیہ غسل خانے کے دروازے پر رکھ کر بھاگ گئی اور پھر دروازے کی درز سے مسکرا مسکرا کر جھانکنے لگی۔

''رکھ دیا نیم۔'' آغا نے پوچھا۔

''جی دروازے میں ہے۔'' وہ بولی اور پھر بامعنی انداز سے مسکرا کر بھاگ گئی۔

آہستہ آہستہ ایلی اور نیم دوست بن گئے۔ جب ایلی زینے میں کھڑے ہو کر آواز دیتا ''آغا صاحب'' تو بالائی منزل کے دروازے میں رنگین سرگوشیاں ہوتیں۔ پھر نیم مسکراتی ہوئی نیچے اتر آتی۔

''وہ کہاں ہے نیم۔'' ایلی اس سے دبی آواز میں پوچھتا۔

''ہے'' وہ کہتی ''وہاں دروازے کی اوٹ میں۔'' وہ زیادہ تر اشاروں میں جواب دیتی تھی۔ اس کے اشارات میں عجیب شان بے نیازی تھی۔

"اس سے کہو سامنے آئے۔" ایلی کہتا۔

"ہونہہ۔ وہ نہیں آتی ہم کیا کریں۔"

"تم نے کہا بھی تھا۔"

"کہہ رہی ہوں کہا تھا کہا تھا اور کیا کرتی۔"

"پھر کیا کہتی ہے وہ۔"

"بس ہنسے جاتی ہے۔ چھوڑو اسے۔" وہ ہونٹ نکال کر جواب دیتی۔ "مجھے سائیکل کی سیر کراؤ نا۔ کراؤ گے۔" وہ زبردستی اپنی بات چھیڑ دیتی۔

"لے چلوں گا۔ لے چلوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کیا وہ باہر نہیں نکلتی۔ کہیں جاتی نہیں۔ سیر کرنے یا ویسے۔"

"ہونہہ وہ کیا جائے گی۔" وہ تحقیر سے ہونٹ نکالتی۔ "چھوڑو اسے۔"

ہوتا ہے، ہوتا ہے

"پہلے جا کر اس سے کہو کہ دروازے سے جھانکے۔ بڑی پیاری ہے نیم۔ جاؤ نا" نیم بڑی مشکل سے اوپر جانے کے لیے تیار ہوئی۔ پھر آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتی پھر اوپر دے دروازے میں رنگین سرگوشیاں ہوتیں۔ ہلکے ہلکے قہقہے سنائی دیتے اور بالآخر دروازے سے ایک سفید بازو نکل کر لہراتا اور انگلیاں یوں ناچتیں جیسے کتھا کلی کے کسی مندرا کی مشق کر رہی ہوں۔ پھر گھنگھریالی لٹ اڑتی۔

لو اس سے کیا ہوتا ہے۔ کوئی ہنس کر کہتی۔

بالآخر نیم نیچے اتر آتی۔ "وہ نہیں آتی سامنے کہتی ہے ہم کسی کے سامنے نہیں آیا کرتے۔" وہ منہ بنا کر کہتی۔

ایلی روز جان بوجھ کر ایسے وقت آغا کے یہاں جایا کرتا تھا جب وہ گھر پر نہ ہوں اور پھر ڈرتے ڈرتے دیر تک سیڑھیوں میں کھڑا رہتا۔ پھر وہ شام کے وقت دوبارہ وہاں جاتا اور آغا صاحب کے پاس بیٹھا رہتا اور اوپر سے عجیب و غریب بامعنی

آوازیں سنائی دیتیں۔ پلو لہراتے اور کبھی کبھی موقعہ پا کر لوہے کی سلاخوں سے سفید بازو جھولتے اور کوئی کہتی "لو اس سے کیا ہوتا ہے۔" اور کوئی جواب دیتی۔ "ہوتا ہے ہوتا ہے۔" اور ایلی محسوس کرتا جیسے اس آواز میں طنز ہو پھر وہ سوچنے لگتا کہ آخر کس بات سے کچھ ہوتا ہے اور وہ دیر تک سوچتا رہتا۔ حتیٰ کہ آغا صاحب نہا کر باہر نکل آتے اور کپڑے پہننے لگتے اور پھر وہ دونوں باہر گھومنے کے لیے چلے جاتے۔

شام کے وقت حئی آ جاتا۔ حئی آغا کا چھوٹا بھائی تھا مگر اس کی طبیعت آغا صاحب سے قطعی طور پر مختلف تھی۔ جسمانی طور پر بھی ان دونوں میں کوئی مشابہت نہ تھی۔ حئی کا جسم پتلا دبلا تھا اس کے چہرے پر شوخی اور اضطراب چھائے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ حئی کے خدوخال بے حد جاذب نظر تھے۔ ایلی نے جب پہلی مرتبہ اسے دیکھا تو وہ چونک پڑا۔ اس وقت وہ گرم چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ سبز چادر میں خوب صورت خدوخال دیکھ کر ایلی نے سمجھا جیسے کوئی خاتون غلطی سے مردانے میں آ گئی ہو۔

حئی بہت جلد ایلی سے مانوس ہو گیا۔ اس کی باتیں عجیب تھیں۔ "ایلی۔" وہ چلاتا آؤ ایلی تمہیں عیش کرا لائیں۔ آؤ تمہیں تمہاری ہم نام کے پاس لے چلوں۔ اتنی رسیلی آنکھ ہے کہ اگر اس کی ایک نگاہ پڑ گئی تم پر تو طبیعت صاف ہو جائے گی اور کیا جسم ہے۔ شعلے نکلتے شعلے۔ چلو ملا لاؤں تمہیں۔ اپنے پر تو مرتی ہے لیکن بڑی اچھی ہے چلو۔"

ایلی حیرانی سے اس کی باتیں سنتا اور پھر گھبرا کر کہتا۔ "پھر سہی کبھی۔" اور حئی منہ بنا کر کہتا "اچھا بھئی تو پھر میں تو چلا۔" اور تنہائی میں بیٹھ کر ایلی اوپر گھر کی طرف دیکھتا اور نیم کو اشارے کرتا اور نیم تسلیم کا بازو پکڑ کر اسے سیڑھیوں کی طرف کھینچتی اور تسلیم ہنسے جاتی حتیٰ کہ بوڑھی دادی شور مچانا شروع کر دیتی "لڑکیو یہ کیا غل غپاڑہ ہے۔ آرام سے بیٹھو۔" اور لڑکیاں خاموش ہو جاتیں اور ایلی چپ چاپ محروم اور

مایوس انداز سے باہر نکل کر بورڈنگ کی طرف چل پڑتا۔

گھما گھمی

بورڈنگ کی اس ویران کوٹھی میں بیٹھے ہوئے وہ سوچتا۔ کیا یہ محبت ہے کیا یہی وہ محبت ہے جس کے متعلق شریف اسے خبردار کیا کرتا تھا۔ لیکن دل ہی دل میں اسے احساس تشنگی ہوتا۔ بات کسی لحاظ سے بھی تو مکمل نہ تھی۔ نہ تو تسلیم نے کبھی تھیلی میں سلا ہوا مینڈک اس پر پھینکا تھا اور نہ کسی اور طریقے سے ایلی کی محبت کی سنجیدگی کو محسوس کیا تھا۔ بلکہ تسلیم کے رویے کو دیکھ کر ایلی سوچتا تھا کہ وہ تو بچوں کا کھیل کھیل کر رہے تھے محبت نہیں کر رہے تھے۔ کیا محبت بچوں کا کھیل ہوتی ہے۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اتنی عظیم چیز بچوں کا کھیل کیسے ہو سکتی ہے۔

اسے یوں خاموش بیٹھے دیکھ کر مولاداد چلاتا۔ ”یہ کیا صورت بنا رکھی ہے ایلی۔ کیا ہماری زندگی بھی حرام کرو گے چلو باغ سے امرود چرا کر کھائیں۔ کیوں شفیع۔“

شفیع ہنس کر جواب دیتا۔ ”دیکھو تو اپنی صورت۔ دیکھنے میں تو ڈاکو نظر آتے ہو اور کرتے ہو چوریاں اور وہ بھی امرودوں کی۔“

پھر وہ دونوں ایلی کی طرف متوجہ ہو جاتے۔

”اسے کیا ہے۔“

”کیا ہے بے تجھے۔“

”عشق کا روگ لگا ہے کیا۔“

”وہ مہر لڑکا ہے نا کالج میں اس پر مرتا ہے تو۔“

”لو اس میں کیا ہے۔“ مولاداد پیار سے کہتا۔ ”کہو تو اٹھا لاؤں اسے یہاں اس کمرے میں۔“

”پاگل ہوئے ہو۔“ ایلی چلاتا۔

ایلی نے تسلیم کے متعلق مولاداد اور شفیع سے کبھی بات نہ کی تھی یہ راز صرف

آصف تک محدود تھا۔ جب کبھی وہ آصف سے ملتا اس کا جی چاہتا کہ وہ سنجیدگی سے اس سے پوچھے کیوں آصف محبت کیا ہوتی ہے۔ کس طرح کی جاتی ہے۔ اس نے کئی ایک بار آصف سے یہ سوال پوچھا تھا مگر مسکرانے کے سوا آصف نے کبھی جواب نہ دیا تھا۔

ہنگامہ

پھر خبر آئی کہ شریف چھٹی پر علی پور آیا ہوا ہے اور ایلی کی آنکھوں میں خوشی کے دیئے ٹمٹمانے لگے۔ "میں جاؤں گا۔" اس نے آصف سے کہا۔

"تم نہیں جا سکتے۔" آصف مسکرایا۔ "تم اسے چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہو۔"

لیکن آصف کے اعتراض کے باوجود وہ گرمی کی چھٹیوں سے دس روز پہلے علی پور آ گیا۔ اب کی بار علی پور ویران نہ تھا وہاں شریف تھا۔ شہزاد تھی رفیق اور ارجمند تھے۔ سبھی موجود تھے۔ علی پور پہنچ کر خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ محلے میں پہنچنے سے پہلے ہی اسے رضا مل گیا جو ایلی کو دیکھ کر چلانے لگا۔

"کیوں بھئی فرہاد۔ وہ نہر کھودنے کا کام ختم ہو گیا۔"

"کیا بکتا ہے تو۔" ایلی نے اسے گھورا۔

"سارے محلے والے کہہ رہے ہیں۔"

"کیا کہہ رہے ہیں۔" ایلی نے گھبرا کر پوچھا۔

"کہتے ہیں کہ امرتسر میں عشق کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ کالج تو محض بہانہ ہے۔ اس قدر قریب رہتے ہوئے بھی اب علی پور آنے کی فرصت نہیں ملتی۔"

رضا سے مل کر جب وہ محلے میں پہنچا تو اس نے محسوس کیا جیسے سبھی لوگ اس کی طرف دیکھ دیکھ کر تمسخر سے ہنس رہے ہوں۔

"ہائیں" چچا امداد چلائے۔ "کیوں بھئی ایلی آ گیا تجھے بھی ہوش پڑ گیا اسی چاؤ کے چکر میں آخر بیٹا کس کا ہے شاباش۔" غصے سے ایلی کے کان سرخ ہو گئے۔

''اے ہے یہ تو ایلی ہے اپنا۔'' محلے کی عورتوں نے اسے دیکھ کر شور مچایا۔

''اللہ عمر دراز کرے۔ جیتا رہے۔ ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رہے۔''

''ہائے ایلی تو اب عید کا چاند ہو گیا۔ جوان ہو گیا ہے نا۔'' دوسری مسکرا کر بولی۔

''ہمارے لیے تو وہی ایلی ہے۔'' ایک مسکرائی۔

''کیوں ایلی کیا امرتسر میں جی لگ گیا تیرا۔ اب تو علی پور کی طرف رخ ہی نہیں کرتا۔''

''پڑھائی سے فرصت بھی ہو۔'' ایک نے طنزاً کہا۔

''تو آیا ہے ایلی۔'' ہاجرہ شور سن کر بھاگی بھاگی آئی۔ ''آ میں تو کب سے تیرا انتظار کر رہی تھی۔''

''اب اس کا انتظار کیا کرے گی تو۔'' چچی نے مسکرا کر کہا۔ ''اللہ رکھے اب جوان ہو گیا ہے۔''

دادی اماں اسے دیکھ کر کھڑکی سے چلائیں۔ ''کب آیا تو۔''

''جا دادی اماں سے مل لے۔ اس کا جی اچھا نہیں۔'' ہاجرہ نے کہا۔

دادی اماں کو دیکھ کر وہ بھاگا اور بھاگ کر اس سے بغل گیر ہو گیا۔

''کیا کرتا ہے تو۔'' وہ چلائی۔ ''وہی جاٹ کا جاٹ ہی رہا تو۔'' اور وہ کھانسنے لگی۔

''کیوں دادی اماں۔ بیمار ہو گیا؟''

''نہیں تو۔'' وہ بولی۔ ''اچھی بھلی ہوں۔''

''دمے کا دورہ پڑتا ہے۔'' سیدہ نے کہا۔

''کیوں دادی اماں۔'' اس نے دادی سے پوچھا۔

''اب بھی نہ پڑے گا دمے کا دورہ تو کب پڑے گا۔'' وہ ہنسی۔

عین اس وقت تیزی سے کسی کے سیڑھیوں سے اترنے کی آواز آئی اور چھم سے

شہزاد اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ "سنا ہے ایلی آیا ہے۔"

ایک ساعت کے لیے ایلی شہزاد کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا جالی کے سیاہ دوپٹے پر سفید پھول چمک رہے تھے اور وہ اس کے شانوں پر یوں اڑ رہا تھا۔ جیسے پر پھڑ پھڑا رہے ہوں۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب سا تبسم تھا۔ ایسا تبسم جو اس سے پہلے ایلی نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ نگاہوں میں غیر معمولی چمک تھی اور گالوں پر سرخی جھلک رہی تھی جیسے لجا رہی ہو۔ وہ تو کبھی لجائی نہ تھی اس کے انداز میں تو ہمیشہ بے نیازی کی جھلک ہوتی تھی۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے دفعتاً شہزاد نے کینچلی بدل لی ہو۔

"ایلی آؤ نا۔" وہ بولی۔ "تمہیں بلا رہے ہیں وہ جلدی آؤ۔" وہ مسکرائی۔

ایلی کے جسم پر چیونٹیاں چلنے لگیں۔

"اے ہے۔" دادی اماں بولی۔ "تو سن ہو کر کیوں رہ گیا۔ دیکھو تو یوں کھڑا ہے جیسے ہوش میں نہ ہو۔ جانا ہے ادھر تو جا ہو آ۔ میری طرف کیا دیکھتا ہے۔"

"تمہیں مبارک ہو ایلی۔" شریف اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "تم پہلے امتحان میں پاس ہو گئے۔"

"کونسا امتحان۔" ایلی نے پوچھا۔

شریف نے ایک بھرپور نگاہ ایلی پر ڈالی۔ "پہلے امتحان میں تم پاس ہو گئے اور انشاء اللہ دوسرے امتحان میں بھی پاس ہو جاؤ گے۔"

"میں تو ایف اے میں فیل ہو گیا ہوں۔" ایلی نے گھبرا کر کہا۔ شریف قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور پاس کھڑی شہزاد کی طرف دیکھنے لگا۔ سیاہ دوپٹے کے سفید پھولوں کے درمیان ایک گلاب کھلا ہوا تھا۔ "سنتی ہو۔" وہ بولا۔ "ایلی کی باتیں سن رہی ہو۔"

"سن رہی ہوں۔" وہ بولی۔ "اب تو میں بھی ایلی کی باتیں بڑے غور سے سننے لگی ہوں۔"

"وہ کیسے۔" شریف مسکرایا۔

"اب اس کی نگاہیں تو دیکھو ذرا۔" وہ بولی۔

"اس کی نگاہ" شریف تالی بجا کر اٹھ بیٹھا۔ "اس کی نگاہ سے تم کیسے دیکھ سکتی ہو۔ ہر کسی کی نگاہ الگ ہوتی ہے۔ ہر کوئی اپنی نگاہ سے دیکھتا ہے اور۔ اور۔" اس نے ایک لمبی آہ بھری۔ "دوسرے دیکھتے ہیں مگر دیکھتے نہیں۔"

"مجھے کیا معلوم۔" شہزاد منہ بنا کر خاموش ہو گئی۔

ایلی سوچنے لگا نہ جانے کیا باتیں کر رہے تھے وہ دونوں۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا جیسے وہ شہزاد کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہو۔ ایسی نگاہ سے جس سے شاید شریف نے اسے کبھی نہ دیکھا ہو۔ لیکن شہزاد نہ جانے اسے کس کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ وہ گھبرا گیا۔

"لیکن آپ تو امتحان کی بات کر رہے تھے۔" اس نے شریف سے کہا۔

"دنیاوی امتحانات کی بات نہیں۔" شریف شہزاد کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "میں تو اس امتحان کی بات کر رہا ہوں۔" "اچھا تو پھر کون ہے وہ۔ کیسی ہے۔ سنا ہے بڑی خوب صورت ہے۔" شہزاد نے ایلی کو عجیب نگاہوں سے دیکھا۔ "خوب صورت۔" شریف ہنسا۔ "خوب صورت تو وہ ہے ایلی جسے کوئی دیکھنے والا مل جائے۔"

شہزاد نے چتون چڑھا کر کہا۔ "آپ نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے خوبصورتی۔"

"پاگل نہ بنو" وہ آہ بھر کر بولا۔ "زخموں کو طنز سے نہیں کریدا کرتے۔" ایک ساعت کے لیے شہزاد کی آنکھیں گویا کسی نامعلوم جھیل پر تیرنے لگیں پھر دفعتاً وہ مڑی اور کمرے سے باہر نکل گئی اور وہ دونوں تنہا رہ گئے۔

"اب تو تم بڑے آدمی بن گئے ہو۔" شریف نے کہا۔ "اب تو لوگ تمہیں دیکھنے لگے ہیں بس دو ہی باتیں ہیں صرف دو۔ باقی سب ہیچ ہے۔ سب ہیچ! یا تو تم میں خود دیکھنے کی اہلیت ہو یا دوسروں کی توجہ جذب کرنے کی۔ اور تم نے ثابت کر دیا

ہے کہ تم دونوں خصوصیات رکھتے ہو۔"

ایلی گھبرا گیا۔ "نہ جانے کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ میں نہیں سمجھا۔"

"سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا۔" شریف ہنسنے لگا۔ "بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ آج تم سے مل کر بڑی راحت ہو رہی ہے مجھے۔ تمہاری قسم بڑی راحت۔"

شریف سے ملنے کے بعد جب وہ احاطے میں پہنچا تو اسے ارجمند مل گیا اسے دیکھتے ہی ارجمند چلایا "اے ایلی۔ تم ہی تیلی کے تیلی رہے نا ہمارا سارا اہنکر اینڈی تم نے تباہ کر دیا بھئی۔ واہ عجیب آدمی ہو۔ اتنا ٹرین کیا تھا تمہیں۔ سب اکارت گیا۔ سنا ہے محبت لگا بیٹھے ہو۔ ارے بے وقوف محبت لگانا مردوں کا کام نہیں۔ مردوں کا کام تو پھول پھول بیٹھ کر لطف اندوز ہونا ہے اور ہم لوگوں کی دوستی ملاحظہ ہو یار جب سے شاہ کا کو کی فیکٹری میں ملازم ہوا ہوں ہر ساعت یہی خیال رہا ہے کہ گاؤں کی گوریاں چن چن کے پھنسا رکھوں۔ اپنے لیے نہیں۔ تمہاری قسم۔ بلکہ اس خیال سے کہ یار لوگوں کو بلا کر کبھی عیش کرا دوں۔ وہ محفل جماؤں کے سالے عمر بھر یاد رکھیں۔ مگر یار ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا تم نے یہ عشق کی بیماری لگا کر۔ آخر تیلی ہی ہے نا وہ کہتے ہیں نا کہ کتے کی دم کو بیس سال لوہے کی نالی میں رکھو پر نکالو گے جب تو سالی ٹیڑھی ہی نکلے گی۔"

چھ بھائی

ارجمند کو شاہ کا کو کی فیکٹری میں نوکری کرتے صرف چھ ماہ کا عرصہ ہوا تھا اس قلیل عرصے میں وہ بہت بدل چکا تھا۔ اول تو اس کا قد بہت لمبا ہو چکا تھا۔ ارجمند کے تمام بھائی دراز قد تھے۔ محلے میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو قد میں ان کی برابری کر سکتا ہو۔ ان بھائیوں میں تین عجیب خصوصیات تھیں ایک تو وہ سب غیر معمولی طور پر دراز قد تھے۔ دوسرے تمام کے تمام بھائی خوش مزاج تھے اور سنجیدہ سے سنجیدہ بات کو مذاق میں ٹال دیا کرتے تھے اور بڑی سے بڑی مصیبت کو ہنس کے برداشت کرتے

کے عادی تھے۔

ان کے والد ڈاکٹر تھے۔ والد کے زیر سایہ انہوں نے بڑی ناز و نعمت سے بچپن گزارا تھا لیکن والد کی وفات کے بعد مالی مشکلات کا دور آیا۔ وہ گھر میں چھپ کر چٹنی سے روٹی کھاتے اور پھر باہر نکل کر یوں مونچھیں سنوارا کرتے جیسے کوفتے کھا کر آئے ہوں۔ لیکن ان کی تیسری خصوصیت بہت الم انگیز تھی۔ بچپن گزر جانے پر وہ دفعتاً اونچے لمبے جوان بن جاتے تھے۔ یہاں تک کہ عام دروازوں سے گزرنا بھی ان کے لیے مشکل ہو جاتا لیکن جوانی اپنے ساتھ ہی پیغام اجل لے آتی جوان ہوتے ہی وہ یا تو ٹی بی کا شکار ہو جاتے یا کسی اور وجہ سے آناً فاناً مر جاتے۔ باپ کی وفات کے بعد ارجمند کا بڑا بھائی بھرپور جوانی میں فوت ہو چکا تھا۔ اس کی وفات پر ان کے گھرانے کی حالت اور بھی نازک ہو گئی تھی۔ اب ارجمند جوان ہو رہا تھا

ارجمند کی بوڑھی ماں جو مصائب کی وجہ سے جیتے جی گویا پاگل ہو چکی تھی ارجمند کی جوانی دیکھ کر اپنے دل میں فخر محسوس کرتی مگر دفعتاً نہ جانے اسے کیا خیال آتا کہ وہ مسرت بھری نگاہ حسرت میں بدل جاتی۔ اس کی آنکھیں بھر آتیں اور وہ منہ موڑ کر آنسو پونچھتی۔ اس پر ارجمند قہقہہ مار کر ہنستا اور کہتا ”اماں رو رہی ہو تم۔ واہ اماں رونے کی اس میں کونسی بات ہے۔ مابدولت اب بڑے ہو گئے ہیں۔ اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سمجھو اب سکھ چین کا زمانہ آ گیا۔ چٹنی کی جگہ مابدولت کے حکم سے چانپیں اور کوفتے ہوں گے اور سوکھی روٹی کی جگہ پراٹھے۔“ وہ جھک کر ماں کو آغوش میں لے لیتا۔ ”اب تو کوئی رونے کی بات نہیں اماں۔“ وہ ہنستا۔ ”نہیں اماں ہم مریں گے نہیں۔ اللہ میاں نے جو تیسویں پارے میں صاف لکھا ہے کہ ارجمند نہیں مرے گا جب تک اس کے یہاں بارہ لڑکے اور چھ لڑکیاں پیدا نہ ہو جائیں گی اور اس کی داڑھی دو فٹ گیارہ انچ تک نہ بڑھ جائے گی۔ واہ تم ویسے ہی روتی ہو اماں۔“

ان کی جواں مرگی کے متعلق تمام محلے میں چرچا تھا۔ لوگ محسوس کرتے تھے کہ ان کی جوانی پیغام اجل لاتی ہے حالانکہ اب تک صرف ایک بھائی ہی فوت ہوا تھا اور پانچ بھائی بچپن کے مختلف مدارج طے کر رہے تھے۔

سچا عاشق

نوکر ہونے کے بعد ارجمند نے اعلانیہ طور پر احاطے میں کھڑے ہو کر انکر اینڈی کے شغل میں مصروف رہنے کی عادت چھوڑ دی تھی۔ وہ احاطے میں کھڑا ہوتا تو تھا مگر اس کے انداز میں ایک وقار سا پیدا ہو گیا تھا اگرچہ اس کے جذبات وہی پرانے تھے اور اس کا طریق کار بھی نہ بدلا تھا۔

لیکن ایلی کے لیے اب اس شغل میں حصہ لینا ممکن نہ رہا تھا۔ وہ کیسے احاطے میں کھڑا ہو سکتا تھا۔ اسے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ محبت لگانے کے بعد اس کا لڑکیوں کو دیکھنا مناسب نہیں۔ لوگ سمجھیں گے کہ اس کا عشق محض ایک ڈھونگ ہے۔ جسمانی لذت کے حصول کا ذریعہ... اور پھر ہنس کر کہیں گے کیوں نہ ہو آخر بیٹا کس کا ہے۔

ایلی کو جس قدر نفرت اس ایک جملے سے تھی کسی اور چیز سے نہ تھی۔ اسے خود علی احمد کے طریقہ کار سے نفرت تھی شاید اس لیے کہ ان کی اس خصوصیت کی وجہ سے اسے بہت دکھ سہنا پڑا تھا۔ اس کی ماں کی زندگی تباہ ہوئی تھی۔ ان کا گھر برباد رہا تھا پھر وہ اس انداز کو کیسے اچھا سمجھ سکتا تھا اس لیے اس نے اس طریق کار سے پہلو بچانے کے لیے دل میں یہ ایمان پیدا کر لیا تھا کہ محبت کو جسم سے کوئی تعلق نہیں بلکہ محبت اور جسم دو متضاد باتیں ہیں۔ وقت کٹی کے لیے لڑکیوں کو دیکھنا اس کی نظر میں جرم تھا۔ دل لگی کے لیے انکر اینڈی کا کھیل کھیلنا اسے گوارا نہ تھا اور اب جب محلے بھر میں اس کے عشق کے چرچے ہو رہے تھے۔ اب تو اس کے لیے احاطے میں کھڑا ہونا ممکن ہی نہ رہا تھا۔ سچے عاشق کا کام یہ نہیں کہ چوگان میں کھڑے ہو کر نوجوان لڑکیوں سے آنکھیں لڑائے۔ اس کے برعکس سچے عاشق کو تو چاہیے کہ چارپائی پر

لیٹ کر مست نگاہوں سے چھت کی طرف گھورتا رہے اور جب تھک جائے تو ٹھنڈی آہ بھر کر پہلو بدل لے۔

طوفان بدتمیزی

اس رات بستر پر لیٹے ہوئے جب وہ نیم کی سرگوشیوں کے متعلق سوچ رہا تھا تو اس نے پاؤں کی ہلکی سی آہٹ سنی جیسے نیم سیڑھیاں اترا کرتی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ تصور میں کتنی قوت تھی کیسی وضاحت سے آواز آ رہی تھی پھر آہستہ سے دروازہ کھلا جیسے نیم کھولا کرتی تھی۔ "مجھے بائیسکل کی سیر کرا دو۔"

ایک اونچی لمبی نیم کو سامنے دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔

شہزاد ہنس پڑی "ڈر گئے۔"

"اوہ آپ ہیں خالہ جی۔" ایلی اسے خالہ کہا کرتا تھا۔

"ابھی سے سو گئے۔" وہ پھولدار پروں کو سمیٹتے ہوئے بولی۔

بیٹھ جاؤ خالہ جی۔ کہہ کر وہ گھبرا گیا۔ اسے بٹھائے کہاں۔ کمرے میں ایک چارپائی کے سوا بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔

"کہاں بٹھاؤ گے۔" شہزاد ہنسی۔

ایلی ٹھٹھکا شہزاد دل کی بات کس طرح بھانپ لیتی تھی کیا وہ اس کے دل کی سب باتوں کو سمجھتی تھی۔ اس خیال پر وہ لرز گیا کیونکہ اپنے دل کی سب باتوں کو اپنانے یا ان پر سوچنے کی اسے کبھی جرات نہ ہوئی تھی۔ کئی بار اپنی کسی پوشیدہ خواہش کی ہلکی سی جھلک دیکھ کر وہ گھبرا جایا کرتا تھا اور پھر دوسرے امور پر غور کرنے کی کوشش کرتا۔ اس وقت بھی اسے بٹھانے کے متعلق نہ جانے کیا خیال آیا تھا۔ اس کے دل میں اکثر شہزاد کو دیکھ کر طوفان سا پیدا ہو جاتا تھا۔ ایک عجیب سا طوفان بدتمیزی۔

ایک طرف مونگیا گٹھڑی کے پٹ کھل جاتے۔ دوسری طرف نیلی جھیل میں کنول سا ابھرتا۔ مینڈک ملہار گانے لگتا ادھر دو سفید سے بازو لہراتے ادھر دو رنگین

خونیں ہاتھ اس کی طرف لپکتے اور کہیں سے شریف کی متبسم آواز سنائی دیتی۔ ''ہر کوئی اپنی نگاہ سے دیکھتا ہے پگلی۔'' اور پھر وہ اس طوفان بدتمیزی کو سمیٹنے کی شدید کوشش کرتا۔

اس طوفان بدتمیزی پر اسے شدید غصہ آتا تھا۔ اپنے آپ پر غصہ آتا۔ وہ محسوس کرتا تھا جیسے علی احمد بنا جا رہا ہو۔ پھر اس کا جی چاہتا کہ بھاگ کر روپوش ہو جائے۔

''کہاں بٹھاؤ گے۔'' اسے خاموش دیکھ کر شہزاد نے اپنی بات دہرائی۔ ''اسے نہ بٹھا سکے تو مجھے کیسے بٹھاؤ گے۔'' وہ پھر ہنسی۔ اس کی ہنسی شرارت آمیز تھی۔

نہ جانے شہزاد کس قسم کی لڑکی تھی۔ ایک انوکھی عجیب سی لڑکی۔ جس کی ہر بات نرالی تھی۔ جس کی ہر حرکت گویا مفہوم سے بھری ہوئی تھی۔ نہ جانے شہزاد کی ہر بات چھیڑ کیوں دیتی تھی۔ اس کی ہر نگاہ دل میں کھب کیوں جاتی تھی۔ اور یہی نہیں اس کا طرز عمل دو دھاری تھا۔ وہ ایک نگاہ سے یوں چھیڑتی جیسے اسے چھیڑ دینے سے دلچسپی ہو اور دوسری نگاہ سے یوں الگ تھلگ ہو جاتی جیسے ان باتوں سے بلند تر ہو۔ جیسے اسے فانی مخلوق سے قطعی طور پر کوئی دلچسپی نہ ہو۔ ایک ساعت میں وہ اس قدر قریب آ جاتی تھی جیسے پوچھ رہی ہو۔ ''میں کہاں بیٹھوں۔'' اور دوسری ساعت میں اس قدر دور ہو جاتی۔ دور...... اس افق سے بھی دور جہاں گلابی جھیلوں میں نیلے مینڈک پھدکتے تھے۔ ایک وقت اس کا تبسم گویا دل کو کاٹ کر رکھ دیتا اور پھر دوسری ساعت میں اس کے ہونٹوں میں ایک ہلکی سی سلوٹ پیدا ہو جاتی اور محسوس ہوتا جیسے وہ مذاق اڑا رہی ہو۔ تضحیک کر رہی ہو۔ رنگینی کے باوجود اس میں بے نیازی کا عنصر بہت واضح تھا۔ ایلی اسے بلند و بالا ہستی سمجھتا تھا جس کے متعلق ایسی ویسی بات نہیں سوچی جا سکتی تھی۔ لیکن یہ کیا مصیبت تھی کہ ایسی ویسی بات نہ جانے کہاں سے اس کے دل میں آ گھستی اور وہ شرمندہ ہو کر کسی اور بات کے متعلق سوچنے کی شدید کوشش کرتا۔

طوطا اور مینا

لیکن اس روز تو شہزادہ کا انداز قطعی طور پر مختلف تھا اور اس کا رات کے وقت وہاں اکیلے آنا۔ اور پھر پوچھنا۔ ''کہاں بٹھاؤ گے۔''

وہ چارپائی کے ایک کونے پر بیٹھ گئی۔ ''ایلی۔'' وہ بولی۔ ''میں پوچھنے آئی ہوں کہ کیا واقعی تمہیں محبت ہو گئی ہے۔''

ایلی گھبرا گیا۔ وہ اسے کیا جواب دے۔

''اس خبر کی تو محلے میں دھوم مچی ہے آج کل پھر تم مجھ سے کیوں چھپاتے ہو۔''

''چھپاتا تو نہیں۔'' ایلی نے بمشکل کہا۔

''تو بتاؤ نا۔ یہ سچ ہے کیا۔''

ایلی نے اثبات میں سر ہلا دیا اور چپ رہا۔

''کتنے بدنصیب ہو تم ایلی۔'' شہزاد کی آواز میں سنجیدگی تھی۔ ''بہت بدنصیب ہو تم'' وہ بولی۔ ''اگر تم کچھ دیر صبر کرتے اگر تم جلد بازی نہ کرتے تو کتنا اچھا ہوتا۔''

''میں نہیں سمجھا۔'' ایلی نے آہستہ سے کہا۔

وہ مسکرا دی۔ ''اب سمجھنے کا کیا فائدہ۔ اب تو نہ ہی سمجھو تو اچھا ہے۔ جب میں پہلے پہل یہاں محلے میں آئی اور تمہیں دیکھا تو میں سمجھی کہ ایلی ایک عام سا لڑکا ہے۔ مجھے یہ خیال بھی نہ پیدا ہوا تھا کہ تمہیں دیکھ کر کسی کے دل میں اتنا گہرا اثر پیدا ہو سکتا ہے وہ تو آپے ہی میں نہ رہی۔ لیکن اب کیا فائدہ۔ بے کار ہے اب۔ بیچاری۔'' وہ آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔

ایلی حیران تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

''خالہ'' ایلی بولا۔ ''یہ کیا طوطا مینا کی کہانی سنا رہی ہیں آپ۔''

''ہاں۔'' وہ مسکرائی۔ ''میں سمجھتی تھی۔'' وہ بولی۔ ''یہ طوطا معمولی طوطا ہے جیسے ہوتے ہیں طوطے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ طوطا بولتا بھی ہے۔ اب تو ہمیں طوطے سے ڈر آنے لگا ہے۔'' وہ پھر ہنسی۔

"جبھی یہاں آ گئی ہو اس وقت اکیلی۔" ایلی نے پہلی مرتبہ شہزاد سے مذاق کرنے کی جرات کی۔

"اونہوں" وہ سنجیدگی سے بولی "میری بات چھوڑو۔ یہ تو مینا کا خیال تھا جو مجھے یہاں لے آیا ہے۔"

"مینا کون ہے؟" ایلی نے پوچھا۔

"وہ بھی تھی بیچاری۔ نہ جانے اسے کیا ہو گیا۔ اس کی سدھ بدھ جاتی رہی۔ اس نے کہا تھا طوطے کو مینا کی کہانی سنا دینا ایک بار۔ شاید اس کہانی کو سن کر سمجھ جائے مگر بیکار ہے مجھے معلوم نہ تھا کہ طوطا بن بولے باتیں کرتا ہے اور اس کا اثر اس حد تک ہو سکتا ہے تو یہ ہے۔" شہزاد نے جھرجھری لی۔ "اچھا" وہ کھڑی ہو گئی۔ "میں چلتی ہوں ناحق تمہیں بے آرام کیا۔ صبح آؤ گے نا۔"

"لیکن ذرا ٹھہرو تو۔" ایلی نے کہا۔

"نہ بھئی۔" وہ ہنسی "اب تو تم سے ڈر آنے لگا ہے۔" اور ہنستی ہوئی چلی گئی۔

ایلی دیر تک بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ طوطا کون تھا۔ مینا کون تھی اور بے پروا بے نیاز شہزاد کو اب ڈر کیوں آنے لگا تھا۔ ایلی کے دل میں جذبات کی ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

ایلی کو یہ معلوم بھی کیسے ہوتا کہ شہزاد گوکل کے بن کی سانوری کے متعلق بات کر رہی ہے۔ وہ سانوری جسے وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ وہ ایک سہانا خواب ہے ایک دلکش تصویر۔ وہ خواب بھلا حقیقت کیسے ہو سکتا تھا۔ حقیقت تو محلے کی لڑکیاں تھیں جو چقوں کے پیچھے چھپ چھپ کر مسکراتی تھیں۔ اور پھر اپنے آپ سے ڈر کر پیچھے ہٹ جاتیں۔ لیکن سانوری تو یوں بے نیازی سے کوٹھے پر ٹہلا کرتی تھی جیسے گرد و پیش ایک ناقابل توجہ منظر پیش کر رہا ہو۔ وہ ایک ساعت کے لیے بھی یہ نہ سوچ سکتا تھا کہ طوطا مینا کی کہانی کی مینا سانوری تھی جس

نے کبھی آنکھ اٹھا کر اس کی طرف نہ دیکھا تھا جو اسے قابل التفات ہی نہ سمجھتی تھی۔

اس زمانے میں ایلی نسائی دورخی سے واقف نہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ عورت بھی اسی طرح ہوتی ہے جیسے لڑکے ہوتے ہیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ان کی بظاہر بے نیازی محض ایک پردہ ہوا کرتی ہے۔ اس لیے وہ طوطا مینا کی کہانی کے مفہوم کو نہ سمجھ سکا اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ سانوری نے اسے ایسا مرتبہ بخشا ہے تو وہ خوشی سے ناچنے لگتا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ ایک بار ڈنکے کی چوٹ سے تسلیم کے عشق کا اعلان کر چکا تھا۔

عشاق تو ایک بار محبت لگا کے پھر نہیں بدلتے۔ سچی محبت کی سب سے بڑی خصوصیت اس کے نزدیک وفا تھی۔ سرد مہری کے باوجود وفا۔ بے پروائی کے باوجود وفا۔ اگر اسے طوطا مینا کی کہانی کا مفہوم معلوم ہو جاتا تو الٹا وہ کشمکش میں گرفتار ہو جاتا کہ کس طرح تسلیم کو چھوڑ کر سانوری سے عشق لگائے۔

ایک اور

اگلے روز صبح ہی علی احمد کی آمد کا شور مچ گیا۔ چچا امداد جو کسی کام سے سٹیشن گئے ہوئے تھے واپسی پر احاطہ میں آ کر چلانے لگے۔ ’’بہن نواب۔ بہن نواب۔‘‘

دادی اماں ان کی آواز سن کر بولیں۔ ’’اے ہے لڑکیو سنو تو امداد کی آواز آ رہی ہے۔ تم تو کانوں میں تیل ڈال کر بیٹھ رہتی ہو۔‘‘

’’بہن نواب سے کہہ دو۔‘‘ چچا امداد چلائے۔ ’’علی احمد آ رہے ہیں میں نے انہیں سٹیشن پر دیکھا ہے کھانا وانا تیار رکھے اور سیدہ بیٹی‘‘ وہ ہنس کر بولے۔ ’’کہنا ساتھ شمیم بھی ہے بچے بھی اور ایک اور بھی۔‘‘ وہ ہنسنے لگے۔

’’اے ہے چچا‘‘ ایک بولی۔ ’’یہ ایک اور کون ہے۔‘‘

چچا ہنسے۔ ’’ہر بار ہوتی ہے ساتھ ایک اور نئی بات ہے کیا۔‘‘

’’کیوں نہ ہو ایک اور ساتھ۔‘‘ دوسری بولی۔ ’’علی احمد کے ساتھ ایک اور نہ ہو تو کوئی کیسے جانے کہ علی احمد ہیں۔‘‘

''مگر چچی اب کی بار کون ہے؟''

''ہو گی کوئی ترکھانی یا نٹنی۔''

''اے ہے یہ نہ کہو سنا ہے شریف زادیاں بھی آتی ہیں۔''

''نہ بھئی میں تو نہیں مانتی۔ وہ شریف زادی ہی کیا ہوئی جو آ گئی۔ اور بہن یوں چپکے سے اور اطمینان سے انگلی پکڑے آتا ہے یہ علی احمد۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو جیسے میلے سے مٹی کی گوجری خرید کر لا رہا ہو۔ ذرا نہیں شرماتا ذرا نہیں سوچتا کہ محلے میں جا رہا ہوں محلے والے کیا کہیں گے۔''

''ہونہہ۔ محلے والے۔ محلے والوں کی بہن وہ پروا کرتا ہے کیا جو سچ پوچھو تو شرافت غریبوں ہی میں رہ گئی ہے علی احمد کے پاس اللہ کے فضل سے چار پیسے ہیں۔ اچھے عہدے پر لگا ہے۔ اسے محلے والوں کی کیا پروا۔''

علی احمد کا قافلہ احاطے میں داخل ہوا تو محلے کے مکانوں کی تمام کھڑکیاں بھری ہوئی تھیں۔ بوڑھیاں چوگان میں کھڑی تھیں لڑکیاں چھتوں کے پیچھے دبکی ہوئی تھیں، جیسے علی احمد کی آمد ایک عظیم واقعہ ہو۔

''علی احمد'' ایک بولی۔ ''سنا ہے پھر ایک اور ساتھ لے آیا ہے۔''

''ہی ہی ہی۔'' علی احمد ہنسے۔ ''چچی وہ تو شمیم کی سہیلی ہے۔''

''ہمیشہ سہیلی ہی بن کر آتی ہے پہلے پہل۔'' ایک چلائی۔

''اے ہے علی احمد تیرے بہانے نہ گئے کیسے کیسے بہانے تراشتا ہے تو۔'' دوسری نے کہا۔

''ہی ہی ہی۔'' وہ ہنسے ''تو اور کیا صاف صاف کہہ دوں تمہارا لحاظ بھی نہ کروں چاچی۔''

''اے ہے۔ یہ اچھا لحاظ ہے علی احمد۔'' وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔

علی احمد ہی ہی ہی کرتے ہوئے ڈیوڑھی میں داخل ہو گئے اور محلے والیوں کی

نگاہیں ان کے پیچھے چلتے ہوئے قافلے پر مرکوز ہو گئیں۔

"چچی ہے تو اونچی لمبی۔" ایک بولی۔

"ہو گی تو ویسی ہی کالی کلوٹی۔ ایسی ہی لایا کرتا ہے۔ یہ علی احمد۔" دوسری نے کہا۔

"نہ جانے کیا چاؤ ہے اس کو۔ گلی سڑی اٹھا لاتا ہے۔" تیسری نے منہ بنا کر کہا۔

"ہائے ری۔" ایک چلائی "میں مر گئی یہ تو نٹنی معلوم ہوتی ہے۔"

"نٹنی ہے تو اور بھی اچھا ہے اپنے علی احمد کو ناچ نچائے گی۔"

"اے یہی تو وہ چاہتا ہے۔" چچی نے جواب دیا۔

"اتنی عمر بیت گئی پر ابھی یہ جنون اس کے سر سے نہ گیا۔"

"وہ جنون ہی کیا ہوا اماں جو چلا جائے۔"

دادی اماں نے اپنے کمرے سے آنکھ بچا کر دیکھا پھر دھڑم سے تخت پر گر پڑی۔ جیسے اسے دھچکا لگا ہو۔ پھر بات کیے بغیر تخت پوش پر گڈ مڈ ہو کر پڑی رہی جیسے سجدے میں پڑی ہو۔

شمیم نے گھر میں داخل ہوتے ہی برقعہ اتار کر پھینک دیا اور تیزی سے بھاگ کر اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس کا منہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا آنکھیں رو رو کر ابلی ہوئی تھیں۔ اس کی دونوں لڑکیاں سہمی ہوئی تھیں۔

معذرت

علی احمد اور نووارد وہ چپ چاپ اطمینان سے الگ ایک کمرے میں جا بیٹھے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو باہر محلے والیوں کا جھمگھٹا لگ گیا۔

"ایلی۔" علی احمد نے آواز دی۔ "ایلی بھئی یہ راجو تم سے ملنے آئی ہے۔ ہی ہی ہی کہتی تھی کہ علی پور دیکھوں گی۔ اب یہ کام تمہارا ہے ایلی کہ اسے گھماؤ پھراؤ۔ ایلی تو علی پور کے چپے چپے سے واقف ہوا نا۔ ہی ہی ہی۔ کیوں ایلی۔ اچھا تو ہاجرہ کہاں

ہے اسے راجو سے ملائیں۔"

"سیدہ۔ کیا کر رہی ہے۔ تو۔ ادھر آنا ادھر دیکھ یہ راجو تجھ سے ملنے آئی ہے اور تو وہاں چولہے کے پاس بیٹھی ہے۔ یہ دولت پور کے رہنے والے ہیں۔ راجپوت ہیں۔ اپنی دوکانیں ہیں۔ زمینیں ہیں سبھی جانتے ہیں انہیں وہاں دولت پور میں مشہور خاندان کے ہیں۔ راجپوت وہاں عزت والے سمجھے جاتے ہیں۔ آ جاؤ۔ آ جاؤ بیٹھ جاؤ۔ سیدہ راجو یہ سیدہ ہے میری بہن کی بیٹی۔ میری بیٹی ہی سمجھو۔ اپنے یہاں ہی رہتی ہے۔ اور کہو سیدہ کیا حال چال ہے۔ ہاجرہ نہیں آئی۔ وہ شمیم کیا ہوئی۔ سفر کی وجہ سے تھک کر جا پڑی ہو گی اپنے کمرے میں ہی ہی ہی۔ اچھا بھائی سیدہ ذرا چلم میں دو کوئلے تو رکھ دینا۔ واقعی سفر میں انسان تھک جاتا ہے۔"

وہ مسلسل بولتے گئے جیسے خاموشی سے ڈرتے ہوں جیسے آواز کے تنکے کا سہارا لے کر ڈوبنے سے بچنا چاہتے ہوں اور پھر ہر بات پر ان کا قہقہہ گونجتا رہا کھوکھلا کھسیانہ قہقہہ جیسے وہ راجو کو لانے پر معذرت کر رہے ہوں۔

"اماں۔" وہ بھاگے بھاگے اپنی والدہ کی طرف آئے۔ "اماں تمہارا کیا حال ہے؟" "اچھی بھلی ہوں علی احمد" بڑھیا نے جواب دیا۔ "ذرا دم کی تکلیف ہے۔ رک جاتا ہے۔"

"پھر تو بہت تکلیف ہوئی۔"

"اب یہی کچھ ہونا ہے نا۔ کچھ وقت بیت گیا کچھ بیت جائے گا مگر علی احمد یہ تو کیا لے آیا ہے۔" دادی اماں نے آہستہ سے کہا۔

"اوہو اماں۔" وہ ہنسے "بہت دبلی ہو گئی ہو۔ کوئی دوا دارو کر رہی ہو۔" علی احمد کو یوں بات بدلتے دیکھ کر وہ مسکرا کر بولی۔ "علی احمد تیری عادت نہ بدلی اور دوا کا کیا پوچھتے ہو۔ اب تو دعا کرو۔"

"نہیں نہیں۔" وہ بولے۔ "میں ڈاکٹر کو بلاؤں گا اس سے پوچھوں گا۔" اور پھر

راجو کے پاس یوں جا بیٹھے جیسے وہ خود مریض ہوں اور ڈاکٹر ان کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی اور پھر علی احمد کے کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔

گورو دیو مہاراج

راجو کے آنے پر چار ایک دن محلے میں یہی شغل رہا ایک مسکرا کر پوچھتی۔ ''علی احمد یہ تو کیا لے آیا ہے۔''

علی احمد مسکرا کر جواب دیتے۔ ''چچی یہی تو مجھے تم سے پوچھنا ہے یہ میں کیا لایا ہوں۔ خسارہ کا سودا تو نہیں۔''

دوسری پوچھتی۔ ''علی احمد یہ کیا لے آیا تو دیکھنے میں تو کچھ بھی نہیں۔''

علی احمد ہنس کر کہتے۔ ''ہاں بہن دیکھنے میں کچھ نہیں۔''

پھر کوئی محلے والا چلاتا۔ ''علی احمد اب تمہارے دن نہیں رہے۔''

''ہاں بھئی صاحب۔'' وہ ہنستے۔ ''جبھی تو راتیں منا رہا ہوں۔''

ایلی بھی راجو کو دیکھ کر حیران تھا اس میں وہ بات ہی نہ تھی۔ کوئی بھی تو بات نہ تھی اس میں۔ بالکل چلا ہوا پٹاخہ نہ جانے کیا ہو گیا تھا اسے۔ جیسے کچھ ہو گیا ہو۔

اگلے روز جب ایلی نے ارجمند سے بات کی تو وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ ''بھئی واہ ایلی تم تیلی کے تیلی ہی رہے صرف علی احمد ہی سیانے آدمی ہیں باقی تو سب الو کے پٹھے رہتے ہیں۔ یہاں وہ ہاتھی کے دانت نہیں پالتے جو کھانے کے نہیں بلکہ دکھانے کے ہوں سمجھے میاں۔ پیٹ کی بھوک آنکھیں سیراب کرنے سے نہیں مٹتی۔ سمجھے مگر تم کیا سمجھو گے۔ تم تو ہوئے تیلی کے تیلی۔ مطلب یہ ہے بیٹا وہ کہا ہے سیانوں نے کہ عورت دیکھنے کے لیے نہیں لائی جاتی گھر میں۔ پھر صورت پر کیا جانا۔ تمہارے ابا تو گرو دیو مہاراج ہیں۔ دھن ہیں گرو دیو مہاراج وہ انگر ایٹڈی سیکھ رکھا ہے کہ واہ وا۔ یوں اڑی چلی آتی ہیں جیسے شمع پر پروانہ آتا ہے۔ آہا کیا گر سیکھ رکھا ہے تمہارے ابا نے بیٹا اپنے ابا کی قدر و منزلت اس خاکسار سے پوچھو۔ اپنے خادم سے پوچھو۔

خاکسار پرانا کھلاڑی ہے۔خاکسار نے یہ کھیل ڈسپنسری کی میزوں پر سیکھا تھا اور آج اتنے سال کے بعد جب خاکسار شاہ کا کو گیا اور جناب یوں سمجھ لو کہ ایک طرف شاہ گاؤں ہے اور دوسری طرف کاکو گاؤں اور درمیان میں بروزے کی فیکٹری ہے جہاں خاکسار سٹور کیپر ہے۔ ادھر سے شاہ کی شہزادیاں آتی ہیں اور ادھر سے کاکو کی کراریاں۔ خاکسار ایک نظر ادھر رکھتا ہے۔ دوسری ادھر۔ اس قدر چاق و چوبند رہنے کے باوجود نتیجہ کیا ہے۔ بالکل فیل۔ چھ ماہ میں صرف دو پھنسی تھیں اور وہ بھی سمجھ لو مجبوری سے۔ لیکن تمہارے ابا۔ سبحان اللہ گرو دیو جی مہاراج وہ انکر اینڈی چلاتا ہے بڈھا کہ دولت پور سے علی پور چلی آتی ہیں۔ واہ وا۔ بیٹا بڑے ہو کر فخر کیا کرو گے اس بڈھے کے کارناموں پر۔ مگر یار اس سے وہ نسخہ تو لے لو جو وہ استعمال کرتا ہے۔ بیٹا ہمارا یہ کام کرو گے تو سدا سکھی رہو گے۔"

اے تو محلے کے سبھی لوگ اس بارے میں ایلی سے کچھ نہ کچھ کہنے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے۔

ایک کہتا۔ "میاں ایلی مبارک ہو۔"

دوسرا کہتا۔ "کہو نئی ماں پسند آئی۔"

تیسرا کہتا۔ "کیوں ایلی تم کب تک دیکھتے رہو گے میاں اب تو تمہارے دن آ گئے۔"

کوئی کہتی۔ "ایلی تیرے ابا کا چناؤ کیسا ہے۔"

ایک بولتی۔ "ایلی تو نہ اس راہ پر چلیو۔ چھوڑ اس کو۔ اس نے تو اپنی جندگی تباہ کر لی۔"

پھر اتفاق سے محلے میں دو ایک شادیوں کا اہتمام شروع ہو گیا اور لوگوں کی توجہ علی احمد اور راجو سے ہٹ کر شادیوں کی طرف مبذول ہو گئی۔

---- اختتام ---- حصہ اول ----